بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۱۵۹ھ / ۱۷۴۶ء — ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء

اور

اُن کی علمی خدمات

تحقیقی و تنقیدی مقالہ

برائے

پی ایچ۔ ڈی۔ ڈگری پنجاب یونیورسٹی

نگران

پروفیسر ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک

صدر شعبہ عربی

یونیورسٹی اورنٹیل کالج لاہور

مقالہ نگار

ثریا ڈار

ایم اے (عربی)

جونیئر ریسرچ فیلو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن)

مقالہ ہذا کی منظوری پنجاب یونیورسٹی کے مراسلہ نمبر مورخہ ۱۵/۱۱/ کے تحت حاصل کی گئی۔

۱۹۸۷

16/9/82

اعتذار

مین نے ٹائپ شدہ مقالے پر نظر ثانی کرتے ہوئے غلط الفاظ کو درست کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ علاوہ ازین ٹائپ رائٹر مین "نون غنہ" کے نہ ہونے کے باعث مجبوراً "نون" کا استعمال ہی کرنا پڑا ہے۔ پھر بھی اگر کسی جگہ کوئی غلطی سہواً باقی رہ گئی ہو تو اپنی اس کوتاہی کا اعتراف کرتے ہوئے ان فروگزاشتون پر معذرت کی امید رکھتی ہون۔

انتساب :

اپنے مشفق و مہربان اور قابل قدر استاد
پروفیسر ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک صاحب

اور

اپنے عظیم محسن اور مدبّر شخصیت جناب رشید احمد بابا کے نام ،
جن کے ہر ممکن جذبہ خلوص و تعاون اور شفقت و محبت کے
باعث اس منزل کی طرف رواں دواں رہی -

فہرست عنوانات

اظہار خیال

آج سے ساڑھے تین چار سال پیشتر مجھے کسی دینی شخصیت پر تحقیقی کام کرنے کا تجسس پیدا ہوا۔ آہستہ آہستہ یہ جستجو حقیقت کا روپ دھار گئی۔ میں نے اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار مہربان استاد صدر شعبہ عربی پروفیسر ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک صاحب سے کیا، جنہوں نے میرے اس اقدام کو سراہتے ہوئے نہایت شفقت سے میری ہر ممکن حوصلہ افزائی کی لہذا اب مشکل مرحلہ مقالے کے عنوان کا انتخاب تھا، جو میرے بالغ نظر اور مشفق استاد کی راہنمائی میں بہت جلد حل ہو گیا۔ اگرچہ منتخب شدہ جلیل القدر شخصیت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی پر بہت کم مواد دستیاب ہوا۔ بہرکیف ہمت و کوشش اور ضبط و حوصلے سے مواد جمع کرنا شروع کیا۔ آغاز میں مجھے یہ کام سوہنجو دارو کے کھڈرات کھودنے کے مترادف محسوس ہوا لیکن خداوند تعالی کے فضل و کرم، اپنے ہمدرد استاد کے فیض صحبت اور اپنی دن رات کی محنت شاقہ کے باعث یہ کٹھن اور مشکل مراحل بھی آہستہ آہستہ طے ہوتے چلے گئے۔

میں نے اپنے مقالے کے عنوان کو چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا باب اٹھارویں صدی کے سیاسی، معاشی و معاشرتی اور مذہبی حالات" پر مشتمل ہے۔ اس دور کے ان تمام حالات کا تفصیلاً" ذکر کرنا اس لیے ضروری تھا کہ انحطاط و ادبار کے اس دور میں شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز جیسی مایہ ناز شخصیتیں بھی ان حالات سے دوچار رہیں۔ انہوں نے ہندوستان کی عظیم الشان اسلامی سلطنت کے بگڑے ہوئے ماحول کو مدنظر رکھ کر اپنے اصلاحی نظریات عوام کے سامنے پیش کیے جن میں بالآخر انہیں شاندار کامیابی ہوئی۔

دوسرے باب میں ھندوستان کی جلیل القدر شخصیت شاہ ولی اللہ اور ان کے بیٹے شمس الھند شاہ عبدالعزیز کے حالات زندگی/بیان کیے گئے ھیں ۔

تیسرے باب میں سراج الھند شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی کے اساتذہ کرام اور شاگردان رشید کا مفصل ذکر ھے۔

چوتھا باب شاہ عبدالعزیز کی دینی وعلمی اورعربی خدمات (تصانیف) پر مبنی ھے۔

پانچویں باب میں شاہ عبدالعزیز کی شخصیت کے مختلف پہلو بیان کیے گئے ھیں ۔

چھٹے باب میں ولی اللھی تحریک میں شاہ عبدالعزیز کی مساعی جمیلہ اور شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد شہید کے کارھائے نمایاں کا ذکر ھے۔

میں نے اس عنوان کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مختلف لائبریریوں سے استفادہ کیا ۔شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی کے سوانح بہت کم دستیاب تھے ، اس لیے شاہ عبدالعزیز کے حالات زندگی پر عبدالرحیم بخش دھلوی کی تصنیف کردہ کتاب "حیات عزیزی" کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی ۔ اس کتاب کو پانے کے لیے مختلف ذرائع سے ھندوستان کی رضا لائبریری رام پور سے رابطہ قائم کیا لیکن افسوس کہ یہ نایاب نسخہ وھاں سے بھی نہ مل سکا ، جس کے لیے میری تشنگی باقی ھے اوراس کتاب کی فراھمی تک باقی رھے گی - بہرحال میں نے اس کے بغیر بھی شاہ صاحب اوران کی دینی وعلمی خدمات پرحتی المقدور طالبعلمانہ اور محققانہ کاوش کی ھے - علاوہ ازیں ان کے شاگردوں کے حالات جہاں تک دستیاب ھوئے ، ان پر بھی امکانی صورت میں بحث کی ھے -

اپنے مقالے کے نگران صدر شعبہ عربی پروفیسرڈاکٹر ذوالفقارعلی ملک کی محققانہ نظر ، مخلصانہ رائے اور مشفقانہ طرز عمل سے اس مقالے کے پایہ تکمیل تک پہنچنے پر خصوصاً ان کی

انتہائی ممنون ہوں ، جن کی نوازشات اور عنایات مجھ پر اتنی زیادہ ہیں کہ زبان اور قلم دونوں اظہار سے قاصر ہیں ، میری خاموشی اور بے زبانی ہی اظہار تشکر ہے ۔ اس سلسلے میں اپنے مخلص بھائی جناب رشید احمد بابا کی بھی بے حد شکرگزار ہوں ، جو اس مقالے کی تیاری و تکمیل کے دوران میں میرے لیے ہر ممکن سکون و طمانیت کا باعث بنے رہے اور تمام مشکل مراحل کو بخوبی حل کرتے رہے ۔ علاوہ ازیں میں دیگر اساتذہ کرام ، تمام معاونین اور یونیورسٹی لائبریری سٹاف کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں ، جنہوں نے قدیم ، نایاب اور گم شدہ کتابوں کو فراہم کرکے میری مدد کی ۔

میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ڈیڑھ سالہ عرصہ کے تعاون پر ان کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں ۔

آخر میں اپنے ٹائپسٹ محمد اسلم شاد صاحب کی بھی بے حد سپاس گزار ہوں ، جنہوں نے اس مقالے کو وقت پر ٹائپ کردینے کے سلسلے میں بے حد تعاون کیا ۔

شہنا ڈار - ایم - اے - عربی - اسسٹنٹ
(طالبہ برائے پی - ایچ - ڈی)
شعبہ عربی -

باب — اوّل

اٹھارویں صدی عیسوی کے سیاسی ، معاشی و معاشرتی اور مذہبی حالات

(الف) سیاسی پس منظر ، زوال کے اثرات ،
نادر شاہی حملہ ، احمد شاہ ابدالی کے حملے 1-31

(ب) معاشی و معاشرتی حالات

(ج) مذہبی حالات

سیاسی پس منظر

اٹھارہیں صدی عیسوی کی سیاسی زندگی کا آغاز محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) سے ہوتا ہے - اورنگ زیب عالمگیر کا سال وفات نہ صرف سلطنت مغلیہ کے لیے انحطاط وزوال کا پیش خیمہ تھا بلکہ برصغیر کی سیاسی بدامنی ، معاشی ومعاشرتی بدحالی اور اخلاقی ومذہبی بدنظمی کا نقطہ آغاز بھی ثابت ہوا - اس پرآشوب اور ہنگامہ خیز تاریخی دور میں بادشاہ اور ان کے وزیروں میں اتنی صلاحیت نہ تھی کہ اتنی بڑی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے سے بچا لیتے -

مغلوں کے نظام شاہی میں انتہائی شائستگی ، علمی اور سیاسی سربلندی کے باوصف یہ بہت بڑی کمزوری تھی کہ ولی عہدی اور تخت نشینی کے لیے کسی قسم کے رسوم و رواج اور قواعد وضوابط نہ تھے - یہی وجہ ہے کہ مغلیہ سلطنت کا یہ دور مسلسل خوں ریزیوں ، سازشوں ، شورشوں ، بغاوتوں اور قتل وغارت کے لامتناہی واقعات پر مشتمل ہے کیونکہ شاہی خاندان میں تخت وتاج کے لیے جنگ وجدال ، قتل وغارت اور حرب وضرب کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا تھا- بقول لین پول " کہ اپنے پیش رو کا وارث اپنے عزیزوں کے خون میں سے گزر کر تخت حکومت تک پہنچتا تھا - تقریباً ہر بادشاہ کو اپنے نہایت قریبی رشتہ داروں کے خون سے ہاتھ رنگنے پڑے " -[1]

ہندوستان کے سب سے پہلے مغل بادشاہ بابر نے اس فطری خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے جانشین ہمایوں کو یہ نصیحت کی تھی " کہ اپنے بھائیوں کا خون نہ بہانا لیکن ان پر نگاہ محتاط ضرور رکھنا " -[2] لیکن ہمایوں کے غیر ذمہ دار اور ناقابل اعتبار بھائی اس کی راہ میں کانٹے بن کر حائل ہوتے رہے اور اس کے لیے مشکلات اور مصائب کا باعث بنتے رہے - جہانگیر کے بھائی

---

1. Stanley Lane Poole, Aurangzib. p. 38.

2. S.V. Venkateswara, Indian culture through the ages. Vol. II, p. 184.

غرق مے ناب ہونے کے باعث پہلے ہی راہی ملک عدم ہو چکے تھے۔ اس لیے اسے مغلیہ تاج و تخت کی حفاظت کے لیے اپنے ہی نافرمان بیٹوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ اس نے اپنے بڑے فرزند خسرو کو بڑی سنگ دلی سے مروا ڈالا۔ جہانگیر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا شاہجہان تخت نشین ہوا تو اس کے حکم کے مطابق تخت و تاج کے ہر ممکنہ دعویدار کو ختم کر دیا گیا۔ اس حکم کے تحت شہریار اور خسرو کے ایک ایک بیٹے اور دانیال (اکبر کا بیٹا) کے دو بیٹوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اور خود شاہجہان نے شہریار کی آنکھوں میں سلائی پھروا دی۔ اسی طرح شاہجہان کے بعد اس کا بیٹا اورنگ زیب عالمگیر سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اورنگ زیب عالمگیر محنتی، دور اندیش، پختہ کردار اور منتظمانہ بصیرت کا حامل تھا۔ اس نے اپنے بعد سلطنت مغلیہ کی جڑوں کو مضبوط رکھنے کے لیے ہندوستان کی وسیع و عریض سلطنت کو اپنے تینوں بیٹوں (محمد معظم، محمد اعظم شاہ، محمد کام بخش) میں تقسیم کر کے ان کو تخت نشینی کی جنگ سے بچانے کا انتظام کر لیا تھا۔ اورنگ زیب نے اپنی وفات سے چند روز قبل کام بخش کو بیجا پور کا وائسرائے مقرر کر کے فوج سمیت (۲۰ فروری) کو وہاں روانہ کر دیا اور شہزادہ اعظم کو مالوہ کی گورنری دے کر بھیج دیا۔ سب سے بڑا شہزادہ معظم ان دنوں کابل میں وائسرائے کے عہدے پر فائز تھا۔ کیونکہ اورنگ زیب کو یہ یقین تھا کہ میرے مرنے کے بعد تینوں شہزادے تاج و تخت سے بے نیاز ہو کر رعایا کی فلاح و بہبود میں مصروف ہو جائیں گے لیکن شہنشاہ شاید بھول رہا تھا کہ انسان کے حوصلے سمندر کی سرکش موجوں کی مانند ہوتے ہیں جن کو کبھی سکون میسر نہیں ہوتا اور پھر تعجب تو اس بات پر ہوتا ہے کہ شہنشاہ اس فریب میں کیسے مبتلا ہو گیا کہ اس کے بیٹے چین سے بیٹھ جائیں گے۔

شہزادوں نے اپنے اسلاف کی اس روش کو ترک کرنا گوارا نہ کیا۔ اورنگ زیب کی آنکھیں بند ہوتے ہی فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی اور شہزادوں کی ہوس اقتدار نے بھائیوں کو جانی دشمن بنا دیا۔ انہوں نے اپنی تلواریں بے نیام کر لیں اور تخت و تاج کے حصول کے لیے برسرپیکار ہو گئے۔

لہذا ۱۸ جون ۱۷۰۷ء کو دھول پورا اور آگرہ کے درمیان بمقام جاجو اعظم شاہ اور محمد معظم کی افواج کے درمیان فیصلہ کن جنگ ہوئی - اعظم شاہ کو شکست ہوئی - وہ اور اس کا بیٹا بیدار بخت میدان میں کام آئے کیونکہ جنگ کے دوران میں بہت سے راجپوت سپاہی اور ذو الفقار خان ، اعظم شاہ کا ساتھ چھوڑ گئے تھے - اعظم شاہ کا دوسرا لڑکا والا جاہ بھی شدید زخمی ہوا چنانچہ خونریز جنگ قتل و قتال اور تباہی و بربادی کے بعد محمد معظم ، بہادر شاہ کے لقب سے تخت پر بیٹھا - اس کے بعد بہادر شاہ نے اودھے پور اور جودھ پور کے سرکش اور باغی راجاؤں کو مطیع و فرمانبردار بنایا -

تیسرا بھائی کام بخش جو بیجاپور میں وائسرائے بن کر گیا تھا ، اس نے وہاں پہنچتے ہی باپ کی موت کی خبر سننے کے بعد رسم تاج پوشی ادا کی اور بادشاہت کا اعلان کر دیا - وہاں وہ خود ساختہ بادشاہ کی حیثیت سے اپنی من مانی کارروائیاں کرنے میں مصروف تھا - بہادر شاہ نے ۱۷ مئی ۱۷۰۸ء کو نربدا عبور کرنے کے بعد کام بخش کو صلح و آشتی کا پیغام روانہ کیا مگر کام بخش نے اس کی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا - جونہی بہادر شاہ حیدر آباد کے قریب پہنچا وہ سب لوگ ، جن پر کام بخش نے ظلم و ستم ڈھائے تھے ، بہادر شاہ کی فوج میں شامل ہو گئے - ۱۳ جنوری ۱۷۰۹ء کو کام بخش کے پاس صرف ساڑھے تین سو سپاہی رہ گئے ، جن پر بہادر شاہ کے پچیس [۲۵] ہزار سپاہیوں نے حملہ کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا - جو بچ گئے تھے ، انہوں نے ہتھیار ڈال دیے - شہزادہ کام بخش شدید زخمی ہوا اور زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے اس جہان فانی سے کوچ کر گیا - تلوار اس کے ہاتھ سے گر چکی تھی -

پھر بہادر شاہ ، کام بخش کی کوششوں کو ناکام بنانے اور دکن کے حالات پر قابو پانے کے بعد مئی ۱۷۱۰ء میں راجپوتانہ پہنچا - ابھی وہ اجمیر میں ہی مقیم تھا کہ اسے سرہند میں سکھوں کے فتنہ و فساد برپا کرنے کی خبریں ملیں - بہادر شاہ ۲۷ جون ۱۷۱۰ء کو اجمیر سے روانہ ہو کر ۲ دسمبر کو سا ڈھورا پہنچ گیا اور سکھوں کی بغاوتوں اور شورشوں کو فرو کرنے کے بعد لاہور پہنچا۔

۱۷ اگست ۱۷۱۱ء میں اس نے لاہور سے باہر اپنے چاروں بیٹوں کے ساتھ پڑاؤ کیا ۔

بہادر شاہ کے مختصر دورِ حکومت کے پانچوں سال (۱۷۰۷ء تا ۱۷۱۲ء) راجپوتانہ کے سرکش ہندوؤں اور شورش پسند سکھوں کے خلاف جنگ کرنے میں گزر گئے ۔ چنانچہ دستِ بیداد اجل نے اس کو زیادہ مہلت نہ دی اور اس کو زندگی کی آغوش سے چھین کر قبر کے خلوت کدے میں پہنچا دیا ۔

بہادر شاہ کی وفات کے بعد حسب روایت اس کے چاروں بیٹوں (جہاندار شاہ ، عظیم الشان ، رفیع الشان ، جہان شاہ) کے درمیان برادرکشی کا سلسلہ شروع ہوا ۔ اس کے نالائق اور نکمے لڑکے معزّ الدین جہاندار شاہ نے اقتدار کے نشے میں باقی بھائیوں کو ٹھکانے لگا کر تختِ طاؤس پر قدم جما لیے ۔ سب سے پہلے وہ اپنے بھائی عظیم الشان والئی بنگال سے نبرد آزما ہوا اور امیر الامراء ذوالفقار خاں کی مدد سے کامیاب ہوا ۔ جہاندار شاہ نے اپنے مثل جرنیل ذوالفقار خاں جیسی مدبر شخصیت کے ذریعے اپنے دونوں بھائیوں کو حکومت میں شرکت کا لالچ دے کر عظیم الشان کے خلاف متحد ہونے پر آمادہ کر لیا تھا ۔ اس دوران میں مختلف امراء مختلف شہزادوں سے گٹھ جوڑ کرنے میں مصروف تھے ۔ سب سے پہلے تینوں شہزادوں نے عظیم الشان کے خیمے کا محاصرہ کیا ۔ ۱۵ مارچ کو جنگ کا آغاز ہوا اور ۱۷ مارچ کو عظیم الشان پر دوسرا حملہ ہوا ۔ یہ حملہ اس قدر خوفناک اور ہولناک خیز تھا کہ عظیم الشان کے پاس صرف دو ہزار سپاہی باقی رہ گئے ۔ جنگ کے دوران توپ کا ایک گولہ عظیم الشان کے ہاتھی کو لگا ۔ زخمی ہاتھی بھاگتا ہوا دریائے راوی کی دلدل میں کود گیا ۔ اس طرح ہاتھی کے ساتھ خود عظیم الشان بھی دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو گیا ۔ اس فتح و نصرت کے بعد معز الدین اپنے دونوں بھائیوں اور ذوالفقار سے کیے گئے وعدے بھی بھول گیا ۔ عظیم الشان پر فتح پانے کے بعد تینوں بھائیوں میں مالِ غنیمت کی تقسیم پر تنازعہ ہو گیا ۔ اور وہ پورے ملک کا بادشاہ بننے کے خواب دیکھنے لگا ۔ جہان شاہ کے ساتھ امیر خان ، رستم دل خان اور رحمت خان جیسے امراء تھے ، جنہوں نے معزّ الدین

کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ۔ (۲۹ مارچ ۱۷۱۲ء، ۱۹ صفر ۱۱۲۴ھ) کو جنگ کا آغاز ہو گیا۔

"دن بھر لڑائی ہوتی رہی، قتل و غارت اور کشت و خون کا بازار ایسا گرم ہوا کہ ہر دو فریق کے سپاہیوں کی آنکھوں میں نفرت و حقارت کا لاوا دھکنے لگا ۔ تین روز تک میدان کارزار گرم رہا۔ چوتھے دن جہان شاہ کا زوال یقین میں بدل گیا"۔[1] جہان شاہ، ذوالفقار خان کے آدمیوں کی گولی کا نشانہ بن گیا ۔

رفیع الشان، جو جہاندار شاہ اور جہان شاہ کے تنازعہ میں اب تک غیر جانبدارانہ طرز عمل اختیار کیے ہوئے تھا، نے اپنے ایک خاص خواجہ سرا کو جہاندار شاہ کے پاس اس فتح کی مبارک دینے کے لیے بھیجا اور ساتھ ہی جہاندار شاہ کو پیغام بھیجا کہ چونکہ وہ ابھی تک اپنے معاہدے پر قائم ہے اور کسی طرح بھی عہد شکنی نہیں کی لہذا اب اس کا کیا ارادہ ہے؟ جب قاصد جہاندار شاہ کے خیمے میں پہنچا تو فاتح جہاندار شاہ جو رات بھر عیش و نشاط میں ڈوبا رہا تھا، اس کی آنکھ لگ گئی ۔ ذوالفقار خان بھی خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ قاصد ایک دوسرے امیر کوکلتاش کے پاس پہنچا جو ابھی بیدار تھا ۔ اس نے قاصد کو دیکھ کر کہا:

"تم بڑے احمق معلوم ہوتے ہو کہ پیغام تہنیت لے کر آئے ہو۔ عظیم الشان اور جہان شاہ کے انجام سے تمہارے مالک کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں ۔ شاید تم جہان شاہ کو دیکھنے آئے ہو، جاؤ ان باپ بیٹوں کی لاشوں کو ادھر جا کر دیکھ لو اور اپنے آقا سے کہہ دو کہ یہ اس کے لیے ایک قسم کا انتباہ ہے"۔[2]

خواجہ سرا نے واپس آ کر رفیع الشان کو سب کچھ کہہ سنایا ۔ یہ سن کر وہ غصّے میں آگ بگولا ہو گیا، خواب غفلت سے بیدار ہو کر آمادۂ پیکار ہوا اور مسلح ہو کر بنفس نفیس اپنے رفیقوں کے

۱۔ غلام حسین طبا طبائی، سیر المتاخرین ۔ جلد دوم، ص ۳۸۲ ۔

William Irvine, Later Mughal. Vol. I, p. 180.

2. Ibid. p. 184.

همراہ معزّ الدین جہاندار کے دربار میں پہنچ گیا ۔ دونوں فوجوں میں خونریز جنگ ہوئی ۔ رفیع الشان کے بیشتر سپاہی امراء اور رفقاء مارے گئے ۔ وہ خود بھی زخموں سے چور چور تھا لیکن اس نے ہاتھ سے تلوار نہ چھوڑی بالاخر داد شجاعت لے کر جاں بحق ہوگیا ۔ یوں تینوں بھائیوں کے خون کی قیمت پر جہاندار کا تخت و تاج بحال ہوگیا ۔

جہان دار کے تخت نشین ہوتے ہی وزیر ذوالفقار خان نے اپنے اور معزالدین کے دشمنوں سے گن گن کر بدلے لیے ۔ اس دوران میں عظیم الشان کے سب سے بڑے لڑکے محمد کریم کو بھی وحشیانہ طریقے سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور اپنے خاص خاص لوگوں کو اعلی عہدوں اور مناصب جلیلہ پر فائز کیا ۔ اپنے رضاعی بھائی کوکلتاش کو "جہان بہادر" کا خطاب دیا ۔ وہ اس پر اس قدر مہربان تھا کہ روزانہ اس کے اقتدار اور منصب میں اضافہ کرتا رہتا ۔ لال کنور (طوائف) کے عشق کا جادو بھی شہنشاہ ہند کے دل و دماغ میں اس حد تک سرایت کرگیا کہ اس کے بھائی خوشحال خان کو ہفت ہزاری اور دوسرے بھائی نعمت خان کو پنج ہزاری کے رتبے تک پہنچا دیا اور خود اس پر اس قدر فریفتہ تھا کہ اسکی ہر خواہش کو پورا کرتا تھا یہاں تک کہ لال کنور کے تینوں بھائیوں کو قسمت خان ، نامدار خان اور خانہ زاد خان کے خطابات سے نوازا گیا حالانکہ یہ خطابات صرف امراء و روسا اور صاحب صلاحیت لوگوں کے لیے مخصوص تھے ۔ جب اس منصب جلیلہ اور جود وسخا سے بھی مطمئن نہ ہوا تو اکبرآباد کے ایک ممتاز اور نامور امیر کو معزول کرکے اسکی جگہ خوشحال خان کو صوبیدار مقرر کردیا لیکن شہنشاہ ہند کی جانب داری اور ایک اجنبی شخص کو اس منصب پر فائز کردینے پر دربار میں ہنگامہ برپا ہوگیا ۔

" ذوالفقار خان نے سند جاری کی اور لطیفہ کے طور پر درخواست حق التحریر کی ، پانچ ہزار ڈھول اور سات ہزار طنبورے پیش کیے جائیں ۔ خوشحال خان کو اس تمسخر سے صدمہ پہنچا چنانچہ اس نے لال کنور کی معرفت اس بات کی اطلاع شہنشاہ کو دی ۔ شہنشاہ اگرچہ ذوالفقار خان کا سراپا احسان مند تھا لیکن جب لال کنور نے اس استہزاء کی اطلاع دی تو اس نے سپہ سالار ذوالفقار (وزیر) کو اپنے روبرو طلب کیا اور دھیمے لہجے میں اس سے خوشحال خان کی سفارش کی

اور کہا مجھے یقین ہے کہ تم نے دھل اور طنبوروں کی درخواست از راہ مذاق کی ہے ۔ وزیر الممالک نے کہا ، حضور سے مذاق یا شوخی تصوّر نہ فرمائیں بلکہ حقیقت ہے ۔ بندوبست امور سلطنت خانہ زادان موروثی کا کام ہے مگر قوال اور رقاصوں کی رعایت ڈھب سے کرنی چاہیئے ، جب کلاونت صوبہ داری کے فرائض انجام دیں گے تو خانہ زادان موروثی کس مرض کی دوا میں کام آئیں گے ۔ میں نے خوشحال خان سے محض اس مقصد کے تحت اتنے ہزار دھل اور طنبورے طلب کیے تھے تاکہ معزول شدہ صوبے داروں اور سپہ سالاروں میں تقسیم کر سکوں کیونکہ انہیں اسی طرح جینے کا حق ہے ، جسطرح دوسروں کو" ۔[1]

یہ جواب سن کر معزالدین جہاندار شاہ نے شرم و ندامت کے مارے اپنا سر جھکا لیا اور اسکی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا ۔

سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد شہنشاہ معد ہر وقت شراب کے نشے میں دھت پڑا رہتا تھا ۔ اس نے رزم کے ہنگاموں سے بچ کر بزم نشاط کو آراستہ کیا ۔ رات کے وقت محل میں میراثی ، بھانڈ اور رذیل لوگوں کا اجتماع ہوتا ، پھر شراب نوشی کے بعد خوب ہنگامہ اور شور وغل ہوتا ۔ یہ سب نازیبا حرکات لال کنور کے لیے کی جاتیں ۔ لال کنور کی دلجوئی یہاں تک کی گئی کہ :

> "ایک روز جہاندار شاہ اور لال کنور محل کی چھت سے دریا کا نظارہ کر رہے تھے کہ ایک کشتی مسافروں سے بھری ہوئی دریا پار جا رہی تھی ۔ محبوبہ نے خواہش ظاہر کی کہ میں نے سواریوں سے بھری کشتی ڈوبتے ہوئے نہیں دیکھی ، شہنشاہ کا اشارہ کافی تھا۔ ملاحوں کو حکم دیا گیا سواریوں سے بھری ہوئی کشتی منجدھار میں لا کر غرق کر دی گئی "۔[2]

اور اس طرح ڈوبتے ہوئے بے بس انسانوں کی دریائی لہروں سے آخری کش مکش کے دردناک منظر

۱۔ غلام حسین طباطبائی ، سیر المتاخرین ۔ جلد دوم ۔ ص ، ۳۸۵ ، ۳۸۶ ۔

2. William Irvine, Later Mughal. Vol. I, p. 192.

سے محبوبہ کی ایک احمقانہ خواہش کو پورا کیا گیا ۔

جہاندار کے تخت نشین ہونے پر یہ محسوس ہونے لگا کہ شمشیر و سنان کا دور ختم ہو چکا ہے اور طاؤس و رباب کا زمانہ آگیا ہے ۔ مغل بادشاہ حکومت کے اہم کاموں کو فراموش کرکے کس طرح عورت اور شراب میں ڈوب گئے تھے ، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ :

"ایک دفعہ لال کنور اور مغل شہنشاہ ایک رتھ میں بیٹھ کر سیر کرنے گئے ۔ واپسی میں لال کنور اپنی ایک سہیلی کے ہاں اتری ۔ جہاندار بھی ساتھ تھا ۔ دونوں نے خوب شراب پی اور نشہ میں دھت قلعہ میں واپس آئے ۔ لال کنور کے ملازموں نے اسے اتار لیا اور جہاندار شاہ رتھ میں ہی پڑا رہا ۔ بہت دیر بعد جب اسکی تلاش کی گئی تو دو میل دور رتھ میں بے ہوش پایا گیا "۔[1]

اس ایک سال کے دور حکومت میں بادشاہ محض کٹھ پتلی تھا اور سلطنت کے کلی امور پر وزیر ذو الفقار علی حاوی تھا گویا جہاندار شاہ کی تخت نشینی ہی مغلوں کے زوال و انحطاط کا نقطۂ آغاز تھی ۔ اس کے ایک سالہ دور حکومت میں عیش و نشاط ، ظلم و ستم اور بدنظمی اپنے عروج پر پہنچ گئے تھے ۔ سلطنت میں ذہین وفطین اور عالم وفاضل لوگوں کو معزول کرکے ان کی جگہ بھانڈوں ، مسخروں ، مغنیوں ، میراثیوں اور طوائفوں کو دے دی گئی ۔ اس طرح اس زمانے میں نااہلوں کو عروج حاصل ہوا کہ "باز کے آشیانے میں چغد آباد ہوگئے اور بلبل کی جگہ زاغ وزغن نے لے لی "۔[2]

وہ حکومت جس کی بنیادیں کمزور ہو چکی تھیں ، وہ کب تک چل سکتی تھی ۔ ابھی ظلم و ستم اور برادر کشیوں کا ایک سال بھی پورا نہ ہوا تھا کہ عظیم الشان کا بیٹا فرخ سیر

---

1. William Irvine, Later Mughal. Vol. I, p. 195, 196.

2. Ibid. p. 193.

جو اپنے باپ کا انتقام لینے کے در پے تھا - سادات بارہہ کے دو سید بھائیوں عبداللہ خان اور سید حسین علی خان کی امداد سے بنگال سے ایک لشکر جرار لے کر آگرہ کی طرف روانہ ہوا اور چچا (جہاندار شاہ) کے اقتدار کا تختہ الٹنے کے لئے ۱۰ جنوری ۱۷۱۲ء میں شہر سے باہر بمقام آگرہ نبرد آزما ہوا - جہاندار شاہ اس دوران میں بھی اپنی داشتہ لال کنور سے مشورے لیتا رہا - فرخ سیر کی افواج کے تیروں کی بوچھاڑ سے معزالدین کی فوج میں بھی ہلچل مچ گئی - لال کنور اور اس کے ہمراہی خواجہ سراؤں کے ہاتھی صدمہ تیر کی تاب نہ لا کر میدان جنگ چھوڑ گئے -

معزالدین ناکام و نامراد اپنی داشتہ کے ساتھ ہاتھی پر سوار ہو کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا - آگرہ سے باہر نکل کر اس نے داڑھی مونچھیں صاف کیں، بھیس بدلا اور لال کنور کے ساتھ ایک بیل گاڑی میں سوار ہو کر دلی روانہ ہو گیا - وہاں وہ ذوالفقار خان کے باپ اسد خان سے پناہ کا طلبگار ہوا لیکن ذوالفقار نے باپ کے حکم کے مطابق اس کو گرفتار کر کے فرخ سیر کے حوالے کر دیا - اسکی یہ حرکت بھی اسکو فرخ سیر کے ہاتھوں سے نہ بچا سکی -

"گیارہ[11] فروری اتوار کے دن فرخ سیر جب دھلی کے قریب پہنچا تو اس کا اشارہ پاتے ہی لاچین قلماق، بہادر دل خان اور دوسرے آدمی چاروں طرف سے ذوالفقار خان پر ٹوٹ پڑے - اس کو زمین پر گرایا - اس کی گردن کے گرد تسمہ ڈال کر اسے مار ڈالا - کچھ لوگ اس کے سینہ پر چڑھ گئے یہاں تک کہ اس کی آخری سانس بھی ٹوٹ گئی - پھر یہ یقین کرنے کے لئے اس کے جسم میں خنجر گھونپے گئے - اس کے پاؤں رسیوں سے بندھے ہوئے تھے - اس کو عوام الناس کے سامنے گھسیٹ کر باہر لایا گیا -[1] محرم کی سولہ تاریخ اتوار کے دن فرخ سیر کے حکم سے معزالدین جہاندار کو بھی پھانسی کا پھندا دے دیا گیا"-[2]

اس قتل و خون کے بعد فرخ سیر بہ تجمل تمام قلعہ شاہجہان آباد میں داخل ہوا - لوگوں کو اب پختہ یقین تھا کہ اب ان کی نگاہیں مزید ہولناک مناظر نہیں دیکھیں گی - لیکن جونہی یہ

---

1. William Irvine, Later Mughal. Vol. 2. p. 253.

۲- غلام حسین طباطبائی، سیر المتاخرین - جلد دوم - ص ۳۹۵

محل میں آیا اور تخت طاؤس پر قدم رکھے تو اس نے حسب ذیل فرمان جاری کیا :

"معز الدین جہاندار شاہ کا سر نیزہ پر اور اس کی لاش ھاتھی پر اور اس ھاتھی کی دم سے ذوالفقار خان کی لاشیں الٹی لٹکا کر تمام شہر میں گھمائی جائیں اور پھر دونوں لاشوں کو تشہیر کے بعد قلعہ کے دروازہ پر ڈال دیا جائے۔"[1]

جب وہ اس فرمان پر بھی مطمئن نہ ھوا تو اس نے ایک اور فرمان جاری کیا :

"آصف الدولہ اسد خان کو گرفتار کر کے پالکی میں سوار کیا جائے اور اس کے جسم پر وھی کپڑا رہے جو اس وقت وہ زیب تن کئے ھوئے ہے۔ اسی حالت میں وہ اسی ھاتھی کے پیچھے ھو جس پر لاشیں رکھی ھوئی ھوں نیز اس کے خاندان کی خواتین نقاب میں علیحدہ گاڑی پر سوار ھو کر ساتھ ساتھ جائیں۔ شہر کا گشت کرنے کے بعد اس کو خان جہان بہادر کے محل میں قید کیا جائے اور کل زر و مال ضبط ھو۔"[2]

یہ اندوھناک اور غمناک جلوس دلّی کی بڑی بڑی سڑکوں اور بازاروں سے گزرتے ھوئے عبرت ناک منظر پیش کر رھا تھا۔ گویا فرخ سیر کی حکومت کا پہلا دن کشت و خون سے شروع ھوا۔ اس کے عتاب کا پہلا نشانہ ذوالفقار خان ھی نہ تھا بلکہ اور بھی قدیم امرا اور رؤسا اس کے ھاتھوں راھیٔ ملک عدم ھوئے۔ وہ اپنے اقتدار کی ھوس میں اس قدر اندھا ھو گیا تھا۔ اس خیال کے تحت کہ سید برادران کہیں شاھی کنبہ سے شہزادہ کو تخت نشین کرنے کی سازش نہ کریں، اس نے شاھی افراد خانہ کو محبوس کر دیا گویا شہزادے بھی اس کے عتاب سے نہ بچ سکے۔

---

1. William Irvine, Later Mughal. Vol. I, p. 254.
غلام حسین طباطبائی، سیر المتاخرین۔ جلد دوم۔ ص، ۲۹۵۔

۲۔ ایضاً۔ ص، ۲۹۵

"اس نے معزّ الدین کے بیٹے اعز الدین عالی تبار ولد اعظم شاہ اور اپنے دس سالہ بھائی همایوں بخت کو محل سے تری پولیہ کے قید خانے میں منتقل کیا اور ان کی آنکھوں میں گرم سلاخیں ڈال کر ان کی آنکھیں نکلوا دیں"۔[1]

فرخ سیر کے تخت طاؤس پر اقتدار حاصل کرنے کے پہلے دن ہی اس طرح خونریزی اور کشت وخون سے ہر چھوٹے بڑے کے ذہن میں ڈر اور خوف کے ایسے بادل چھائے ہوئے تھے کہ سب موت کے خوف سے ڈرنے لگے تھے اور سب کی آنکھوں میں موت کی پرچھائیاں رقص کرنے لگی تھیں۔ "جب لوگ دربار میں حاضری دینے کے لیے گھروں سے رخصت ہوتے تو رسمی طور پر بیوی اور بچوں کو خدا حافظ کہتے اور جب وہ دربار میں اپنے فرائض انجام دے کر زندہ و سلامت گھر پہنچتے تو نہ صرف سکون کا سانس لیتے بلکہ اپنی جان کا صدقہ بھی غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کرتے"۔[2]

فرخ سیر کی یہ حکومت کلیتاً سادات بارہہ کے دو سید بھائیوں حسین علی خان اور حسن علی خان کی رہین منت تھی اور وہی سلطنت کے سیاہ و سفید کے مالک ہو رہے تھے۔ بادشاہ ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی اور برائے نام تھا۔ اس بات کو مرکزی حکومت کی کمزوری پر محمول کرتے ہوئے سکھوں، راجپوتوں اور مرہٹوں نے بغاوتیں شروع کر دیں۔ لوٹ مار اور ظلم و ستم کا بازار گرم کر دیا لیکن سادات بارہہ نے ان کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنا لیا تاکہ بوقت ضرورت ان سے مدد لی جا سکے۔ سکھوں کا پیشوا بندہ بیراگی شاہی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہوا جس کے باعث سکھ پھر سر اٹھانے کے قابل نہ رہے۔ سادات بارہہ نے اگرچہ بادشاہ بنتے ہی ان تمام اختیارات کے حصول کے لیے جد و جہد شروع کر دی، جو ذوالفقار خان نے جہاندار شاہ کے عہد میں حاصل کر لیے تھے لیکن فرخ سیر ابھی اس نوجوانی کے عالم میں بادشاہ کے صحیح مقام کے حصول کے لیے کوشاں تھا نتیجتاً ہوس اقتدار نے

---

1. William Irvine, Later Mughal. Vol. I, p. 280.

2. Ibid. p. 275.

فرخ سیر کو سادات بارھہ سے لڑا دیا ۔ اب کوئی موقع ایسا نہ گزرتا ، جس میں اگر سادات بارھہ کوئی مشورہ دیں تو فرخ سیر اس کی مخالفت نہ کرے یا اگر فرخ سیر کوئی سفارش پیش کرے تو سادات بارھہ اس کی سفارش کو مذاق سمجھ کر نہ ٹال دیں ۔ ابتدائی ایام انہی لڑائی جھگڑوں اور مصالحت میں گزر گئے ۔ کچھ عرصہ بعد فرخ سیر نے سادات بارھہ کے خلاف سازشوں کا جال پھیلا دیا ۔ اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح سادات بارھہ کے اثر سے نکل کر زمام حکومت خود سنبھال لے ۔

اگرچہ فرخ سیر نے سید عبداللہ کو وزارت کے ساتھ قطب الملک ظفر جنگ سپہ سالار اور سید حسین علی کو خازن اعلیٰ کا عہدہ اور امیر الامراء فیروز جنگ کا خطاب دیا ۔ اسی طرح محمد امین خان ، عبدالصمد خان ، راجہ جے سنگھ لواٹی ، سید خان جہاں بارھا میر جملہ قلیچ خان اور دیگر ساتھیوں کو بھی اعلیٰ عہدے پر فائز کیا لیکن وہ سادات بارھہ کے گٹھ جوڑ سے بھی بے خبر نہ رہتا تھا ۔

دراصل فرخ سیر کے ارکان سلطنت کی بدنامی کا سبب یہ تھا کہ فرخ سیر عقل سے مطلق بے بہرہ اور پست ہمت تھا ۔ اس میں جوانی کا جوش اور قوت فیصلہ کی کمی تھی ۔ وہ سلطنت کے کاموں کو حسن خوبی سے پایہ تکمیل تک پہنچانے کی بجائے الجھا دیتا تھا ۔ میر جملہ جیسے طمع اور حسد کرنے والے نا اہل لوگوں کو کل افراد پر فوقیت دیتا تھا ، جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ناتجربہ کار ہونے کے باعث امور مملکت سے قطعاً بے گانہ تھا ۔ اس کے ساتھ ساتھ فرخ سیر میں سیرت و کردار کی کچھ اعلیٰ خوبیاں بھی موجود تھیں ، جس کی بناء پر مولف راحت افزاء اسکو " شہریار نیکو اطوار و جہاں دارے " [۱] لکھتا ہے :

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ " جب تک آپ کے والد بقید حیات رہے ، فرخ سیر پر آنچ نہ آنے دی ۔ جو لوگ بادشاہ کی مسند الٹنے کے درپے تھے ، آپ کے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم نے ان سے

---

۱ ۔ سید محمد علی الحسینی ، تاریخ راحت افزا ۔ ص ، ۶۵

فرمایا تھا - " برائے نی این را هم چنین بگـذارید " -[1]

لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ وہ سید بھائیوں کے چنگل میں اس ہی طرح سے پھنس گیا تھا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار نہ لا سکا - اس نے ملک کی سیاسی وانتظامی بد حالی کو دیکھتے ہوئے اور اپنی بے بسی کا احساس کرتے ہوئے کئی مرتبہ سید بھائیوں سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا - بالآخر دونوں بھائیوں نے اس کو اپنی راہ میں خطرہ سمجھتے ہوئے یہ کانٹا بھی نکال ہی دیا - ۲۷ فروری ۱۷۱۹ء کو سید عبداللہ نے رنجیت سنگھ کے ہمراہ دربار شاہی میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن فرخ سیر کی افواج نے مزاحمت کی - دوسرے دن پھر بعض امراء نے محل میں داخل ہونے کی ناکام کوشش کی - فرخ سیر اس دوران میں اپنے حرم میں خلوت نازنینان میں چھپا ہوا تھا کہ افغان سپاہیوں کے ایک دستہ نے محل میں گھس کر فرخ سیر کو حرم سے باہر نکالا :

" اس کو تخت سے گھسیٹ کر اتار دیا گیا - حالت یہ تھی کہ ننگے
سر اور ننگے پاؤں تھا اور اس پر لاتوں ، گھونسوں اور گالیوں کی
بوچھاڑ ہو رہی تھی - اس قدر زد و کوب کے بعد اس کو قید کر دیا
گیا - فاقے دیے گئے - بصارت سے محروم کر دیا گیا - زہر دیا گیا" -[2]

آخر ۲۸ اپریل ۱۷۱۹ء کو اسے موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد ہمایوں کے مقبرے میں دفن کر دیا گیا - میر تقی میر نے فرخ سیر کے نابینا ہونے پر یہ شعر کہا تھا :-

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی   انہیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں -[3]

۱- مناظر احسن گیلانی ، تذکرہ شاہ ولی اللہ - ص، ۱۶۱ -

2. William Irvine, Later Mughal. Vol. I, p. 390.

۳- شعر میر تقی میر -

اس طرح اس کا سات سالہ دورِ حکومت انجام کو پہنچا ۔ اس دوران میں نظم و نسق کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور چہار سو بدنظمی کا دور دورہ تھا ۔ اس کے عہد میں جاٹ قوم کے سردار چورامن نے شورشوں اور بغاوتوں کا طوفان برپا کیا ہوا تھا ۔ مرہٹوں نے بھی طوفان بدتمیزی پیدا کیا ہوا تھا ۔ ان حالات میں سادات بارہہ نے مجلس سلاطین سے رفیع الشان کے بیٹے رفیع الدرجات کو پکڑ کر تخت نشین کر دیا لیکن افیون کے نشے اور شراب کی کثرت کے باعث شہزادے کو چند دن کی حکومت نصیب ہوئی ۔ اس کے بعد اسکے بھائی رفیع الدولہ کو تخت نشین کیا گیا ۔ وہ بھی منشیات کے بکثرت استعمال سے چند روز بعد راہی ملک عدم ہوا ۔ اب سادات بارہہ نے بہادر شاہ کے ایک پوتے روشن اختر محمد شاہ کو قید سے نکال کر تخت نشین کیا ۔ سید برادران کے ہاتھوں چند ماہ کے عرصہ میں تین بادشاہوں کے عزل و نصب کی وجہ سے یہ "بادشاہ گر" سید مشہور ہوئے ۔ سادات بارہہ نے اس اثنا میں مکمل اقتدار حاصل کر لیا تھا ۔ وہ جفاکش بہادر اور دلیر سپاہی ضرور تھے لیکن سیاسی نظریات سے یکسر عاری تھے ۔

زوال کے اثرات:

اورنگ زیب عالمگیر کی زندگی میں ہی مغلوں کی عظیم الشان سلطنت کی طنابیں کٹنے لگی تھیں لیکن شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر محنتی ، بہادر ، دور اندیش ، مضبوط کردار اور باتدبیر جرنیل تھا ۔ ناقابل شکست ، مرعوب کن شخصیت اور اعلیٰ تنظیمی اور جنگی صلاحیتوں کے باوصف اس نے اپنی حکمت عملی اور تدبّر سے کام لے کر عظیم الشان مغلیہ سلطنت کے زوال و انحطاط کے آثار نمایاں نہ ہونے دیے ۔ اورنگ زیب کے بعد جتنے بادشاہ سریر آرائے سلطنت ہوئے وہ سب کے سب اس سے کہیں کم صلاحیتوں کے مالک تھے ۔ اورنگ زیب کے بعد دس سال کے عرصے میں تخت کی وارثت پر سات بار لڑائی ہوئی ، جس سے زوال کی رفتار تیز ہو گئی ۔ اس لحاظ سے محمد شاہ کا عہد مغلیہ دورِ حکومت کی تباہی و بربادی کا مکمل نمونہ ہے ۔ محمد شاہ نے ۱۷۱۹ء سے ۱۷۴۸ء تک حکومت کی ۔ اس کا پورا دور انتشار و اضطراب نکبت و ادبار ، اور زوال و انحطاط

کی طویل داستان ہے ۔ مرہٹوں اور جاٹوں کی تباہ کاریاں ، نادر شاہ کا دلی میں فتنہ وفساد اور قتل وغارت کرنا ، احمد شاہ ابدالی کا حملہ اور قتل عام ، یہ سب محمد شاہ کے عہد میں ہی ہوئے ۔ درباری سازشیں ایرانی و تورانی گروہوں کے اقتدار کی جنگ بھی زوال کی رفتار کو تیز ترکرنے کی ذمہ دار ہے ۔ ایک طرف مغل حکومت کی دشمن طاقتیں ان کے خلاف متحد تھیں تو دوسری طرف خود حکومت انتشار وخلفشار کا شکار تھی ۔ ان وجوہات کے باعث مغل حکومت لاچار اور بے بس ہوگئی ۔

محمد شاہ لہو ولعب کا دلدادہ اور ملکی امور سے غافل تھا ۔ اس کے اطوار نہایت ناپسندیدہ تھے ۔ یہ اپنی رنگ رلیوں اور عیش وطرب کی محفلوں میں زیادہ وقت گزارنے کی وجہ سے محمد شاہ رنگیلے کے نام سے پکارا جانے لگا ۔

سادات بارہہ محمد شاہ کو تخت نشین کرنے کے بعد یکگونہ پر سکون اور مطمئن ہوگئے ۔ اب بھی سید برادران کی گرفت حکومت پر بدستور قائم تھی لیکن آہستہ آہستہ مالوہ کے نظام الملک کے ساتھ دونوں بھائیوں کے تعلقات ناخوشگوار ہوگئے ۔ محمد شاہ جانتا تھا کہ جب تک سید بھائیوں سے گلو خلاصی نہیں ہوگی ، نہ تو وہ پرسکون ہوکر کوئی کام کر سکتا ہے اور نہ ہی اپنی جان اور عزت وناموس کی حفاظت کر سکتا ہے کیونکہ محمد شاہ ، سادات بارہہ کی سفاکانہ خود غرضیوں ، بے رحمانہ دست درازیوں اور قتل وغارت وخونریزی کا عالم دیکھ چکا تھا ، اس لیے اس نے امراء خصوصاً نظام الملک اور اعتماد الدولہ امین خان (وزیر) کی مدد سے ان کا زور توڑا ۔ یہاں تک کہ ان کا بالکل خاتمہ کر دیا اور نتیجتاً سید برادران کا آہنی شکنجہ ہٹنے کے بعد محمد شاہ کو یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وہ ہر قسم کی نحوست اور بدحالی ، انتشار وخلفشار ، بدامنی وبے چینی اور اضطراب واضمحلال کے باوجود تقریباً تیس (۳۰) برس تک تخت حکومت سے چمٹا رہا ۔

نظام الملک آصف جاہ نے لہو ولعب اور رنگ رلیوں کے دلدادہ شہنشاہ کی توجہ کئی بار امور سلطنت کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی اور بادشاہ کے سامنے اصلاحات بھی پیش کیں لیکن روشن الدولہ جیسے نااہل امراء نے بھرے دربار میں نظام الملک کی تضحیک کی ۔ ظفر خان نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا " کہ آپ نے دیکھا " دکنی بندر کس طرح ناچتے ہیں " ۔[1]

۱۔ نظام الملک کا تعلق دکن سے تھا ۔ اس لیے دکن کی مناسبت سے اس کی تضحیک کی گئی ۔

یہ اشارہ نظام الملک کی طرف تھا چونکہ نظام الملک بہت مدبّر ، بہادر ، فن فہم اور دور اندیش تھا ۔ اس نے ان فقرہ بازیوں اور مضحکہ خیزیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے دکن جانے کا عزم صمیم کر لیا چنانچہ وہ ناامیدی اور بیزاری کی حالت میں ۱۷۲۹ء میں شکار کے بہانے دکن روانہ ہو گیا ۔ نظام الملک کے روانہ ہونے کے بعد دلّی کی حالت مزید خراب ہو گئی ۔

محمد شاہ کے دور حکومت میں ہندوستان کے دور دراز صوبوں میں نیم خود مختار ریاستیں کا قیام عمل میں آیا دکن میں آصف جاہی حکومت کی داغ بیل ڈالی گئی ۔ بنگال اور اودھ آزاد ریاستیں بن گئیں ۔ مرہٹوں ، جاٹوں ، روہیلوں اور راجپوتوں نے بھی اپنی نیم خود مختار حکومتیں قائم رکھیں ۔ خاص طور پر مرہٹوں اور جاٹوں کے ظلم و ستم اور لوٹ کھسوٹ نے ہندوستان کے امن و سکون کو برباد کیا ہوا تھا ۔ محمد شاہی عہد میں چوڑامن کے بھتیجا زاد بھائی سورج مل جاٹ نے بغاوتوں اور شورشوں کا طوفان بدتمیزی پیدا کیا ہوا تھا ۔ دلی خاص طور سے آفات و مصائب کا ہدف بنی ہوئی تھی لیکن محمد شاہ دلی میں غرق بے تاب ، عیش و عشرت اور رامش و رنگ میں ڈوبا ہوا صبح و شام سے بے خبر دار عیش لے رہا تھا ۔ اس وقت "سلطنت مغلیہ پر بڑی حد تک زوال آ چکا تھا ، بادشاہوں کے جمع کیے ہوئے خزانے خانہ جنگیوں کی بدولت خالی ہو چکے تھے ۔ سلطنت کے نظم و نسق میں ابتری پیدا ہوتی تھی ۔ مال گزاری مشکل سے وصول ہوتی تھی ۔ عہدہ داروں کی تنخواہیں چڑھی رہتی تھیں اور بادشاہوں کے بار بار بدلنے سے شاہی افسروں کی وفاداری میں فرق بڑھنے لگا تھا ۔ خانہ جنگیوں اور راجپوتوں ، سکھوں ، جاٹوں اور مرہٹوں کے خلاف مسلسل لڑائیوں کی وجہ سے پرانے امراء کا خاتمہ ہو گیا تھا ۔ نہ فوج میں کارگزاری کی لیاقت اور مستعدی باقی رہی تھی نہ اس کے سپہ سالاروں میں بہادری اور وفاداری ۔ بادشاہ سے لے کر ادنیٰ عہدہ دار تک پورے حکمران طبقہ کی اخلاقی حالت خراب ہو گئی تھی ۔ ہر شخص کو اپنی / پڑی تھی ۔ سلطنت کی بہبودی کا کسی کو خیال نہ تھا " ۔[1]

---

1. Dr. Tara Chand, A Short history of the Indian people. p. 295.

اس اندرونی خلفشار میں بیرونی طاقتوں نے بھی ہندوستان کو للچاتی ہوئی نظروں سے دیکھنا شروع کیا ، جس میں نادر شاہی حملہ سرفہرست ہے۔

نادر شاہی حملہ :

نادر شاہ نے بلخ اور ہرات کے علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد غزنی اور کابل کا رخ کرتے ہوئے ان علاقوں کے کوتوال کو لکھا :

" میں جانتا ہوں کہ محمد شاہ کے ملک سے میرا کوئی تعلق نہیں لیکن چونکہ یہ سرحدیں میری مملکت میں پڑتی ہیں اور بہت سارے مغرور افغان جن میں تم بھی شامل ہو ، مجھ سے آن ملے ہیں ۔ اس لیے میں مفسدوں کی بری نسل کو روئے ارض سے پاک کر دینا چاہتا ہوں لہذا میری ذات سے تمہارا مشکوک یا خوفزدہ ہونا بیکار ہے ۔ بہتر یہ ہے کہ تم اپنے مہمان کے استقبال کی تیاریاں شروع کر دو " ۔[1]

لیکن انتہا یہ کہ نادر شاہ کے قاصدین کو جواب سے محروم رکھا گیا ۔ قندھار پر حملے کے دوران میں نادر شاہ نے یہ محسوس کیا کہ قندھار کے محاصرے کے باوجود بہت سے باغی کابل میں پہنچ کر پناہ لیے رہے ہیں ۔ علاوہ ازیں نادر شاہ نے محمد شاہ کو کئی خطوط لکھے کہ وہ افغانیوں کو اپنے ملک سے نکال دے لیکن اس شاہ بے خبر کو اپنی رنگ رلیوں سے فرصت کہاں کہ وہ ان باتوں پر غور کرتا ۔ نادر شاہ نے پیغام دے پا کر پھر محمد شاہ کی طرف ایلچی روانہ کیے ۔ باغیوں نے ان کو محمد شاہ کے پاس پہنچنے سے پیشتر ہی موت کے گھاٹ اتار دیا ۔ نادر شاہ نے یہ سنا تو اس کے غیظ وغضب کی چنگاریاں ایک دم سے بھڑک اٹھیں ۔ اس نے شہر (کابل) کا چاروں طرف سے محاصرہ کر لیا ۔ کابل کے صوبہ دار ناصر خان نے ایک قاصد کو امداد طلب کرنے کے لیے دہلی بھیجا لیکن صمصام الدولہ خان دوران نے ازراہ مذاق یہ

۱۔ غلام حسین طبا طبائی ، سیر المتاخرین ۔ جلد دوم ۔ ص ، ۲۸۰ ، ۲۸۱

کہتے ہوئے ٹال دیا "کہ اس دارالخلافہ کے مکانوں کی چھتیں بہت اونچی ہیں اور اتنی اونچی چھتوں پر سے یہاں کے شہری نادر شاہ اور اسکے قزلباشوں کو دور سے دیکھ سکتے ہیں"۔[۱]

۲۶ نومبر کو نادر شاہ نے کابل کے گورنر کو جمرود کے مقام پر شکست دے کر پشاور پر قبضہ کر لیا۔ پیش قدمی کرتے ہوئے وہ وزیر آباد پہنچ گیا، جہاں لاہور کے قریب گورنر لاہور زکریا خان نے مزاحمت کی مگر شکست کھائی۔ نادر شاہ نے لاہور سے چلتے ہوئے محمد خان ترکمان (قاصد) کا حوالہ دے کر محمد شاہ کو دو تین بار پیغام بھیجا کہ وہ ایلچی جس کو پیغام دے کر روانہ کیا گیا تھا، آخر کہاں ہے لیکن پھر بھی ان پیغامات کا کوئی جواب نہ دیا گیا۔ نادر شاہ ۲ فروری کو کرنال کے قریب پہنچ گیا تو انبالہ کے گورنر نے اسے روکنا چاہا مگر ناکام ہوا۔ ۲۴ فروری کو افواج نادر شاہ اور افواج شاہی کے درمیان عام جنگ کا آغاز ہوا۔ خان دوران مجروح ہونے کے باعث انتقال کر گیا۔ نظام الملک نے برہان الملک کی مدد کے لیے نہ تو خود حرکت کی اور نہ ہی اسکی افواج کا کوئی حصّہ حرکت میں آیا نتیجتاً "گھنٹوں کی جھڑپ کے بعد نظام الملک کی بے توجہی کی وجہ سے یا مغلیہ افواج کی کمزوریوں کے سبب محمد شاہ کو شکست ہوئی۔ آخرکار دو کروڑ روپیہ تاوان جنگ ادا کرنے کے وعدے پر دونوں میں صلح ہوئی:

> "تاوان جنگ وصول کرنے کے لیے نادر شاہ، قیدی مثل تاجدار کو ہمراہ لے کر دہلی آیا۔ بابر و اکبر کا یہ جانشین تخت رواں پر سوار نہایت خاموشی اور ذلت کے ساتھ اپنے دارالسلطنت میں داخل ہو رہا تھا۔ صرف چند امراء سر جھکائے جلو میں تھے"۔[۲]

۲۲ مارچ ۱۷۳۸ء میں نادر شاہ کے نام کا خطبہ جامع مسجد میں پڑھا گیا۔ دوسرے دن غروب آفتاب کے وقت پورے شہر میں یہ افواہ آگ کی طرح پھیل گئی کہ نادر شاہ ایک قلماقنی عورت کے ہاتھوں

۱۔ غلام حسین طباطبائی، سیر المتاخرین۔ جلد دوم۔ ص، ۲۸۱

2. J.N. Sarkar, Nadar Shah in India. p. 60.

ھلاک ھوگیا ھے - نادر شاہ کی فوج کے سپاھی شہر کے چاروں طرف بھنسر اسلحہ کے گشت کر رھے
تھے - شہر کے ارد گرد اس افواہ کا پھیلنا تھا کہ ھندوستانی مسلح دستے سڑکوں پر نکل آئے -
نادری سپاھی بھنسر اسلحہ کے اور مقامی زبان سے بالکل ناواقف تھے - اس لیے انہیں ذرا بھی
شک نہ ھوا کہ ان کے خلاف کچھ ھونے والا ھے - ھندوستانی مسلح دستے ھندوں کے کشت و خون
اور قتل و غارت گری میں مصروف ھوگئے - کہا جاتا ھے کہ اس بلوے میں نادر شاہ کے نو سو ۹۰۰ آدمی
مارے گئے -

• علی الصبح ھنگامہ بہت زور پکڑ چکا تھا - نادر شاہ سخت غیظ و غضب کی حالت
میں قلعہ سے برآمد ھوا اور گھوڑے پر سوار ھو کر رفع فساد کے لیے چاندنی چوک کی طرف بڑھا ،
جہاں بلوے کا زیادہ زور تھا - راستے میں رات کے مرے ھوئے اپنے بہت سے سپاھیوں کی لاشیں دیکھ
کر اس نے ایک مضبوط دستہ بلوا فرو کرنے کے لیے بھیجا - ان کو حکم تھا کہ دھمکی اور معمولی
دباؤ سے کام لیں اور مجبوری کی حالت میں تلوار اٹھائیں - اس پسند رعایا پر ھاتھ نہ اٹھے -
انؔ کی نرمی اور احتیاط کو دیکھ کر بلوائیوں کے حوصلے بڑھ گئے - بے دھڑک بندوقیں سر کرنے اور
تیر برسانے لگے - نادر شاہ کوتوال کے چبوترے کے قریب روشن الدولہ کی مسجد میں چلا گیا اور غصےؔ
کو ضبط کیے بیٹھا واقعات کا مشاھدہ کرتا رھا - کچھ بلوائی مسجد کے زینہ پر چڑھ آئے اور نادر شاہ
پر اینٹ پتھر پھینکنے لگے - اتنے میں کسی نے ایک مکان کے چھجے یا کھڑکی سے بندوق کا فائر کیا -
نادر بال بال بچا لیکن پہلو میں جو ایرانی سردار کھڑا تھا ، وہ ھلاک ھوگیا - نادر شاہ
غصےؔ سے بپھر گیا اور اسی وقت تلوار نیام سے نکال قتل عام کا حکم دے دیا - چشم زدن میں اس کے
سپاھی چھتوں اور دیواروں پر چڑھ کر قتل و غارت میں مصروف ھوگئے - موت کا بازار گرم ھونے
لگا - قلعے کے سامنے صرافہ اردو سے عید گاہ تک تین کوس کے اندر ایک جانب چتلی قبر اور دوسری
جانب تمباکو منڈی اور مٹھائی کے پل تک خون کی بارش ھونے لگی اور لہو کے فوارے چھوٹنے
لگے - ھر طرف تلواروں کی جھنکاریں ، کھچا کھچ کی آوازیں اور آہ و زاری اور فریاد کی صدائیں تھیں -
سڑکیں اور گلی کوچے دو طرفہ لٹ رھے تھے اور مکانوں سے آگ کے شعلے بلند ھو رھے تھے - جو شخص

جہاں ملا - سڑک پر یا گلی کوچے میں ،مکان میں یا دوکان پر بلا امتیاز اس کے کہ وہ بڑا تھا یا چھوٹا ، مرد تھا یا عورت تہہ تیغ ہونے لگا - آدمیوں اور جانوروں میں تمیز نہ رہی ۔[1]

یہ قتل عام صبح آٹھ بجے سے شروع ہو کر شام تین بجے تک جاری رہا - کم از کم تیس ہزار افراد قتل کر دیئے گئے ۔ عزت و ناموس کی خاطر دس ہزار عورتوں نے کنوؤں میں چھلانگ لگا کر جان دے دی - کچھ عورتیں دو تین دن بعد زندہ نکالی گئیں - اس حملے سے جو جانی نقصان ہوا وہ اتنا اہم نہیں جتنا مالی نقصان - جس کی وجہ سے مغل حکومت کی شہ رگ سے خون رسنے لگا تھا ۔[2] نادر شاہ اپنے قلعے میں واپس آ چکا تھا - کسی کی اتنی جراُت نہ تھی کہ بے یارو مدد گار لوگوں کی فریاد نادر شاہ تک پہنچاتے آخر بڑی ہمت سے محمد شاہ کی طرف سے نظام الملک اور قمرالدین خان نے نادر شاہ سے رحم کی درخواست کی - چنانچہ نادر شاہ نے قتل عام اور لوٹ کھسوٹ کی ممانعت کر دی - آگ بجھا دی گئی مگر شہر کا بیشتر حصّہ نذر آتش ہو چکا تھا ، ۵۰ ہزار قیدی رہا کر دیئے گئے - اور بلا امتیاز و تفریق مذہب لاشوں کو نذر آتش کر دیا گیا - قتل عام کے بعد نادر شاہ نے بے شمار زرومال اکٹھا کرنا شروع کر دیا - نقد و جواہر ، ظروف و لباس اور دیگر اشیاء ستر کروڑ روپے کی تھیں اسکے علاوہ ۔ نادر شاہ ایک ہزار ہاتھی سات ہزار گھوڑے ۔ دس ہزار اونٹ ساتھ لے گیا اور ایک سو تیس خوش نویس اور کاتب ، دو سو لوہار ، تین سو راج اور بیلدار ، سو سنگ تراش اور ڈیڑھ سو بڑھئی معقول تنخواہوں پر ملازم رکھ کر لے گیا ۔[3] اس طرح ایشیا کی سب سے بڑی دولت مند حکومت کے خزانے بالکل خالی ہو گئے -

اس پر طرّہ یہ کہ قتل عام کے بعد نادر شاہ نے اپنے بیٹے کی شادی بڑی دھوم دھام سے عالمگیر کی ایک پوتی سے کر دی - ستر کروڑ روپے کا سامان مع تخت طاؤس لے کر واپس دہلی چلا گیا -

---

۱- حسن عابد جعفری ، نادر شاہ ، ص - ۱۰۱ ، ۱۰۲

William Irvine, Later Mughal. Vol. II, p. 367, 368.

2. Ibid. p. 369.

۳- حسن عابد جعفری - نادر شاہ - ص ۱۲۲ -

۵ مئی ۱۷۳۹ء کو نادر شاہ، محمد شاہ کو تاج ہند واپس کر کے اپنے ملک روانہ ہو گیا۔

نادر شاہ کے دھلی سے کوچ کر جانے کے بعد ہندوستان کی رعایا ذہنی اور اخلاقی پستیوں میں گر چکی تھی۔ "نادر شاہ کی روانگی سے اب تک یعنی ۲۲ جون تک سلطنت کے نظم ونسق کے متعلق نہ کوئی کام ہوا اور نہ ہی صلاح مشورے کی نوبت آئی۔ یہ حادثہ عظیم بھی جو قیامت کا نمونہ تھا۔ غرور ونخوت کے سرشاروں کو فراغت کی نیند، تساھل اور آرام طلبی کے خمار سے نہ جگا سکا۔ یہاں کسی کا دل صاف نہیں ہے۔ معمولی بول چال میں بھی بغض وحسد ہوتا ہے۔ قتل عام میں جن عمارتوں کو کم صدمہ پہنچا تھا۔ آباد ہو چلی تھیں۔ باقی اسی حالت میں ہیں، اگر برسات سے پہلے مرمت نہ ہوئی تو زمین دوز ہو جائیں گی"۔[1]

"مصائب نے تکلیفوں اور صدموں سے اہل شہر کے دل ودماغ پر بہت اثر کیا ہے۔ ان کی حالت عبرتناک ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی نے عمل سفلی کے ذریعے ان کے ہوش وحواس مختل اور قوی معطل کر دیے ہیں اور زیادہ حیرت کا معاملہ یہ ہے کہ نادر شاہ کے جانے کے بعد ان لوگوں کی غیرت وحمیّت یک لخت رخصت ہو گئی ہے کہ شاید مظالم اور ذلتیں برداشت کرنے اور نادر شاہ کے سپاہیوں کے گندے الفاظ اور وحشیانہ حرکتوں کا ہدف بننے کے اب تک چرچے ہوتے ہیں اور دوسروں کی مصیبتوں کا ذکر ہر صحبت میں اطمینان کے ساتھ مسرّت آمیز الفاظ میں یا ظرافت کے پیرایہ میں بیان ہوتا ہے۔ مظلوموں اور ستم دیدہ و ستم رسیدہ مخلوق کی نقالیاں ہوتی ہیں۔ ان لوگوں کو اپنی ذلتیں اور مصیبتیں بالکل یاد نہیں رہیں۔ شہر کے اندر اور باہر بھی لاشوں کا تعفّن ہے لیکن یہ لوگ کھلکھلا کر ہنستے ہنساتے پھرتے ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نادر شاہ کی واپسی کا ان کو ملال ہے کہ اب مزید رسوائیوں اور بربادیوں کے مشاہدوں کا موقع نہ ملے گا"۔[2]

۱۔ حسن عابد جعفری ۔ نادر شاہ ۔ ص۱۲۰

۲۔ ایضاً ۔ ص۱۲۱

ان کمزور بادشاہوں کی کمزوریوں اور نادانیوں کی رعایا کے لیے یہ پہلی سزا تھی کہ انہیں بے دردی اور سنگ دلی کے ساتھ کھیلا گیا ۔ نادر شاہ نے پورے ہندوستان اور خاص طور پر دلّی پر ایسی کاری ضرب لگائی تھی کہ جس سے دلّی ایک مدت تک نہ سنبھل سکی ۔ بہار، اڑیسہ ، روہیل کھنڈ کے صوبے باغی تھے ۔ // (مرکز دلّی) کا ان پر کسی قسم کا دباؤ نہ تھا ۔ سکھوں نے بھی تقریباً چالیس برس کے بعد سر اٹھانا شروع کر دیا ۔ شاہراہیں غیر محفوظ اور قصبے گاؤں ویران ہو گئے تھے کیونکہ ملکی دولت اور خزانہ نادر شاہ لوٹ کر اپنے ساتھ لے گیا تھا اور جو تھوڑا بہت باقی رہ گیا تھا ، اس کو ختم کرنے کے لیے احمد شاہ ابدالی نے اپنے حملے شروع کر دیے ، جس سے ہندوستان اور اسکے عوام بالکل ہی شکستہ حال نڈھال اور چور چور ہو گئے ۔

احمد شاہ ابدالی کے حملے :

احمد شاہ ابدالی ہرات ، قندھار اور کابل کو فتح کرتا ہوا ہندوستان آ پہنچا ۔ جونہی محمد شاہ کو احمد شاہ ابدالی کی افواج کی آمد کی اطلاع ملی تو اس کے مقابلے کے لیے ۱۹ جنوری ۱۷۴۸ء کو محمد شاہی افواج سرہند سے ماچھیواڑہ کی طرف بڑھیں مگر احمد شاہ نے لاہور سے لدھیانہ کا راستہ اختیار کیا اور سرہند پر قابض ہو گیا ۔ احمد شاہ ابدالی نے محمد شاہی افواج کا مقابلہ کرنے کے لیے اس طریقے سے محاصرہ کیا کہ وزیر قمر الدین اس کا نشانہ بن گیا ۔ اس کے بعد صفدر جنگ نے فوج کی کمان سنبھالتے ہی احمد شاہ ابدالی کی افواج پر حملہ بول دیا اور ہندوستانی افواج کو فتح نصیب ہوئی ۔

۱۲ اپریل ۱۷۴۸ء کو محمد شاہ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا احمد شاہ (۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء) تخت نشین ہوا مگر وہ اپنے مختصر دور حکومت میں سازشی عناصر اور خود غرض مشیروں کا آلہ کار بنا رہا ۔ احمد شاہ نہ تو انتظام سلطنت کا کوئی تجربہ رکھتا تھا اور نہ ہی فوجی زندگی کا ۔ اس نے اپنا زیادہ تر وقت یا تو حرم کی عورتوں کے ساتھ رہ کر گزارا تھا یا اس کے قریب ترین لوگوں میں سے مخنث تھے ۔ طبیعت خام تھی اور مزاج میں شروع سے رنگینی ، دناءت اور ابتذال کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا ۔

حکومت کے کاموں میں محمد شاہ کی بیوہ ، فرخ سیر کی بیٹی ملکہ زمانی اور نواب بہادر خاں خواجہ سرا کا بے حد عمل دخل تھا ۔ احمد شاہ ، جاوید خاں خواجہ سرا کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا ۔ وہ اسے جو راستے دیتا تھا ، احمد شاہ اسے بسر و چشم قبول کرتا تھا۔ اوّل تو شاہ وقت عقل مندی کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا تھا اگر کچھ سوجھ بوجھ اور عقل تھی تو وہ شاہد وشراب کی کثرت نے ختم کر دی تھی ۔ آہستہ آہستہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ "محل کے ایک ایک کونے تک سوائے خوش رو جوان عورتوں کے کسی مرد کی صورت بھی نظر نہ آتی تھی اور وہ تمام وقت ان ہی کے ساتھ باغوں اور مرغزاروں میں صرف کرتا تھا"۔[1]

ادھم بائی طوائف (مادر احمد شاہ) کو نواب قدسیہ ، حضرت بیگم عالم ، صاحب الزمانی وغیرہ کے خطابات دیے گئے ۔ خواجہ سرا جاوید امور سلطنت سرانجام دیتا تھا ۔ اس نے اپنے رذیل فرقے کے گھٹیا لوگوں کو بڑے بڑے مناصب عطا کرنے شروع کر دیے ۔ وہ ان پڑھ تھا اور کبھی کسی جنگ میں شریک نہ ہوا تھا لیکن ملکی اور جنگی مسائل اب وہی حل کرتا تھا ۔ امرائے سلطنت کو حکم تھا کہ وہ شہنشاہ کو خواجہ کی وساطت سے ملیں ۔ قدیم امراء نے اس رسوائی سے دربار میں آنا ترک کر دیا ۔ ادھم بائی اور جاوید میں گہرا گٹھ جوڑ تھا ۔ اس کے اوباش بھائیوں کو اہم مناصب دیے گئے ۔ احمد شاہ گڑیوں کے کھیل کھیلتا یا عورتوں کی صحبت میں وقت گزارتا "۱۷۵۳ء میں اس نے اپنے تین سالہ بیٹے کو پنجاب کا صوبے دار مقرر کیا اور لاہور میں ایک ایک سالہ بچے کو اس کا نائب بنا دیا ۔ یہاں دیوان خاص میں تین سالہ بچہ نذریں اور سلام لیتا اور اپنے نائب کے لیے لاہور میں تحفے تحائف بھیجتا"۔[2]

احمد شاہ نے ۱۷۴۹ء میں پھر حملہ کیا لیکن معین الملک صوبے دار پنجاب نے پنجاب کے چار محالوں کی تحصیل وصولی چودہ لاکھ روپے سالانہ خراج دینے کا وعدہ کیا اور نجات پائی۔

---

1. Keene, Fall of the Mughal Empire. p. 29.

2. J.N. Sarkar, Fall of the Mughal Empire. Vol. I, p. 331.

۱۷۵۲ء میں احمد شاہ ابدالی نے تیسری بار حملہ کیا ۔ احمد شاہ ابدالی نے اپنے کچھ مطالبات اپنے ایلچی کے ذریعے دلی روانہ کیے ۔ معین الملک نے ایسے حالات پیدا کیے کہ احمد شاہ ابدالی کو ناکام و نامراد لوٹنا پڑا مگر ادینہ بیگ کی غداری کے سبب احمد شاہ کو احمد شاہ ابدالی کے مطالبات کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے پنجاب اور ملتان کے علاقے افغانستان کی حکومت کے حوالے کرنے پڑے ۔ احمد شاہ ابدالی معین الملک کو پنجاب کا گورنر مقرر کرکے خود کابل واپس چلا گیا ۔

صفدر جنگ کو پنجاب اور ملتان کے علاقے افغانوں کے سپرد کر دینے پر بہت تشویش تھی ، جس کی وجہ سے احمد شاہ اور صفدر جنگ کے درمیان تعلقات ناخوشگوار ہوگئے ۔ صفدر جنگ نے اس ذلت آمیز معاہدے کی تمام تر ذمہ داری احمد شاہ کے معتمد و مقرب جاوید خان پر عائد کی ۔ آخر صفدر جنگ نے ایک دعوت کا اہتمام کیا ، جس میں جاوید کو مدعو کرکے اسے خنجر مار کر ہلاک کر دیا ۔ اس کے بعد صفدر جنگ نے بغاوت کی تیاریاں شروع کر دیں ۔

مئی ۱۷۵۳ء میں مرکز میں وزراء کے درمیان خانہ جنگی کا آغاز ہو چکا تھا ۔ آصف جاہ نظام دکن کے پوتے امیر الامراء نوجوان غازی الدین خان عماد الملک کی صفدر جنگ سے رقابت شروع ہوگئی ۔ اسی دوران میں نواب وزیر صفدر جنگ نے سورج مل جاٹ کو اپنا حلیف بنا لیا اور عماد الملک نے مرہٹوں کو اس طرح جاٹوں اور مرہٹوں کو مرکزی سیاست میں دخل حاصل ہوگیا ۔ "صفدر جنگ نے سورج مل جاٹ سے سازش کرکے پرانی دلی پر حملہ کر دیا اور تمام باشندگان شہر کو لوٹ لیا ۔ ہزاروں گھروں کو بے چراغ کر دیا ۔ اس ظلم و ستم کو مدت تک دہلی کے باشندے مرہٹہ اور پٹھان کے ساتھ ساتھ " جاٹ گردی " کے نام سے یاد کرتے ہیں "۔[1]

احمد شاہ نے شہر کے دروازوں کو بند کرکے جنگ توپ خانہ شروع کی ۔ آخر طویل محاصرے سے تنگ آکر فریقین (احمد شاہ اور صفدر جنگ) نے صلح کرلی ۔ اس کے بعد سورج مل جاٹ کی شان و شوکت اور عظمت میں اضافہ ہوتا گیا ۔ دہلی سے دو کوس کے فاصلے سے لے کر آگرہ کے آخر تک طول میں اور میوات کے حدود سے فیروز آباد اور شکوہ آباد تک عرض میں سورج مل جاٹ قابض ہوگیا ۔ مثلہ

---

1. J.N. Sarkar, Fall of the Mughal Empire. Vol. I, p. 481,482.

حکومت کی کمزوری اور صفدر جنگ کی سازش نے جاٹوں کو دھلی پر حملہ کرنے کی ھمت دلائی ۔ امراء کے آپس میں اختلافات اور غفلت نے جاٹوں کی شان و شوکت اور قوت میں اضافہ کر دیا ۔ سورج مل جاٹ کا دھلی پر حملہ صفدر جنگ کی غداری اور ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ تھا ۔ اسکے بارے میں شاہ ولی اللہ فرماتے ھیں :

" دھلی میں ایک حادثہ عظیم واقع ھوا ۔ قوم جاٹ نے دھلی کے شہر کہنہ کو لوٹا اور حکومت اس فساد و شرارت کو دفع کرنے سے عاجز رھی ۔ انہوں نے مال لوٹے ۔ عزت و ناموس کو برباد کیا اور مکانات کو آگ لگائی ۔ اللہ تعالی نے ہمہ اھل و عیال و مکانات کے ان کے دست ستم سے محفوظ رکھا ۔ یہ لوٹ مار کا حادثہ اوائل رجب ۱۱۶۱ھ میں ھوا اور آخر شعبان تک باقی رھا ۔ "[1]

اب دھلی آئے دن لوٹ مار کرنے والوں کا ٹھکانہ بن گئی تھی ۔ ۱۷۵۷ء میں چوتھی بار احمد شاہ ابدالی نے ھندوستان پر حملہ کیا اور بہت جلد لاھور اور سرحد کے علاقوں پر قابض ھوگیا ۔ اس موقع پر عماد الملک نے جاٹوں اور مرھٹوں سے مدد طلب کی لیکن امداد نہ ملنے پر بہت مایوس اور پریشان ھوگیا ۔ ۱۲ جنوری ۱۷۵۷ء کو احمد شاہ ابدالی اس شرط پر واپس جانے کے لیے تیار ھوا کہ اسے دو کروڑ روپیہ نقد دیا جائے ۔ بادشاہ کی لڑکی سے اس کی شادی کی جائے اور سرحد تک سارا علاقہ افغانوں کے سپرد کیا جائے ۔ اس خبر کو سن کر ساکنین دھلی نہایت مضطرب اور بے چین رھے ۔ احمد شاہ ابدالی دھلی سے بالکل قریب تھا ۔ اس موقع پر نجیب الدولہ (روھیلہ سردار) احمد شاہ ابدالی سے ملا ھوا تھا ۔ اس لیے بھی بادشاہ اور اس کے وزیروں میں مقابلہ کرنے کی بالکل سکت نہ تھی ۔ عماد الملک نے خود غرضی ، بزدلی اور ڈرپوکی کا مظاھرہ کرتے ھوئے دلّی شہر کی حفاظت کا کوئی انتظام نہ کیا ۔ ۱۹ جنوری ۱۷۵۷ء کو نجیب الدولہ ، ابدالی سے مل کر مقابلے کے لیے سامنے آگیا ۔ ۲۰ جنوری کو ابدالی کے صرف پانچ دستے شہر میں امن و امان بحال

۱۔ خلیق احمد نظامی ، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات ۔ ص ، ۱۵۶ ۔

کرنے کے لئے داخل ہوئے اور بادشاہ کی موجودگی میں دہلی کی جامع مسجد میں احمد شاہ ابدالی کا خطبہ پڑھوایا گیا ۔

" ابدالی کا آنا ایسا ہی تھا اور جانا بھی ویسا ہی ، دہلی سے فرید آباد تک گھر کے گھر بے چراغ تھے ۔ اور جا بجا ننگی لاشوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے ۔ سورج مل جاٹ سے اسے خاص پرخاش تھی اس نے بلبھ گڑھ چھین لیا اور متھرا میں داخل ہو کر قتل عام کا حکم دے دیا ۔ ہزاروں بے گناہ تہ تیغ ہو گئے ۔ اور مال و متاع ننگ و ناموس سب ہی غارت ہو گیا ۔ مکانات ڈھا دیئے گئے ۔ ان میں آگ لگا دی گئی ۔ جو بچ گئے ان کو جبرا " ایک لاکھ روپیہ ادا کرنا پڑا "۔[1]

دلی صرف ابدالی اور اس کی افواج کے ہاتھوں ہی تباہ و برباد نہ ہوئی " بلکہ احمد شاہ ابدالی کے بعد نجیب الدولہ نے غارت گری کی اور وہ بھی بہت سا خزانہ اور خوبصورت کنیزیں اپنے ساتھ لے گیا ۔ ہزاروں عورتیں اپنی جان بچانے کے لئے جمنا میں کود پڑیں ۔ اور بعض نے گھر کے کنوئیں میں گر کر جان دے دی "۔[2]

۲ مارچ کو ابدالی نے عام لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا حکم دے دیا ۔ " ابدالی کے مال غنیمت کا اندازہ دو کروڑ سے بارہ کروڑ تک لگایا گیا ہے ۔ اس سامان کو لے جانے کے لئے اٹھائیس ہزار اونٹوں ، ہاتھیوں ، خچروں اور گاڑیوں کی ضرورت پیش آئی ۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی گھوڑا اور گدھا ایسا نہیں جو افغانوں کو ملا ہو اور وہ اسے اپنے ساتھ نہ لے گئے ہوں "۔[3]

۱- میر تقی میر ، حیات و شاعری - ص ۱۵۹ ، ۱۶۰ ۔

2. J.N. Sarkar, Fall of the Mughal Empire, Vol. II, P. 102.

۳- میر تقی میر ، حیات و شاعری - ص ۱۶۱ ۔

۱۷۵۴ء میں غازی الدین نے مرہٹہ سرداروں کے تعاون سے احمد شاہ کو تخت و تاج سے معزول کردیا اور اس کی جگہ معز الدین جہاندار شاہ کے پچپن سالہ بیٹے عزیز الدین کو عالمگیر ثانی کے لقب سے تخت نشین کیا ۔ اس وقت تک پنجاب کے گورنر معین الملک کا انتقال ہو چکا تھا ۔ احمد شاہ ابدالی نے پنجاب کا نظم و نسق اس کے شیر خوار بچے کے سپرد کردیا ۔ نتیجتاً پنجاب افراتفری اور انتشار کا شکار ہوگیا ۔ غازی الدین پنجاب پر قبضے کے لیے عالمگیر ثانی کو ساتھ لے کر روانہ ہوگیا ۔ احمد شاہ ابدالی نے اس حملے کی اطلاع پاتے ہی فوراً لاہور کا رخ کیا ۔ افغان فوجوں نے دلّی کی طرف بڑھنا شروع کردیا ۔ دلّی کے قریب ہی غازی الدین ، احمد شاہ ابدالی سے مل کر معافی کا طلب گار ہوا ۔ احمد شاہ ابدالی نے عالمگیر ثانی سے ملاقات کے بعد ۲۸ جون ۱۷۵۷ء میں دہلی اور اس کے گرد و نواح میں قتل عام کا حکم دے دیا ۔ اس کی فوجوں نے تین[۳] دن کے محاصرہ کے بعد دلی کے قریب جاٹوں کے قلعہ ولبھی گڑھ کو بھی تسخیر کرلیا ۔

بادشاہ نے احمد شاہ ابدالی کو عماد الملک غازی الدین کی خامیوں اور برائیوں سے آگاہ کیا تو وہ نجیب الدولہ کو بادشاہ کا منتظم مقرر کرنے کے بعد واپس چلا گیا ۔ احمد شاہ ابدالی کے واپس جاتے ہی عماد الملک نے مرہٹوں کے سردار ہلکر راؤ کے ساتھ مل کر دہلی پر حملہ کردیا ۔ احمد شاہ ابدالی بھی اس سے بے خبر نہیں تھا ۔ وہ دہلی سے چھ میل شمال مشرق میں واقع مقام " لونی " میں پہنچ گیا ۔ یہاں اس کے دوسرے ساتھی حافظ رحمت خان ، دوندے خان ، نجیب الدولہ اور سعد اللہ خان بھی آکر مل گئے ۔ افغانوں نے مرہٹوں کا پیچھا کرکے ہزاروں سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ۔ عماد الملک اپنے حلیف مرہٹوں کی شکست کی خبر سنتے ہی بھرت پور چلا گیا بقول میر :

> " اب دہلی میں نہ کوئی بادشاہ تھا اور نہ کوئی وزیر
> اسکی حالت بیواؤں سے بھی زیادہ دکھیاری تھی ۔ اس لیے
> درانیوں نے اسے خوب دل کھول کر لوٹا " ۔[۱]

۱۔ میر تقی میر ، ذکر میر ۔ ص ۸۸ ، ۔

اسی دوران میں عماد الملک غازی الدین نے عالمگیر ثانی کے بدلتے ہوئے تیور دیکھے تو اسے ایک خدا رسیدہ بزرگ سے ملانے کے بہانے فیروز شاہ کوٹلہ بلوا بھیجا ۔ جہاں اس کو قتل کرنے کے بعد اسکی برہنہ لاش کو جمنا کے کنارے ریتی پر پھینک دیا اور پھر بعد میں لاش کو لے جا کر ہمایوں کے مقبرے میں دفن کر دیا گیا ۔

اس کے بعد عماد الملک نے جہانگیر کے ایک پڑپوتے کو شاہ جہان ثالث کے لقب سے تخت نشین کیا ۔ اگست ۱۷۵۹ء میں احمد شاہ ابدالی مرہٹہ سرداروں کو دھکیلتا ہوا " قتل و غارت اور خونریزی کرتا ہوا ، دھلی کی طرف بڑھا اور وہاں خوب لوٹ مار مچائی دھلی کی تباہی کا نقشہ میر تقی میر نے یوں کھینچا ہے :

" راجہ ناگر مل شام کو شہر سے چل کھڑے ہوئے اور سورج مل کے قلعوں میں حفاظت کے ساتھ پہنچ گئے ۔ حفظ ناموس کے لیے میں شہر ہی میں رہا ۔ شام کے بعد منادی ہوئی کہ احمد شاہ ابدالی نے سب کو امان دے دی ہے ۔ رعایا میں سے کوئی پریشان نہ ہو ۔ لیکن تھوڑی سی رات گزری تھی کہ درانیوں نے ظلم شروع کر دیا ۔ شہر کو آگ لگا دی ۔ گھر جلا دیے ۔ اگلی صبح ، صبح قیامت تھی ۔ افغان اور روہیلے قتل و غارت میں مصروف ہو گئے ۔ انہوں نے مکان کے دروازے توڑ ڈالے ۔ لوگوں کی مشکیں کس لیں ۔ اکثر کو جلا دیا یا ان کے سر کاٹ لیے ۔ ایک عالم خاک اور خون میں مل گیا ۔ تین رات اور دن تک یہ ظلم جاری رہا ۔ درانیوں نے کھانے اور پہننے کی کوئی چیز نہ چھوڑی ۔ انہوں نے چھتیں اور دیواریں توڑ ڈالیں اور لوگوں کے سینے زخمی کر دیے ۔ اعیان سلطنت فقیر ہو گئے ۔ وزیر و شریف عریان کتخدایان بے خانماں ان میں سے اکثر مصیبت میں گرفتار اور کوچہ و بازار میں رسوا تھے ۔ لوگوں کے بیوی بچے قید تھے اور قتل و غارت کا سلسلہ تھا کہ بلا روک ٹوک جاری تھا ۔ افغان فلجل کرتے اور گالیاں دیتے تھے اور طرح طرح کے ظلم کرتے تھے ۔ جو چیز لوٹنے کی ملی لوٹ لی ۔ بعضوں نے تو ستر پوش تک نہ چھوڑے ۔ دلی دھلی یعنی شاہجہان آباد خاک کے برابر ہو گئی ۔ اس کے بعد یہ بے رحم پرانی دھلی کی طرف متوجہ

ہوئے اور افغانوں نے بے شمار لوگوں کو ہلاک کر ڈالا۔ سات آٹھ دن تک یہی ہنگامہ گرم رہا۔ کسی کے گھر پہننے کے کپڑے اور ایک دن کے کھانے کا سامان نہ رہا۔ مردوں کے سر پر ٹوپی اور عورتوں کے سر پر دوپٹہ تک نہیں تھا۔ ظالم، لوگوں سے غلہ چھین لیتے اور غریبوں کے ہاتھ قیمتاً بیچتے۔ مصیبت زدوں کی فریاد آسمان تک پہنچتی لیکن ابدالی کے کان پر جوں نہ رینگتی۔ بہت سے لوگ دہلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے اور وہاں مر گئے"۔[۱]

غازی الدین نے احمد شاہ ابدالی کے حملے سے خوف کھاتے ہوئے سورج مل جاٹ کے قلعہ میں پناہ لی۔ جنوری ۱۷۶۰ء میں ابدالی دہلی پہنچ گیا۔ مرہٹوں نے احمد شاہ ابدالی اور اس کی افواج کو ہراساں کرنے کی ناکام کوشش کی۔ ۱۰ اکتوبر ۱۷۶۰ء کو احمد شاہ ابدالی نے شاہجہان سوم کو معزول کر کے اسکی جگہ عالی گوہر کے لڑکے جوان بخت کو تخت نشین کیا۔

احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر یکے بعد دیگرے سات حملے کیے۔ اس کا آخری حملہ ۱۷۶۰ء میں ہوا۔ اب ہندوستان میں مرہٹوں کا غلبہ دن بدن ہوتا جا رہا تھا۔ ان کے اس عروج کے پیش نظر نجیب الدولہ، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور چند باقتدار امراء نے احمد شاہ ابدالی سے اس بلائے عظیم کو روکنے کے لیے مدد کی درخواست کی۔

احمد شاہ ابدالی نے یکم نومبر ۱۷۶۰ء کو پانی پت کے میدان میں ڈیرے ڈال دیے۔ یہاں ڈھائی ماہ تک مرہٹوں اور احمد شاہ ابدالی اور اس کے ہندوستانی حلیفوں روہیلہ سردار نجیب الدولہ اور اودھ کے نواب وزیر شجاع الدولہ کے درمیان تاریخ کی ایک خونریز اور فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ جس میں آخر کار ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو مرہٹوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ بیشتر مرہٹہ سرداروں نے اپنے روایتی انداز جنگ سے ہٹ کر کھلے میدان میں جنگ کرنے کی مخالفت کی۔ اس طرح آپس میں پھوٹ پڑنے کی وجہ سے ان کی طاقت و قوت کو زبردست نقصان پہنچا۔ بقول ہاشمی فرید آبادی:

۱- میر تقی میر۔ ذکر میر۔ ص، ۸۵، ۸۶

"پائیے تخت شاہ جہان آباد پر خزان چھائی ہوئی تھی - شہر پناہ کے باہر، بہیسون محلے، مضافات کی بستیاں کو دبجن گوڑھ، مہردلی، فرید آباد تک بسی ہوئی تھیں - قریب قریب ویران، چراغ و شغال کے مسکن بن گئیں - یا گوجر، جاٹ، میو، جوان پر ڈاکے ڈالتے تھے، وہاں آ رہے - نادر گردی، ابدالیوں کی تاراجی، جاٹوں، مرہٹوں کی بار بار غارت گری میں ہزاروں شہری دوسری دنیا میں اور ان سے کہیں زیادہ پردیسوں میں جا کر بسے - ایک گروہ کثیر بھاگ کر میوات کے باہر موضع کامان میں سرکیاں ڈالے پڑا رہا - جب نجف خاں نے روہیلوں کو ہٹا کر بادشاہ کی طرف سے اپنا عمل دخل قائم کیا - تب یہ خانہ خراب دوبارہ اپنے گھروں میں آئے" -[۱]

میر تقی میر پانی پت کی جنگ کے وقت راجہ راجہ ناگر مل کے ساتھ کمھیر میں تھے - لڑائی ختم ہونے کے بعد راجہ صاحب میر صاحب کے ساتھ ہی دوسرے روٴسا کی طرح ملازمت حاصل کرنے کے لیے دہلی چلے آئے - میر نے وہاں دہلی کی ویرانی اور تباہی کی جو حالت دیکھی اس کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں -

"ایک روز شہر کو نکلا چلتے چلتے شہر کے ایک تازہ ویرانے میں پہنچا - ہر قدم پر آبدیدہ ہوتا اور عبرت پکڑتا جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا میری حیرت بڑھتی گئی - مکان پہچانے نہیں جاتے تھے - مکینوں کا کہیں پتہ نہیں تھا - مکان ٹوٹے ہوئے دیواریں بیٹھی ہوئیں - خانقاہیں بے صوفی کے اور خرابات بے مست کے ویران پڑے تھے" -[۲]

احمد شاہ ابدالی ۱۷۶۷ء تک دہلی میں رہا - افغانستان کی طرف واپسی سے قبل عالمگیر ثانی کے لڑکے عالی گوہر کو شاہ عالم ثانی کا لقب دے کر تخت نشین کرنے کا اعلان کر دیا تھا - شاہ عالم اس وقت مشرقی صوبہ جات میں انگریزوں کے ساتھ قسمت آزمائی کرنے میں مصروف تھا - ابدالی نے عماد الملک کو وزارت اور نجیب الدولہ کو میر بخشی کا عہدہ دیا - شاہ عالم کے آلہ آباد میں قیام کے

۱- ہاشمی فرید آبادی، تاریخ مسلمانان پاک و ہند - جلد دوم - ص، ۵۵۰ -

۲- میر تقی میر، حیات و شاعری - ص، ۱۸۲۰ -

دوران میں اس کی یہ شدید خواہش تھی کہ وہ کسی طرح دہلی پہنچ کر اپنے آباؤ اجداد کے تخت پر بیٹھے۔ شاہ عالم بکسر کی لڑائی (۲۲ اکتوبر ۱۷۶۴ء) میں انگریزوں کے ساتھ آگیا تھا، جس پر ۱۷۶۴ء میں بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی انگریزوں کے نام لکھ کر ان کی پنشن قبول کرلی۔ وظیفے میں بے قاعدگی کی وجہ سے شاہ عالم انگریزوں سے بدگمان ہو گیا تھا۔ ۱۷۷۱ء میں مرہٹوں سے ساز باز کے بعد شاہ عالم دہلی میں واپس لوٹے۔ اس وقت مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کے فتنے زوروں پر تھے۔ ۱۷۷۲ء میں جب نجف خان نے عہدہ وزارت سنبھالا تو اس کے تدبر اور سیاست کے باعث مغلیہ سلطنت نے ایک بار پھر پلٹا کھایا۔ نجف خان نے جاٹوں اور سکھوں کی سرکوبی کرنے اور شمالی ہند میں مرہٹوں کو پے در پے شکستیں دینے کے بعد ان کے اثر کو بالکل ختم کر دیا۔ ۱۷۸۲ء میں نجف خان کی اچانک موت کے بعد پھر مغلیہ حکومت زوال پذیر ہونے لگی۔

۱۷۸۲ء کے بعد غلام قادر روہیلے نے اپنے دوست اسمٰعیل بیگ ناظر کی وساطت سے دہلی دربار میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ جب ان دونوں نے مرہٹوں کے خلاف صف آرا ہونے کے لیے بادشاہ سے مزید رقم کا مطالبہ کیا تو بادشاہ کے حیل و حجت کرنے پر غلام قادر نے بادشاہ شاہ عالم کو اندھا کر دیا۔ اور تخت سے معزول کر کے ایک اور مغلیہ شہزادہ داور بخش کو سریر آرائے سلطنت کیا۔ لیکن غلام قادر کو مرہٹوں نے گرفتار کر کے زبردست سزا دی۔ اور داور بخش کو تخت سے اتار کر شاہ عالم کو دوبارہ تخت نشین کیا۔ ۱۸۰۳ء تک اندھا بادشاہ مرہٹوں کے رحم و کرم پر تھا۔ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے دہلی پر حملہ کر کے مرہٹوں سے شاہ عالم کو چھٹکارا دلایا۔ یہاں تک کہ اکبر ثانی اور سراج الدین بہادر شاہ ظفر انگریزوں کے پنشنر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

معاشی ومعاشرتی حالات

اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے سے لے کر شاہ عالم ثانی کے دور حکومت تک مغلیہ سلطنت کی عظیم الشان عمارت کی بنیادوں کو ہلانے اور پھر مسمار کرنے کی ذمہ داری ایرانی و تورانی کشمکش، مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں اور روہیلوں کی شورشوں کو انگریزوں پر عائد ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں سیاسی زوال کے ساتھ ساتھ معاشی ومعاشرتی انحطاط بھی رونپذیر ہوا۔ انگریزوں کے علاوہ باقی سب شورش پسند طاقتیں خود مغلوں کی ناقص سیاسی اور اقتصادی پالیسی کی پیدا کی ہوئی تھیں کیونکہ اورنگ زیب کے بعد تمام مغل بادشاہ نااہل اور شاہی امور سے بالکل بے بہرہ تھے۔ علاوہ ازیں بادشاہوں کی بداعمالیوں، عیاشیوں اور خود غرض، ناعاقبت اندیش امراء و وزراء کی آپس میں ناچاقیوں و نااتفاقیوں اور باہمی چشمک اور رشک وحسد کا لازمی نتیجہ ملک میں انتشار وبے چینی اور معاشی بدحالی تھا جیسا کہ ڈاکٹر Kalikinker نے کہا ہے:

> "حکمرانوں اور امیروں میں کردار، قابلیت اور دوربینی کی کمی، دربار میں ہونے والی بدتر سازشیں اور گٹھ جوڑ، نادر شاہ کا حملہ اور احمد شاہ ابدالی کی لگاتار یورشیں اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں فتح وکامیابی کے جھنڈے گاڑتے ہوئے مرہٹوں نے ہندوستان کی اقتصادی حالت کو متاثر کرنا شروع کر دیا"۔[1]

غرض کہ اورنگ زیب جیسے محنتی، جفاکش، مدبّر اور دین دار حکمران کے کاہل بیٹوں اور عیاش پوتوں کی بدولت اس کی وفات کے چند سال بعد ہی ملکی حالات بہت بدل گئے۔ بادشاہ وامراء و وزراء میں اخلاقی پستی، تن آسانی، عیاشی اور لہو ولعب کی وجہ سے مجموعی طور پر معاشرہ پستی کی طرف مائل تھا۔

---

1. K.K. Datta, Survey of India's social life. p. 113.

اورنگ زیب کے بعد محمد معظم ، بہادر شاہ کے لقب سے سریر آرائے سلطنت ہوا ، ذاتی کردار کے اعتبار سے بلند لیکن امور سلطنت اور انتظامی معاملات میں بالکل ناا‌ہل تھا ۔ لیکن اس کے بعد اس کا لڑکا معز الدین جہاندار شاہ تخت نشین ہوا ۔ تو اسکی تفریح اور عیاشی کا یہ عالم تھا کہ مہینے میں تین دفعہ سارے شہر میں چراغاں ہوتا ، جس کے باعث روغن ایک روپیے کا آدھ سیر بکنے لگا ۔ کچھ دن بعد جب روغن نایاب ہوگیا ، تو اس کی بجائے گھی کے چراغ جلائے جانے لگے ، یہاں تک کہ گھی کا ملنا بھی ناممکن ہوگیا ۔[1]

اس دوران میں معز الدین جہاندار شاہ کے دلّی میں ایک ہندو طوائف لال کنور کے ساتھ تعلقات اس معاشرے میں اخلاقی زوال کی بہترین مثال ہیں ۔ جہاندار شاہ اس عورت پر اس قدر فریفتہ تھا کہ اس کے قدموں پر پورا مغل خزانہ نثار کر دیا گیا ۔ لال کنور اور اسکے دوستوں پر تحفے تحائف نچھاور کیے گئے ۔ لال کنور کو لباس اور زیورات کے علاوہ دو کروڑ روپے سالانہ دیے جاتے تھے ۔[2]

ان عیاشیوں کی وجہ سے عہد جہاندار شاہ میں دلّی میں اس قدر قحط پڑا کہ اناج بھی گراں ہونے لگا یہاں تک کہ گندم ایک روپے میں سات آٹھ سیر سے زیادہ نہیں ملتی تھی ۔ اس پر طرہ یہ کہ طوائفوں کی ملکی معاملات میں اتنی دخل اندازی تھی کہ " ایک دن لال کنور محل کے سمن برج میں کھڑی شیشے کی کھڑکی میں سے باہر دیکھ رہی تھی ۔ اس نے جمنا کے دوسرے کنارے پر بہت سے لوگوں کو سروں پر گندم کے ڈھیر اٹھائے دیکھا اور ان میں سے ایک آدمی کو بلا کر پوچھا کہ تم نے ایک ڈھیر کتنے میں فروخت کیا ہے ۔ اس نے کہا " پانچ چھ روپے میں " لال کنور اس پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگی ۔ خدا کی پناہ ! ابھی تک چیزیں اتنی سستی ہیں میں گندم کی قیمت پانچ چھ روپے میں پانچ چھ سیر کروں گی ۔[3]

---

1. William Irvine, Later Mughal. Vol. I, p. 192.

2. Ibid. p. 194.

3. Ibid. p. 192.

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لال کنور کو حکومت کے معاملات میں کس حد تک عمل دخل تھا۔ جب جہاندار شاہ اس کے عشق میں اندھا ہوکر امور سلطنت سے غافل ہوگیا تو موقع پرست امراء و وزراء نے دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹنی شروع کر دی۔ ان حالات کے تحت عوام جس طرح معاشی بدحالی کا شکار ہوئے اس کے بارے میں شان الحق صاحب لکھتے ہیں کہ:

"ہم عصر مورخین کے بیان کے مطابق فوج کو تنخواہ ناکافی ملتی تھی۔ زمیندار شورش پسند تھے اور عمال و افسران میں بگاڑ اور عدول حکمی کا بیج بویا گیا تھا۔ فوج کے مطالبات پورے کرنے کے لیے شاہی خزانہ میں جمع شدہ رقوم نکالنی پڑیں۔ کپڑے، قالین اور پردے تک نہ بچے۔ ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ ایک ہفتہ میں ساڑھے تین کروڑ کے جواہرات فوج میں تقسیم کر دیے گئے۔ سپاہی منشیوں کی پرواہ کیے بغیر جو کچھ ہاتھ لگا لے بھاگے اور ساز و سامان سے بھرے پڑے گودام جن میں مال و اسباب بابر کے زمانہ سے اکٹھا ہو رہا تھا خالی ہوگئے۔ اس کے باوجود جب ان کے مطالبات پورے نہ ہوئے تو ان کو یہ کہہ کر تسلی دے دی گئی کہ آگرہ پہنچنے تک صبر و ضبط سے کام لیں، وہاں کے خزانہ سے یہ سب رقوم ادا کر دی جائیں گی"۔[1]

معزالدین جہاندار شاہ کے بعد فرخ سیر کے عہد حکومت میں بھی فوجوں نے اپنی تنخواہوں کے مطالبات کرتے ہوئے بغاوت کر دی۔ جس پر فرخ سیر نے فوج کو واجبات کے کچھ حصے کی ادائیگی کرکے اس معاملہ کو ختم کر دیا۔ اس کا یہ دور حکومت سید برادران کے ساتھ کشیدگی، تعلقات اور درباری سازشوں کے لیے مشہور ہے۔ یہی حالات معاشرہ کی بدحالی کا باعث بنے۔

فرخ سیر کے بعد محمد شاہ سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس کے دور میں حکومت کی مرکزیت تو ایک حد تک قائم رہی لیکن مختلف اقتدار پرست امراء و روساء نے الگ صوبوں کی داغ بیل ڈال دی۔ مرہٹوں نے بھی اس دور میں بہت پر پرزے نکالے ایرانی اور تورانی پارٹیوں کی آویزش محمد شاہی دور میں بڑھی۔ نادر شاہی حملے نے تو مغلیہ سلطنت کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ محمد شاہ کو نظام الملک

1۔ شان الحق۔ میرزا مظہر جانجاناں کا دور ابتدائی۔ ص، ۲۲۔

جیسا مدبّر اور سنجیدہ دار وزیر مل گیا ۔ اس نے کثیر آمدنی والی سرکاری املاک جاگیروں کے طور پر شہزادوں اور امیروں میں تقسیم کرنے اور بادشاہ کو رشوت دے کر سرکاری عہدے اور ملازمتیں حاصل کرنے کی عمومی لعنت کو ختم کرنے کی تجاویز بادشاہ کے سامنے پیش کیں کیونکہ اس سے سرکاری خزانے پر بہت برا اثر پڑتا تھا ۔ نتیجتاً سپاہیوں کی باقاعدہ تنخواہوں کا سلسلہ رک جاتا تھا۔

نادر شاہ نے دہلی کی رہی سہی شاہی عظمت و شوکت کو مطلوبہ بنا کر رکھ دیا ۔ اور وہاں قتل و غارت گری اور خونریزی کا بازار گرم رکھا ۔ نتیجے کے طور پر قلعہ کا خزانہ بیرونی حملہ آوروں کے ہاتھوں بالکل ختم ہو گیا ۔ نادر شاہ کی لوٹ مار صرف شاہی خزانے تک محدود نہ رہی بلکہ امراء و روٴسا کی حویلیوں کو بھی ختم کر دیا ۔ اسکی لوٹ مار اور غارت گری تاریخ میں ایک بہت بڑی یادگار رہے گی ۔

قتل عام کے بعد نادر شاہ نے اپنے بیٹے مرزا نصر اللّٰہ کی شادی ایک تیموری شہزادی (عالمگیر کی پوتی) کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے کی ۔ چار روز تک جشن منائے گئے ۔ اور دریا کے کنارے روشنی اور آتش بازی ہوتی رہی " مئی ۱۷۳۹ء کو نادر شاہ کے دہلی سے کوچ کرنے تک بادشاہ ، امراء اور عام رعایا کے نقصان کا اندازہ کم و بیش ایک ارب روپیہ تھا ۔ اس میں ستر کروڑ زر نقد اور جواہرات اور مال و اسباب کی صورت میں نادر لے گیا ۔ تقریباً دس کروڑ مالیت کا سامان اس کے سرداروں اور سپاہیوں کے ہاتھ لگا ۔ دوران قیام میں اس کی فوج کے اخراجات ، بقایا تنخواہوں کی ادائیگی ، واجب تنخواہیں ، پیشگی تنخواہیں ، انعامات اور جو سامان اور عمارات نذر آتش ہوئیں اور فصلیں غارت ہوئیں ان سب کا تخمینہ بیس کروڑ سے زائد ہے " ۔[1]

امراء و بادشاہ اگر خود اخلاقی پستی کی انتہا تک پہنچ جائیں تو عوام کا اپنے بادشاہ کی پیروی کرنا لازمی بات ہے اور اسی طرح معاشرہ زوال پذیر ہو کر رہ جاتا ہے ۔ محمد شاہ کے دور کا ایک مورخ لکھتا ہے کہ :

" حضرت سبحانی بادشاہی کاروبار سے بے خبر دار الخلافہ کے قلعہ کو

۱۔ حسن عابد جعفری ، نادر شاہ ۔ ص ، ۱۲۳

ایک عظیم پناہ گاہ سمجھتے تھے۔ سمن برج اور انگوری باغ کی سیر
کو غنیمت جانتے تھے۔ ہمیشہ شراب خوری ، بچہ بازی اور زنان کاری
میں مشغول رہتے اور تنگ لباس پہنا کر اپنے ساتھ رکھتے۔ شہر کے
تمام لوگوں نے خدا کو فراموش کر دیا اور عوام و خاص دونوں نے
عورتوں کا لباس اختیار کر لیا۔ نماز اور روزہ کی بجائے حرام کاری ،
شراب خوری اور افلاس میں مطلق العنان ہوگئے "۔ 1

ظاہر ہے ، اس انتہا پرست بادشاہ کی عیاشیاں نقطہ عروج پر تھیں تو اس کا اثر نہ صرف معاشرے پر پڑتا تھا بلکہ خزانہ بھی اس سے متاثر ہوتا تھا ۔ محمد شاہ نے ایک بازاری رقاصہ ادھم بائی کو ملکہ بنا لیا تھا ، جس نے دربار میں بہت جلد اتنا اقتدار حاصل کر لیا تھا کہ ہر فرمان پر اسکی مہر لگنے لگی تھی ۔ مرہٹے اور راجپوت جو کبھی مغلوں کی دولت کے بل پر ان کی قوت و طاقت کا ایک حصہ ہوتے تھے ، اب شاہی خزانے میں روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے مغلوں کے دشمن بن گئے ۔ محمد شاہ کے اور احمد شاہ کے عہد میں تو خزانہ بالکل خالی ہوگیا ۔ خود بادشاہ مفلسی کا شکار تھا ۔ بقول جادو ناتھ سرکار :

" جس زمانے میں سپاہی اپنی تنخواہوں کے لئے روز بغاوت اور بلوے کرتے تھے اور حکومت قلعہ کے سونے چاندی کے برتن فروخت کرنے کے بعد بھی اس قابل نہیں تھی کہ دو لاکھ روپے ادا کر دیتی ، ادھم بائی نے جنوری ۱۷۵۲ء میں اپنی سالگرہ کا جشن منایا ۔ اس پر دو کروڑ روپیہ خرچ ہوا "۔ ۲

یہ بزم و بسترم صرف یہیں پر ختم نہیں ہوجاتی بلکہ اس دور میں امیرزادوں نے عیش و عشرت کو ایک فن کی حیثیت سے اختیار کر لیا تھا ۔ ان کے دن رات شراب ، عورتوں اور امردوں میں گذرتے تھے ۔ ایسی حالات میں دہلی میں نواب درگاہ قلی خان نے خاص طور پر نادر شاہ کے

۱۔ ڈاکٹر خلیق انجم ، مرزا محمد رفیع سودا ۔ ص ، ۲۲

2. J.N. Sarkar, Fall of the Mughal Empire. Vol. I, p. 336.

حملے اور اس کے دو تین سال بعد کے دور کی اخلاقی بدحالی ، مذہبی بے راہ روی اور امراء و عوام کی عیش کوشی کی صحیح تصویر پیش کی ہے ۔ اس نے چشم دید حالات و واقعات کو بے کم و کاست حوالہ تحریر کیا ہے ۔ نواب صاحب نے اس دور کے مطربوں ، سازندوں ، طوائفوں ، رقاصاؤں اور امردوں کا بھی ذکر کیا ہے جو اپنے اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے ۔ نواب صاحب فدوی خان کے لڑکے اعظم خان کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :

" اعظم خان ------ عظیم الشان امراء میں سے ہے ۔ رنگینئ مزاج مہارت راگ کی وجہ سے ہندوستان کے مطربوں کا ممدوح ہے ۔ اس کی طبیعت امارد پسند ہے اور مزاج میں سادہ رویوں کی محبت ہے ۔ اسکی جاگیر کی آمدنی اسی فرقے پر خرچ ہوتی ہے اور وہ جو کچھ کماتا ہے ۔ اس طبقے کے قدموں پر نچھاور کر دیتا ہے ۔ جب کہیں سے بھی کسی رنگین امرد کی خبر پاتا ہے ۔ تو دلی خواہش کی وجہ سے اس پر رفاقت کی کمند پھینکتا ہے ------ جہاں کہیں بھی کوئی سبزہ رنگ نظر آئے وہ اعظم خان سے منسوب ہوتا ہے اور جہاں کہیں کوئی نوخط جلوہ دکھائے وہ بھی اسی عظیم الشان سے وابستہ ہوتا ہے ۔ "[1]

نواب صاحب اعظم خان کی طرح کے ایک اور امیرزادے میر منو کے فن امرد پرستی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :

" اس فن سحرکاری (امرد پرستی) میں یگانہ تھے ۔ اکثر امیرزادے اس علم کے احکام ضروری اس سے سیکھتے ہیں اور اس کے شاگرد ہونے پر فخر کرتے ہیں ------ اس کا گھر جیسے پری زادوں کا گھر ہے ۔ ہر وہ نوخط رنگین جو اس محفل سے تعلق نہیں رکھتا ، فرد باطل ہے اور ہر وہ ملیح جو اس مجمع سے مربوط نہیں حلیۂ اعتبار سے ساقط ہے ۔ اسکی مجلس حسینوں کی آزمائش گاہ ہے اور یہ بزم گل رخوں کے لیے امتحان ہے ۔ "[2]

۱۔ نواب درگاہ قلی خان ، مرقع دہلی ۔ ص ، ۲۷

۲۔ ایضاً ۔ ص ، ۲۷-۲۸

محمد شاہ کے ابتدائی عہد میں شاہی خزانے اور امراء و روٴسا کے خزانوں میں دولت کی بہتات تھی اور جب اصل دولت میں بے تحاشا اس قدر فراوانی ہو تو معاشرے میں برائیوں کا پیدا ہونا ایک فطری امر ہے ۔ خاص طور پر جہاں عوام پہلے ہی معاشی اور اقتصادی ناہمواری کا شکار ہوں ۔ چاندنی چوک کا ایک واقعہ اس عہد کی خوشحالی اور دولت مندی کی بہترین اور لازوال مثال ہے :

" ایک نوجوان امیرزادے کا دل چاہتا کہ وہ چاندنی چوک کی سیر کرے ۔ اس کی ماں نے نہایت حسرت بھرے لہجہ میں یہ کہہ کر اس کو ایک لاکھ روپیہ دیا کہ بیٹے اپنے باپ کا یہ ترکہ لو ۔ میں جانتی ہوں کہ اس معمولی رقم سے اس چوک کے نفائس و نوادر خریدنا ممکن نہیں لیکن چونکہ تمہاری طبیعت چاہ رہی ہے لہٰذا اس حقیر رقم کو اپنی پسند کی چیزوں پر خرچ کرو " [1]

امرد پرستی ، دولت کی بہتات ، معزالدین جہاندار جیسے بادشاہ کا طوائف لال کنور کو " امتیاز محل " کا خطاب دے کر محل میں کلی اختیارات دے دینا اور پھر محمد شاہ کا طوائف ادھم بائی کو ملکہ بنا کر حکومت کے تمام انتظامات سونپ دینا ، خزانے کی دولت کو ان پر بے دریغ خرچ کرنا ، معاشرے کے ایسے ناسوروں کے لیے اگر بزم و بزم آراستہ کرنے کے لیے بادشاہ اور امراء کا طبقہ ہی انتہائی حدود پار کر جائے تو " الناس علی دین ملوکھم " کے پرانے اصول کے تحت عوام کا بھی ان کی راہ پر چلنا فطری امر تھا ۔ لہٰذا لوگوں نے بھی اپنے محلّے بنا لیے تھے ، جہاں ہر وقت نائو نوش کا ہنگامہ اور xxxxx صدائے چنگ و رباب بلند رہتی تھی ۔ اس ضمن میں صاحب مرقع دہلیؔ ایک واقعہ تحریر کرتے ہیں :

" کسل سنگھ بادشاہ ہزاریوں میں ہے ۔ ثروت و دولت کے اعتبار سے اپنے

۱۔ نواب درگاہ قلی خان ، مرقع دہلی ، ص ۱۹۰

عہد کے لوگوں میں بڑا متفاخر اور مباھی ھے ۔ اس نے کسل پورہ بڑے تزک واھتمام سے بنایا ھے ۔ ھر طرح کی طوائفیں اور بازاری عورتیں یعنی مال زادیوں کو اکٹھا کیا ھے ۔ ارباب مناھی و مسکرات کو اپنی سرپرستی میں جگہ دی ھے ۔ کثرت جمعوت کے باوجود محتسب اس کے پاس نہیں پھٹک سکتا ۔ کسل پورہ کے ھر راستے میں عورتیں رنگا رنگ لباس پہنے خود کو مردوں کے سامنے پیش کرتی ھیں اور ھر کوچے میں دلالوں کی وساطت کے بغیر لوگوں کو بلاتی ھیں وھاں کی ھوا شہوت آمیز اور فضا ہاہ انگیز ھے ۔ خاص طور پر شام کو عجیب طرح کا مجمع ھوتا ھے ۔ ھر گھر میں رقص اور ھر جگہ سرود " [1]

ان ناگفتہ بہ حالات اور معاشی بدحالی کو جانتے ھوئے صفدر جنگ جیسے امراء دونوں ھاتھوں سے خزانہ لوٹ رھے تھے ۔ صفدر جنگ جیسا وزیر جاگیروں اور خالصہ زمینوں کی ساری آمدنی اپنے اوپر ھی خرچ کر رھا تھا ۔ سرکاری عہدہ داروں ، قلعہ کے چوبداروں اور توپ خانہ کے سپاھیوں کو مہینوں سے تنخواھیں نہیں ملی تھیں ۔ روز چوری اور ڈاکہ کی خبریں آتی تھیں ۔ فوجیوں کے بلوے معمول بن چکے تھے ۔ وہ سڑکوں پر شور مچاتے ، افسروں کا راستہ روک کر کھڑے ھو جاتے اور محل کے دروازوں کو بند کر دیتے ۔ اس طرح کئی کئی دن تک اھل قلعہ کا پانی اور کھانا بند رھتا اور صفدر جنگ جیسے وزیر کے اخراجات بڑھتے جا رھے تھے ۔ اس نے اپنے بیٹے شجاع الدولہ کی شادی پر پینتالیس لاکھ روپیہ خرچ کیا ، جب کہ ایک سال قبل خود شہنشاہ عالی مرتبت نے اپنے چہیتے بیٹے کی شادی پر صرف تیس لاکھ روپیہ صرف کیے تھے ۔ اس کے برعکس شاہی ملازموں کو دو سال سے تنخواھیں نہیں ملی تھیں ۔ جب ان کا مطالبہ بہت بڑھا تو خزانہ صرف چار ماہ کی تنخواہ ادا کر سکا ۔ [30]

۱۔ نواب درگاہ قلی خان ، مرقع دھلی ، ص،۲۸ ۔

اس عہد میں ہندوستان کی معاشی بدحالی کا صحیح اندازہ شاہ ولی اللہ کے مندرجہ ذیل الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں :

"ہندوستان کے محصولات سات آٹھ کروڑ روپے سے کم نہیں ہیں بشرطیکہ غلبہ وشرکت موجود ہو ورنہ ایک کوڑی بھی ملنی مشکل ہے۔ جیسا کہ اس وقت دیکھا جا رہا ہے کہ جس علاقہ پر جاٹ قابض ہیں، وہ ایک کروڑ روپیہ محصول کی جگہ ہے۔ راجپوتانہ کا علاقہ اپنی وسعت کے باعث دو کروڑ روپیہ کی کم آمدنی کا نہیں ہے ---۔"[1]

گویا اقتصادی بدحالی کی ایک وجہ یہ تھی کہ خالصہ کی زمینیں جو بادشاہ کی آمدنی کا واحد ذریعہ تھیں، بادشاہ کے ہاتھ سے نکل گئیں۔ اس طرح بادشاہ کے پاس خالصہ زمین کا ایک قطعہ بھی باقی نہ رہا۔ نتیجہ کے طور پر بادشاہ کے ذاتی ملازمین فاقوں سے مر رہے تھے۔ اکثر کام کرنے سے انکار کر دیتے اور طرح طرح سے بادشاہ اور وزیر کو ذلیل کرتے تھے۔ شاہ ولی اللہ شاہی ملازمین اور بادشاہ کی مفلسی کے متعلق لکھتے ہیں :

"جب خزانہ بادشاہ نہیں رہا، نقدی بھی موقوف ہوگئی۔ آخرکار سب ملازمین تتر بتر ہوگئے اور کاسۂ گدائی ہاتھ میں لے لیا۔ سلطنت کا بجز قلم کے اور کچھ باقی نہ رہا۔"[2]

حقیقت ہے کہ اس وقت امراء اور عوام سب کی حالت نہایت سقیم تھی۔ فاقہ زدہ سپاہی سوداگروں اور امیروں کے گھروں پر حملے کرکے لوٹ لیتے۔ توپ خانے والوں کا مطالبہ اتنا شدید ہوگیا تھا کہ انہوں نے غصّے میں عماد الملک کے ساتھ جو کچھ کیا وہ ملاحظہ ہو :

۱۔ خلیق احمد نظامی، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔ ص ۸۸۔

۲۔ ایضاً۔ ص، ۸۹۔

"۴ مئی کو فاقہ کش سپاہیوں نے پانی پت کے مقام پر عماد الملک کی قیام گاہ کا محاصرہ کر لیا جب عماد الملک پوچھ گچھ کرنے کے لیے باہر آیا تو انہوں نے اس کو پکڑ لیا اور گالیاں دیتے ہوئے تمام سڑکوں پر لیے لیے پھرے۔ انہوں نے بس اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے اور خوب زد و کوب کیا۔ یہ تذلیل اور تشہیر دو گھنٹوں تک جاری رہی، بعد میں کسی نہ کسی طرح ہاتھی پر بٹھا کر اس کے گھر پہنچا دیا گیا۔"[1]

احمد شاہ کے زمانے میں ملازمین کی تین سال کی تنخواہیں باقی تھیں اور عالمگیر ثانی کے زمانے میں تو کسی کو ایک پیسہ بھی نہ ملا تھا۔ سپاہیوں نے اپنے گھوڑے اور کپڑے تک بیچ دیے تھے۔ کئی کئی دن تک چارہ اور دانہ میسر نہ آنے کے باعث شاہی اصطبل کے جانور بہت لاغر اور کمزور ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوا کہ بادشاہ محل سے باہر نکلتا تو اس کے ساتھ کوئی محافظ نہ ہوتا تھا۔ غربت کا یہ عالم تھا کہ نجیب زادیاں جنہوں نے گھر سے قدم باہر نہیں نکالا تھا، در در بھیک مانگتی پھرتی تھیں حتیٰ کہ کئی کئی دن تک حرم سرا کے مطبخ میں آگ نہیں جلتی تھی۔ "ایک روز شاکر خاں شہزادہ عالی گوہر کے سامنے خیرات خانے کا شوربہ لے کر گیا۔ اس نے کہا کہ یہ محل کی بیگمات کو دے دو۔ اس لیے کہ انہوں نے تین دن سے رزق کی صورت نہیں دیکھی ہے۔ تاریخ عالمگیر ثانی میں ہے کہ ایک روز قلعہ کی بیگمات بھوک سے بلبلا اٹھیں اور پردہ کا کچھ خیال نہ کر کے محل سے شہر کی طرف جانے لگیں لیکن قلعہ کے دروازے بند تھے۔ اس لیے وہیں چپ ہو کر بیٹھ رہیں اور ایک رات اور ایک دن اسی طرح بیٹھی رہیں۔"[2]

نادر شاہ کے بعد جنوری ۱۷۴۸ء سے ۱۷۶۱ء تک احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان میں خوب

۱۔ میر تقی میر، حیات و شاعری۔ ص، ۱۵۲

۲۔ ایضاً۔ ص، ۱۵۲، ۱۵۳

قتل و غارت گری کی اور لوٹ مار مچائی ۔ ۱۷۵۷ء میں دلّی میں اسکے تباہی مچانے کے بعد تو وہاں کے بازاروں میں ایک عرصے تک غلّہ نظر نہیں آیا ۔ ستمبر اور اکتوبر ۱۷۵۷ء میں اشیائے خوردنی اتنی گران ہوگئیں کہ عام آدمیوں کے لیے ان کا خریدنا تقریباً ناممکن تھا ۔ مونگ کی دال دو روپیہ سیر تھی ، املی کے دام سو روپیہ ہوگئے تھے ۔ بعض اطراف میں تو مکمل قحط پڑا ہوا تھا ۔ بیروزگاری دن بدن بڑھ رہی تھی ۔ چوری اور ڈاکہ زنی زوروں پر تھی ۔ احمد شاہ ابدالی کی دلّی میں تباہی و بربادی سے معاشرتی نظام ہر طرح سے درہم برہم تھا اور معاشرے کی بدحالی کا اثر اقتصادی حالت پر بھی ہوا ۔ اسکے بارے میں میر تقی میر لکھتے ہیں :

"۔۔۔۔ افغان ذلیل کرتے ،گالیاں دیتے اور طرح طرح کے ظلم کرتے تھے ۔ جو چیز لوٹنے کی ملی لوٹ لی ۔ بعض نے تو ستر پوش تک نہ چھوڑے ۔ شاہجہان آباد خاک کے برابر ہوگیا ۔ اس کے بعد یہ لوگ پرانی دلّی کی طرف متوجہ ہوئے اور بے شمار لوگوں کو ہلاک کر ڈالا ۔ سات آٹھ دن تک یہی ہنگامہ گرم رہا ۔ کسی کے گھر پہننے کے کپڑے اور ایک دن کے کھانے کا سامان نہ رہا ۔ مردوں کے سر پر ٹوپی اور عورتوں کے سر پر دوپٹہ تک نہیں تھا ۔ یہ ظالم ،لوگوں سے غلّہ چھین لیتے اور غریبوں کے ہاتھ قیمتاً بیچتے ۔ مصیبت زدوں کی فریاد آسمان تک پہنچی ۔ مگر ابدالی کے کان پر جوں تک نہ رینگی ۔"[1]

اس معاشی اور معاشرتی بدحالی کو دیکھتے ہوئے بھی شاہ عالم ثانی کے عہد میں نجف خان جیسا بہادر اور دانش مند جرنیل بھی طلسم خانہ عیش پرستی میں داخل ہوا اور پھر مر کر ہی نجات پائی ۔ میر اس کے بارے میں لکھتے ہیں ۔

"۔۔۔۔ لیکن وہ جوان تھا اور شاہجہان آباد ، دلی تو ایک طلسم خانہ

---

۱ ۔ میر تقی میر ، ذکر میر ۔ ص ، ۸۶ ۔

ہے ۔ یار دوستوں نے عیش و عشرت کی طرف مائل کر دیا ۔ مکروہات کے استعمال اور عورتوں کی ہم جلیسی میں اتنا منہمک ہوا کہ بدن سے طاقت زائل ہوگئی ۔ آخر مرض سل میں گرفتار ہوگیا "۔[1]

جب بادشاہ ، امراء ، وزراء ،شہزادے اور شہزادیوں کا یہ حال ہو تو عوام کا ان حالات سے متاثر ہونا لازمی بات ہے ۔ عوام الناس بھی امراء کی طرح بے روزگاری اور اقتصادی بدحالی کا شکار تھے ۔ معاشی بدحالی کے ساتھ ساتھ کسی کی عزت و آبرو بھی محفوظ نہیں تھی ۔ بزم رندانہ جو ہر قسم کے فسق وفجور کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی ۔ انہیں دیکھ کر صاحب مرقع دھلی یہ کہنے پر مجبور ہوگئے ۔

" چنیں ہنگامہ چشم بتن میں مصلحت و بصر نگشودن محض بصیرت "۔[2]

عظیم الشان سلطنت مغلیہ کے بادشاہ اگر چاہتے تو گردش ایام کو اپنے قابو میں رکھ سکتے تھے مگر ان کی عیاشیوں نے انہیں سنبھلنے کا موقع نہ دیا اور انہی انہی افواج کے ساتھ عوام کو بھی بہا کرلے گئے جب کوئی قوم اقتصادی بحران کا شکار ہو تو شریفانہ عادات وخصائل اور اخلاقی قدریں بھی کھو بیٹھتی ہے ۔ حرص وہوس اور بددیانتی کا دور دورہ ہوجاتا ہے ۔ اقتصادی بدحالی کے ساتھ ساتھ معاشرہ بھی تباہی وبربادی کا شکار ہوجاتا ہے ۔ یہی حال سلطنت مغلیہ کا ہوا ۔

۱۔ میر تقی میر ، ذکر میر ۔ ص ۱۳۸ ۔

۲۔ درگاہ قلی خان ۔ مرقع دھلی ۔ ص ۲۵ ۔

مذہبی حالات
===========

سرمایہ ملت کے نگہبان اور دین مقدس کے غیور خادم اورنگ زیب عالمگیر کی وفات ۱۷۰۷ء ہماری تاریخ اسلام میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے ۔ عالمگیر کے انتقال سے چار سال قبل ۱۷۰۳ء میں ہندوستانی مسلمانوں کے عظیم محسن قطب الدین احمد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے ۔ اسلامیان ہند کی تاریخ میں اگر اس دور کا المناک پہلو یہ تھا کہ مغلیہ زوال کی موجیں کی تیزی اور تندی سامنے آنے والی ہر قوت کو تنکے کی طرح بہائے لیے جا رہی تھی تو دوسری طرف ایک مسرت انگیز پہلو یہ بھی تھا کہ ایسے سیاسی انتشار و افتراق ، اقتصادی بدحالی اور اخلاقی ومذہبی بدنظمی کے دور میں شاہ ولی اللہ نے معاشرے کو ایسے حالات پیدا ہونے سے محفوظ رکھا کہ جس سے مذہبی ہیئت بگڑ جاتی ۔

مغلوں کا سیاسی زوال تو اورنگ زیب کے عہد میں ہی شروع ہو چکا تھا مگر اس نے اپنے تدبّر ، بصیرت ، حکمت عملی اور گہری سوجھ بوجھ سے اس زوال کے دریا پر بند لگا دیے تھے۔ اورنگ زیب کے بعد ۱۷۰۷ء سے ۱۸۰۳ء تک دس حکمران سریر آرائے سلطنت ہوئے اور ان میں سے ہر ایک کی حکمرانی چند فوجی گروہوں کے گٹھ جوڑ اور امراء وروؑسا کی سازشوں کی مرہون منت تھی ۔ وراثت کے جھگڑے ، بادشاہوں کی نااہلیت ، صوبہ داروں کی خود مختاریت ، فوجی کمزوری اور شاہی خزانے میں روپے کی کمی نے زوال کی رفتار کو تیز تر کر دیا ۔ لہذا سلاطین و امراء علماء کی عالاشقی ؍کی غفلت و مداہنت ، عمال حکومت کی نمک حرامی ، اور اخلاق باختگی نے پورے معاشرے کو عقائد فاسدہ اور اعمال شنیعہ کے گرداب میں غرق کر دیا ۔ دلی تہذیب وتمدن کا ایسا مینار تھی ، جو پورے ہندوستان کی راہنمائی کر رہا تھا ، اب تباہ وبرباد ہو چکی تھی ۔ ادیب وشاعر ، عالم و فاضل اور دوسرے فنون کے ماہر جو دہلی کو اپنا مسکن بنائے ہوئے تھے ، دہلی کے برباد ہونے کے ساتھ خود بھی اجڑ گئے لہذا اورنگ زیب کے بادشاہ ہوئے بعد آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگے اور ہندوستان ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بن گیا ۔

اٹھارویں صدی میں مسلمانوں کی مذھبی حالت کی ذمہ داری فقط سیاسی تنزّل پر نہیں بلکہ معاشرتی اقدار پر بھی عائد ہوتی ہے۔ سیاسی زوال، اقتصادی بدحالی اور معاشی پریشانیوں میں اخلاقی قدروں کی پابندی بہت مشکل امر ہے ۔ ایسے حالات میں دین و مذھب کا بھی ہوش نہیں رہتا ۔

مغلوں کے زمانہ تنزّل میں شاہی دربار میں ایرانی و تورانی (شیعہ و سنّی) دو مستقل گروہ تھے ۔ ایرانی پارٹی اگرچہ اقلیت میں تھی لیکن یہ منظّم جماعت اثر و اقتدار کے باعث کافی مضبوط اور طاقت ور تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا اثر دربار سے بازار تک تھا ۔

اورنگ زیب کے بعد اس کا بیٹا بہادر شاہ اوّل تخت ہند پر متمکن ہوا ۔ بادشاہ خود علوم و فنون میں مہارت رکھتا تھا اور اس کو اہل علم و کمال کی صحبت سے بھی خاص لگاؤ تھا ۔ خصوصاً فقہ و حدیث میں اس نے سلاطین تیموریہ سے تعلیم حاصل کی تھی ۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ صاحب علم و کمال کی صحبت میں بیٹھ کر مناظرہ علمی میں حصّہ لیتا ۔

اورنگ زیب اہل سنت والجماعت تھا لیکن بہادر شاہ نے تخت نشین ہوتے ہی اپنی تحقیق و جستجو کی روشنی میں شیعہ مذھب کو ترجیح دی ۔ اس نے شیعہ عقائد کو برحق سمجھتے ہوئے اسی راہ کو منتخب کرلیا ۔ غلام حسین طبا طبائی لکھتے ہیں :

"چون بہ تحقیق خود مذھب شیعہ امامیہ را حق میدانست
همین مسلک اختیار نمودہ" [1]

بہادر شاہ اپنے دور حکومت میں اس مذھب کی ترویج و اشاعت میں منہمک رہا ۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے نام کے ساتھ "سید" لکھنا شروع کردیا اور اپنے وزیر منعم خان کے مشورے سے خطبہ کے الفاظ بدل کر اس میں "علی ولی اللہ وصی رسول اللہ" کے الفاظ شامل کرنے چاہے ۔ "وصی" کے لفظ پر اعتراض کی وجہ سے حالات تیزی سے خراب ہونے لگے کیونکہ اس طرح

---

۱ - غلام حسین طبا طبائی ، سیر المتاخرین - جلد دوم - ص، ۳۸۱

حضرت علی سے قبل پہلے تین خلفاء پر بہ راہ راست یہ الزام عائد ہوتا تھا کہ انہوں نے رسول اللہ کی خواہش اور وصیّت کے برعکس حضرت علی کو خلافت سے محروم رکھا ۔ جب کہ اہل سنت کے عقائد کے مطابق رسول پاک نے اس قسم کی کوئی وصیّت نہیں فرمائی تھی ۔ بہادر شاہ کے اس اقدام سے آگرہ احمد آباد ، اور دوسرے شہروں میں فسادات شروع ہوگئے ۔ اہل سنت والجماعت اور خصوصاً عظیم الشان اور خجستہ اختر نے جو کٹر قسم کے سنّی تھے ، بادشاہ کی شدید مخالفت کی لیکن بادشاہ اپنے موقف پر قائم رہا ۔ اس نے حالات پر قابو پانے کی بجائے ایک اور منفی قدم اٹھایا ۔ اس نے لاہور میں اپنے قیام کے دوران میں علمائے لاہور کو اپنے حضور میں بلایا "مولوی محمد مراد دوسرے تین علماء کے ہمراہ مولانا یار محمد کی زیر قیادت بادشاہ کے حضور پیش ہوئے ۔ بادشاہ سے مناظرہ ہوا ۔ اور مولانا یار محمد نے نہایت جرأت کے ساتھ حق کا اعلان کیا ۔ بادشاہ نے برانگیختہ ہوکر کہا کہ تم بادشاہوں کے غضب سے نہیں ڈرتا تو انہوں نے کہا ۔ " میں اپنے خدا سے چار چیزوں کی آرزو رکھتا ہوں ۔ اوّل تحصیل علم ، دوم حفظ کلام اللہ ، سوم حج ، چہارم شہادت ، الحمد للہ کہ اللہ تعالی نے تین نعمتیں عطا کیں ۔ آرزوئے شہادت باقی ہے ۔ امیدوار ہوں کہ بادشاہ کی توجہ سے یہ بھی پوری ہوجائے " ۔[1]

اتمام حجّت کے بعد بھی اس (بہادر شاہ) نے خطبہ میں " علی ولی اللہ وصی رسول اللہ " کے الفاظ کو جاری کرنے کی کوشش کی ۔ اس اقدام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ثابت قدمی ، ذہنی بلندی اور اولوالعزمی انتہائی ضروری تھیں ۔ مغلیہ خاندان کے تمام شہزادے خصوصاً آخری دور کے شہزادے ان صفات سے یکسر عاری تھے ۔ اس لیے ہر طرف انتشار پھیل گیا ۔ خود بادشاہ کو اس مخالفت کا بہت اچھی طرح علم ہو چکا تھا ۔

" اس کے باوجود اس نے ایک دن شیعہ خطیب کو شہزادہ عظیم الشان کے ہمراہ جامع مسجد میں بھیجا ۔ شہزادہ شیعہ خطیب کو اپنے ہمراہ لے جانے کے لیے قطعی تیار نہ تھا مگر باپ کی

---

۱ ۔ صمصام الدولہ شاہنواز خان ، ماثر الامراء ۔ جلد ۔ اول ۔ ص ۳۲۹ ،

رضا جوئی کی خاطر اسے مسجد لے گیا - جب اس نے مجمع میں اپنی عقیدت کا پرچار کرنا چاہا تو اس کو قتل کر دیا گیا - مسجد میں حاضرین کی بیشتر تعداد حنفیوں پر مشتمل تھی - وہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتے تھے - شہزادہ دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا اور اس نے ذرا بھی مدافعت نہ کی "-[1]

پھر اس شورش انگیزی کے بعد ایک اور واقعہ رونما ہوا - " سنّی علماء جن کو فقہ و حدیث پر کامل دسترس تھی - مسجد میں جمع ہوئے اور سب نے متفقہ طور پر بادشاہ کو صحیح فرقہ میں شامل ہونے کی دعوت دی لیکن اس نے اس دعوت کو قابل اعتناء نہ سمجھا اور اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن شیعہ فرقہ کی اشاعت میں گزارتا رہا ، اور سنّی علماء سے بحث و تمحیص میں حصہ لیتا رہا حالانکہ اس مباحثہ کا کوئی نتیجہ نہ نکلتا "[1]

بہادر شاہ نے صرف شیعہ مذہب کو اپنانے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ وہ نجومیوں اور رمالوں کی صحبت میں اتنا ضعیف الاعتقاد ہوگیا تھا کہ جو پیشین گوئی وہ کرتے اس پر پختہ یقین رکھتا تھا - قبروں اور مزاروں پر اکثر حاضری دیتا تھا - بقول ولیم اروِن "اس نے کسی مقدس ہستی کے مزار یا کسی مذہبی آدمی کے پاس پہنچنے کا موقع کبھی بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا "-[3]

" ۱۰ نومبر ۱۷۰۷ء کو بہادر شاہ نے ایک بہت بڑی جھیل کے کنارے اپنے خیمے گاڑھے - ۱۲ نومبر کو اس نے اپنے درباری نجومیوں کے کہنے کے مطابق تحفے تحائف تقسیم کیے اور ۱۵ نومبر کو فتح پور سیکری میں شیخ سلیم چشتی کے مقبرے پر حاضری دی "-[4] آخرکار دلی میں قطب الدین بختیار کاکی کے مزار کے قریب مسجد عالمگیر کے صحن میں دفن ہوا -

بہادر شاہ کے بعد سید برادران قطب الملک عبداللہ خان اور امیر الامراء حسین علی خان کا دور آیا - یہ دونوں بھائی حکومت کے تمام امور پر اقتدار اور غلبہ حاصل کرلینے کے باعث "بادشاہ گر"

۱- غلام حسین طباطبائی ، سیر المتاخرین - جلد دوم - ص، ۲۸۱

۲- ایضاً - ص، ۳۸۱

3. William Irvine, Later Mughal. Vol. I, p. 22 136,137.

4. Ibid. p. 46.

مشہور ہوئے ۔ وہ ملکی سیاست میں ہر طرح حاوی رہے ۔ اس دوران میں انہوں نے اپنے عقائد کی خوب تشہیر کی ۔ امیر الامراء حسین علی خان ہر مہینے کی گیارہ اور بارہ تاریخ کو مجلس منعقد کرتے تھے ۔ صمصام الدولہ شاہنواز خان لکھتے ہیں :

" احداث مجلس یازدھم و دوازدھم ہر ماہ در بلاد عظیمہ دکن نمودہ کہ تا حال جاری است ۔ در این مجالس با مشائخ و فقراء بخضوع وانکسار بنفس خود خدمت می نمود " ۔[1]

سید برادران کے بعد فرخ سیر کے عہد حکومت میں بھی اسی قسم کا ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا تھا جب شیعہ سنی نزاع انتہا تک پہنچ گیا تھا ۔ اس زمانے میں خان دوران بخشی کے بھائی خواجہ محمد جعفر متصوّف کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ ان کے گھروں میں آئمہ طاہرین کی منقبت میں قوالیاں ہوا کرتی تھیں ۔ بعض مرید سلام کی بجائے زمین بوسی کیا کرتے تھے ۔ اسی دور میں ملتان کے ایک واعظ شیخ عبداللہ ملتانی دار السلطنت دہلی گئے تو انہوں نے ان بدعات کی ان الفاظ میں مذمت کی :

" عقیدت کا ایسا اظہار صرف خدائے بزرگ وبرتر کے لئے ہے ۔ اس کے علاوہ اور کسی کو زیب نہیں دیتا اور سرود سننا بھی ممنوع ہے اور خلفائے راشدین کے ذکر اور نام کے بغیر اہل بیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی منقبت اسلام کے آئین کے خلاف ہے " ۔[2]

شیخ عبداللہ ملتانی نے جامع مسجد میں جمعہ کے دن وعظ کہا :

" حضرت علی مرتضی داخل آل عبا نہیں اور علوی کو سید نہیں کہنا چاہیئے اور یہ کہ پنجتن پاک کو پاک کہنا اہل سنت کے عقیدہ کے خلاف ہے ۔ اس سے یہی مطلب نکلتا ہے کہ اصحاب کرام پاک نہ تھے " ۔[3]

---

۱ ۔ صمصام الدولہ شاہنواز خان ، ماثر الامراء ۔ جلد ۔ اول ۔ ص ، ۳۳۸

۲ ۔ غلام حسین طبا طبائی ، سیر المتاخرین ۔ جلد دوم ۔ ص ، ۳۳۹

۳ ۔ ایضاً ۔ ص ، ۴۰۰

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جمعہ کے دن کچھ اوباش مغل زادے کھلاڑی تسبیاں گردن اور بازو میں ڈالے وعظ کے وقت پہنچے ۔ ان کے اس حالت میں مسجد میں داخل ہونے پر یہ گمان ہوا کہ وہ شیخ عبداللہ ملتانی کو قتل کرنے کے لیے آئے ہیں ۔ شیخ عبداللہ کے حامیوں نے فرخ سیر سے استغاثہ کیا ، جس پر فرخ سیر نے قاضی شریعت اللہ سے مشورہ کے بعد ان دونوں حضرات کو نقل مکان کر دیا تھا ۔

فرخ سیر کے بعد محمد شاہ نوجوانی کے عالم میں اٹھارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا ۔ اسکی زندگی لہو ولعب ، استعمال منشیات وغیرہ سے اس قدر بھرپور تھی اور رندانہ محفلوں بے تکلف جلسوں میں شرکت اور جنس مخالف کا اتنا شوقین تھا کہ اس کی اس رنگین مزاجی پر اہل دربار نے اسے محمد شاہ رنگیلا کہنا شروع کر دیا ۔ محمد شاہ کا ہنگامہ نادری کے بعد منہیات شرعیہ سے تائب ہونا اور رقص و سرود کو موقوف کرنا تاریخ میں نظر نہیں آتا لیکن نواب درگاہ قلی خان ارباب طرب کے تحت کمال باشی کے حالات میں بیان کرتے ہیں :

"درین ولا کہ از سوانح نادر شاہی مزاج بادشاہ دین پناہ از استماع ساز ونوا انحراف ورزیدہ نغمۂ ارباب نشہ را بکلم متروک وموقوف گردیدہ" ۔[1]

محمد شاہ فقیروں اور درویشوں کا صدق دل سے احترام کرتا تھا اور ان کے ساتھ بہت زیادہ عقیدت رکھتا تھا ۔ صاحب سیر المتاخرین کہتے ہیں :

"کہ آخری عمر میں محمد شاہ فقیروں کی صحبت میں خوش رہتے اور انہی کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے" ۔[2]

محمد شاہ کا دور اگر ایک طرف عیاشیوں اور سرمستیوں کا زمانہ ہے تو دوسری طرف ہمیں اس زمانہ میں کافی تعداد میں بزرگان دین بھی نظر آتے ہیں ، جس کی تائید میں شاہ عبدالعزیز دہلوی

---

۱ ـ درگاہ قلی خان ، مرقع دہلی ، ص ۸۰

۲ ـ غلام حسین طباطبائی ، سیر المتاخرین ـ جلد سوم ـ ص ۸۷۰

فرماتے ھیں ۔ " درعہد محمد شاہ پادشاہ ہست دور بزرگ صاحب ارشاد از ھر خانوادہ در دھلی بودند واین چنین اتفاق کم می شود " ۔[1]

محمد شاہ کے عہد میں شاہ ولی اللہ جب حرمین شریفین کے فیوض سے مالا مال ھوکر ھندوستان واپس لوٹے تو آپ نے دھلی میں درس حدیث کا آغاز فرمایا ۔ جب بغداد اور بخارا سے آنے والے علمی وروحانی قافلوں کے لیے مدرسہ رحیمیہ کی وسعت تنگ ھوگئی اور ملک بھر کے اطراف واکناف سے تشنگان حدیث نبوی اپنی روحانی پیاس بجھانے کی غرض سے جوق درجوق رجوع کرنے لگے تو اس موقع پر محمد شاہ بادشاہ نے مولانا کو بلا کر شہر میں ایک عالیشان مکان دے کر اندرون شہر رکھا ۔ "یہ مدرسہ کسی زمانے میں نہایت عالیشان اور خوبصورت تھا اور بہت بڑا دارالعلوم سمجھا جاتا تھا " ۔[2]

محمد شاہ کے بعد اورنگ زیب کا پڑپوتا سلطان عزیز الدین بن معز الدین جہاندار شاہ عالمگیر ثانی کے معزز لقب سے تخت ھند پر متمکن ھوا ۔ بادشاہ ایک طرف تو اپنے دادا اورنگ زیب عالمگیر کے نقش قدم پر چلتا تھا تو دوسری جانب وہ پیرون فقیرون کو مانتا اور پیری اور رشتہ دار افراد کے باوجود شادی کرنے کا خواھش مند تھا ۔ گویا شہزادہ عزیز الدین متضاد خوبیوں کا مالک تھا۔ ایسی ضعیف الاعتقادی کی حالت میں اس کا تخت ھند کو رونق بخشنا ناممکن نظر آتا تھا ۔

اخلاقی وتہذیبی گراوٹ کی ایک وجہ تو بادشاھوں کا شیعہ عقائد کو مستقل مذھب کے طور پر اپنا لینا ، پیرون فقیرون کو ماننا ، نجومیوں اور رمالوں پر اعتقاد کرنا اور مزارون پر حاضری دینا تھی تو دوسری وجہ مسلمانوں کا اسلام کے بعض واضح اصولوں میں تبدیلیاں پیدا کرکے ھندو مذھب کے عقائد کو اپنانا تھی ۔ مسلمانوں کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا ، جو ان تبدیلیوں سے متاثر نہ ھوا ھو ۔ ڈاکٹر تارا چند لکھتے ھیں کہ :

۱۔ شاہ عبدالعزیز دھلوی ، ملفوظات عزیزی ، ص ۹۸

۲۔ مولوی بشیر الدین ، دارالحکومت دھلی ۔ جلد دوم ۔ ص ۱۷۳

"علماء بھی اسی رنگ میں رنگ گئے ----- جو ہندو تمدن کا ایک ظاہری عکس تھا ۔ مسلمان مقبروں اور مزاروں پر حاضری دیتے اور پیدائش ، اموات اور شادی بیاہ کے موقعوں پر اسلام کے ظاہری اصولوں کے خلاف شراب نوشی اور جوئے جیسی رسومات کرا پیتے" ۔[1]

ہندوؤں اور مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ میں خلوص و محبّت ، اتحاد و یگانگت کے اثرات کارفرما نظر آتے تھے ۔ دونوں قوموں نے ایک مشترکہ علمی و ادبی ذوق پیدا کرلیا تھا ۔ یہاں تک کہ دونوں ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں میں دلچسپی لیتے تھے ۔ مذہبی رواداری کا یہ حال تھا کہ خود شاہان مغلیہ ہولی اور دسہرہ کا تہوار مناتے ۔ غلام علی مجتبی لکھتے ہیں :

"کہ مذہبی تہواروں کے موقعوں پر مسلمانوں کی ہندوؤں کے پہلو بہ پہلو شرکت ہندو اثر کا مسلمانوں کی زندگی میں کھلا ہوا ثبوت تھا ۔ مسلمان جشن اشٹمی ، دسہرہ اور ہولی کے ہندو تہواروں کے موقعوں پر میلوں اور مذہبی تقریبات میں شانہ بشانہ شریک ہوتے تھے" ۔[2]

مذہبی اعتبار سے حالات اس قدر خراب ہوچکے تھے کہ اس کا اندازہ شاہ ولی اللّٰہ کی تحریروں سے ہوتا ہے ۔ سید ابوالحسن ندوی فرماتے ہیں کہ :

"شرک اور بت پرستی مختلف ناموں سے مسلمانوں میں گھر کرچکی تھی ۔ قبروں اور مردوں کے متعلق ایک مستقل شریعت بن گئی تھی ۔ جس کے واجبات اور مستحبات میں ان سے دعا مانگنا ، بوسہ دینا اور چادریں چڑھانا ، منتیں ماننا ، قربانیاں کرنا ، طواف کرنا ، گانا بجانا ، میلہ لگانا تہوار منانا ، چراغاں کرنا ، عورتوں کا وہاں جمع ہونا وغیرہ ۔ اس شریعت کے خاص اجزاء ہیں ۔ غرض کہ مذہب کے نام پر وہ ساری چیزیں

---

1. Dr. Tara Chand, A Short History of the Indian people. xx p. 199,200.

۲۔ غلام علی مجتبی ، مقامات مظہری ۔ ص۔ ۱۵۱

مسلمانوں میں پیدا ہو چکی تھیں جو یہودیوں اور نصرانیوں وغیرہ کے ہاں پائی جاتی تھیں ۔ مذہب کے رسوم و رواج مسلم ثقافت کے دامن میں جگہ پا چکے تھے"۔[۱]

شعائر اسلامی میں سلام مسنون کا طریقہ ختم ہوگیا تھا ۔ اس کی جگہ آداب و تسلیمات کا رواج تھا ۔ خود شاہ عبدالعزیز کے یہاں آداب و تسلیمات کا رواج پڑ چکا تھا ۔ سلام مسنون کا طریقہ اس حد تک مادوس ہوگیا تھا کہ عالمگیر جیسے متشرع اور فقیہہ بادشاہ کے متعلق یہ روایت ہے "کہ ایک سقّہ نے "سلام علیک" کہہ دیا تو حکم ہوا کہ اسے کوتوال کے حوالے کر دیا جائے"۔[۲]

اسی طرح ہندوؤں کے رہن سہن ، بود و باش ، لباس اور تہذیب کا اثر مسلمانوں پر بے پناہ ہوا ۔ اس ہندو مسلم تمدّن کا علمی حلقوں میں یہاں تک اثر ہوا کہ وہ کھلے عام خدا کے نام کو رام اور بھگوان کا متبادل سمجھتے تھے ۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ یہ ایک ہی ہستی کے مختلف نام ہیں ۔ بقول شاہ عبدالعزیز "کہ ہر ملک میں ہر فرقہ نے اپنی خواہش کے مطابق جو چاہا سو تراش لیا اور اسلام اور کفر کھچڑی ہوگیا ۔" ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ اخلاقی ابتری عالمگیر کے بعد دن بدن بڑھتی جا رہی تھی ۔ ایک امریکی محقق ڈاکٹر لوتھراپ سٹارڈرڈ نے اس عام اخلاقی و ذہنی ابتری کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے :

"اٹھارویں صدی تک اسلامی دنیا اپنے ضعف کی انتہا کو پہنچ چکی تھی ۔ یہ صحیح قوت کے آثار کسی جگہ پائے نہیں جاتے ۔ ہر جگہ جمود و تنزل نمایاں تھا ۔ آداب و اخلاق قابل نفرت تھے ----- فی الجملہ اسلام کی جان نکل چکی تھی اور محض بے روح رسمیات اور مبتذل توہمات کے سوا کچھ نہ رہا تھا ۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پھر دنیا میں آتے تو اپنے پیروؤں کے ارتداد اور بت پرستی پر بیزاری کا اظہار فرماتے"۔[۳]

۱۔ ابوالحسن ندوی ، سید احمد شہید ۔ ص ، ۲۵ ، ۲۶

۲۔ ایضاً ۔ ص ، ۲۷

3. Dr. Lothrop Stoddard, The new world of Islam. p. 20,21.

اس دور میں خود بزرگان دین اور صوفیائے کرام ، کہ جن سے خلق خدا فیض یاب ہوتی تھی ، ان کی ذات مصدر فیوض وبرکات نہیں بلکہ منبع شر وفساد تھی - وہ اپنی ہی بحثوں میں الجھ کر ایسے ہی حال میں کھو گئے تھے - تو خلق خدا کی تجدید واصلاح کی فکر کب اور کیسے کرتے - حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے سیف الدین جنہیں حضرت خواجہ معصوم نے خود اورنگ زیب کے پاس " امر بالمعروف اور نہی عن المنکر " کے لیے بھیجا تھا ، ان کی زندگی کا یہ عالم تھا کہ :

" آپ کے لیے سرہند میں دیباکا ایک خیمہ جواہرات اور مروارید
سے لگا ہوا نصب ہوتا تھا - جس کی چوبوں پر یاقوت جڑے ہوئے
ہوتے تھے - اسی خیمہ کے اندر ایک جڑاؤ کرسی رکھی جاتی تھی -
جس پر آنجناب جلوہ افروز ہوتے اور جس کے گرد اگرد نقیب اور
چھدار ہاتھوں میں سنہری اور روپہلی عصا لیے ہوئے کھڑے
ہوتے - بادشاہ ، شہزادے اور امراء حاضر خدمت ہو کر کھڑے
رہتے - جب تک حکم نہ ہوتا ، نہ بیٹھتے " - [1]

امت کے یہ مصلحین اور صوفیاء جن کے در سے لوگ دین ودنیا کے لیے استفادہ کرتے ہوئے راہ ہدایت پر گامزن ہوتے تھے - اب ان کے سایہ میں رہتے ہوئے غلط راہوں کو اختیار کر رہے تھے - جب بادشاہ اور امراء اپنے مذہبی عقائد کو ترک کر کے غیر اقوام کے مذاہب کو اپنا لیں اور عوام اپنی جہالت ، توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کے باعث پیروں ، فقیروں ، نجومیوں اور رمالوں کے علوم سفلیہ کے جال میں پھنس جائیں تو ایسی صورت میں انسان نہ صرف مال وزر بلکہ دولت ایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے -

مسلمانوں نے ہندوؤں کے روز مرۃ دنیوی اور دینی عقائد کو اپنے مذہب پر اس قدر اثر انداز کر لیا تھا کہ جس سے معاشرے کا متاثر ہونا ایک فطری امر تھا - عوام تو کیا بادشاہوں نے بھی

---

۱ - شیخ محمد اکرام ، رود کوثر - ص ، ۵۲۲

عقائد کو چھوڑ کر شیعہ مذہب کو اختیار کر لیا تھا ۔ امراء و رؤسا اور بادشاہ عوام کا اخلاقی قدروں کو اس طرح پامال کرنا گویا مذہبی اصولوں کا خاتمہ تھا" ۔ اٹھارویں صدی میں مذہبی پس ماندگی کی ذمہ داری فقط سیاسی تنزّل پر نہیں، بلکہ معاشرتی اقدار پر عائد ہوتی ہے ۔ معاشرتی بدحالی کا دور محمد شاہ کا عہد تھا ۔ محمد شاہ کے دور حکومت میں معاشرتی اور اخلاقی ابتری اپنے نقطہ عروج پر پہنچ چکی تھی ۔ عالمگیر کے بعد مغلیہ دربار میں شراب اور دیگر نشہ آور اشیاء کا دور بڑی تیزی سے جاری تھا ۔ نفسانی جذبات کو مشتعل کرنے کی غرض سے ارباب نشاط کی افراط تھی ۔ طوائفوں اور رنڈیوں کی پوری قوم وجود میں آ چکی تھی ۔ شمالی ہندوستان کے بیشتر قصبات میں ان کے محلے آباد تھے ۔ ان کے ساتھ ساتھ نوچوں اور گویوں کا ایک پورا گروہ اپنی زندگی کو تباہ و برباد کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں کو بھی اعمال شنیعہ کے گرداب میں غرق کر رہا تھا ۔ فسق و فجور اور معصیت و نافرمانی زندگی کا ایک جزو لاینفک بن گئی تھی ۔ بازاری عورتیں دینی مجالس سے لے کر ہر مجلس کی زینت تھیں ۔ حد تو یہ ہے کہ بعض شرفاء و رؤسا ان کو شرف و افتخار کا ذریعہ سمجھتے ہوئے اپنے لڑکوں کو ان کے پاس زبان اور ادب سیکھنے کے لیے بھیجتے تھے ۔ بادشاہوں کی سرمستیاں ، امرد پرستی اور ہیجڑوں کا پیشہ بھی اسی عہد میں شروع ہوا ۔ یہ تمام لوگ اخلاق کے حق میں زہر قاتل تھے ۔ جو قوم و ملت کی رگ رگ میں سرایت کر رہا تھا ۔ گویا جاہلیت اپنے پورے شباب پر تھی ۔ ان تمام حالات کا ذکر تفصیل سے معاشرتی حالات میں کر دیا گیا ہے ۔

اس کے برعکس اس درماندگی اور زبوں حالی کے زمانے میں تصوّف کے وہ پہلو جو گداز اور معصوم طبیعتوں کے لیے مناسب اور اس دور کے لیے موزوں تھے ، سامنے آئے ۔ تصوف کی بگڑی ہوئی شکل نے عوام و خاص کو اپنی طرف مائل کر لیا تھا اور یہ لوگ متصوفین کے زیر اثر رہ کر سراسر علوم دین کے منافی باتوں پر عامل تھے ۔ علوم دین کے بنیادی مسائل پر لوگوں کی توجہ بہت کم تھی ۔ بعض دوسرے مذاہب کی رسمیں دین داری کی اساس سمجھی جاتی تھیں ۔ مسلمان اور غیر مسلم میں تمیز کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا ۔ اس وقت لوگوں کا میلان دار السلطنت

میں موجود علماء کی طرف نہیں تھا بلکہ متصوفین کی جانب تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں عرسوں اور میلوں وغیرہ کا بہت چرچا تھا ۔ وہ بھی فیض روحانی کی غرض سے نہیں بلکہ نفسانی خواہشات کی تسکین کے لیے منائے جاتے تھے ۔

اس عہد میں ایک ایرانی شہزاد منصب دار درگاہ قلی خاں نے عین حملہ نادری کے زمانہ میں ایک سفرنامہ " دھلی بارھویں صدی ھجری میں " کے نام سے لکھا تھا ۔ مولف نے اس میں ان تمام مناظر اور اجتماعات کا ذکر کیا ہے، جو اس نے اپنی نگاہوں سے دیکھے ۔ اس کے نزدیک اس دور کا سب سے صاف ستھرا اجتماع سرائے عرب میں ہوتا تھا ۔ چونکہ یہاں تلاوت قرآن اور میلاد شریف کے سوا تفریح کا اور کوئی سامان میسر نہیں تھا ۔ اس لیے انہوں نے " مرقع دھلی " کی ابتداء ھی دھلی کے متبرک مقام " قدم شریف " سے کی ہے ۔ نواب صاحب لکھتے ہیں :

" ----- یہاں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم کا نشان ہے کہ جس کے آستان کی خاک ارباب بصیرت کے لیے سرمہ اور جس کے راستے کا غبار اھل فطرت کے دل کے سکون کا سبب ھے ------
جمعرات کے دن درگاہ کے صحن میں زائرین کا اس قدر ھجوم ھوتا ھے کہ ہزاروں مصیبتیں اٹھانے کے بعد قدم شریف تک پہنچنا ممکن ھے اور ربیع الاوّل کے مہینے میں تو دن رات ایسا ھی مجمع رہتا ھے ۔
فقراء اور زائرین دور دور کے شہروں اور مقاموں سے زیارت کے لیے آتے ھیں ----- سعادت مند لوگ آخرت میں اجرت پانے کے لیے اس درگاہ کے احاطہ میں بہت زیادہ روپیہ خرچ کرکے مکان خریدتے ھیں ۔ اور آخرت کا مکان (قبر) بناتے ھیں " ۔ [1]

گویا ایک چھوٹی سی جماعت قرآن پاک اور ذکر رسول سے تعلق رکھے ہوئے تھی ورنہ بیشتر لوگ

---

۱ ـ نواب درگاہ قلی خاں ، مرقع دھلی ـ ص ، ۱ ، ۲

حرص و ہوس کا شکار ہو چکے تھے ۔

مذہب کا سہارا لے کر انفرادی نجات حاصل کرنے والوں کی کوششوں کی یہ انتہا تھی کہ لوگ بزرگوں کے مزاروں کے قریب دفن ہونے کو ترجیح دیتے تھے اور اس بات پر پختہ یقین رکھتے تھے کہ ان بزرگوں کی وجہ سے وہ جہنم کی آگ سے بچ سکیں گے ۔ نواب صاحب نے خواجہ باقی باللہ کی درگاہ کے متعلق بھی ایسے ہی لکھا ہے :

" اس (درگاہ) کے متعلق عجیب و غریب خوارق میں ایک بات یہ ہے کہ اہل دہلی تلاش کے بعد اپنے عزیزوں کو اس احاطے میں دفن کرتے ہیں تاکہ ان کی ہمسائیگی کی وجہ سے جہنم کی آگ سے محفوظ رہیں " ۔[1]

عوام پر جب کوئی مشکلات و مصائب کا وقت آتا تو جد و جہد سے ان مصیبتوں کا تدارک کرنے کی بجائے قبروں پر جا کر سو جاتے اور بزرگوں سے مدد و استمداد کے طلب گار ہوتے تھے ۔ مولف مرقع دہلی شاہ ترکمان کے بارے میں تحریر کرتے ہیں :

" ----- ۲۳ رجب کو عرس ہوتا ہے ۔ خادم اور معتقد عرس کے دن مناسب آئین کے مطابق اہتمام کرتے ہیں ۔ کثرت چراغاں اور قنادیل کی وجہ سے صحن فلک نورانی معلوم ہوتا ہے ------ اہل دہلی کو اس مزار سے بہت عقیدت ہے ۔ وہ اپنی مشکلات میں اس روضہ شریف سے مدد چاہتے ہیں " ۔[2]

اسی طرح نواب صاحب نے " مرقع دہلی " میں قدم گاہ حضرت علی علیہ السلام " درگاہ قطب الاقطاب ، سلطان شمس الدین غازی ، سلطان المشائخ ، معشوق الٰہی ، نصیر الدین چراغ دہلی ، شاہ حسن رسول نما ، شاہ بایزید اللہ ، شاہ عزیز اللہ اور مرزا بیدل وغیرہ کے مزارات کا بھی ذکر کیا ہے ۔

---

۱ ۔ نواب درگاہ قلی خان ، مرقع دہلی ۔ ص، ۹

۲ ۔ ایضاً ۔ ص، ۸ ۔

جہاں بقول ان کے نور برستا ہے ۔ لوگ آرزوئیں اور تمنائیں لےکر جاتے ہیں اور مراد کے پھولوں سے اپنا دامن بھر کر واپس لوٹتے ہیں اور جن کے قریب دفن ہونے سے انسان جہنم کی آگ سے محفوظ ہو جاتا ہے ۔

اس کے علاوہ نواب صاحب نے اس دور کی گمنام بزرگ ہستیوں کا ذکر بھی کیا ہے ۔ نواب صاحب حافظ شاہ سعد اللہ کے بارے میں لکھتے ہیں :

"بہت بلند مرتبہ بزرگ ہیں ، لوگ انہیں ولی سمجھتے ہیں
----- مشہور ہے کہ قطبیت کے درجہ تک پہنچ گئے ہیں ۔
آپ کی کرامت مشہور ہے کہ آپ نے بہت سے اندھوں کو
بینائی بخشی ہے ۔ صاف دل اور روشن ضمیر ہیں -----
نقش بندی سلسلے سے بیعت ہیں ۔ اس لیے سماع سے دلچسپی
نہیں رکھتے " ۔[1]

ایک اور بزرگ ہستی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"شاہ غلام محمد داول پورہ بھی بارعب اور برگزیدہ ہستی ہیں ۔
اکثر روزے رکھتے ہیں ۔ بہت دبلے پتلے اور کمزور جسم کے ہیں ۔
----- کسی سے کچھ نہیں لیتے ۔ اگر کبھی کوئی نذرانہ قبول بھی
کرتے ہیں تو حاضرین میں تقسیم کر دیتے ہیں ۔ رات کو کھچڑی کھاتے
ہیں اور کبھی تنہا نہیں کھاتے ۔ قوالی بہت سنتے ہیں ۔ محمد شاہ
بادشاہ نے بہت کوشش کی کہ یہ وظیفہ قبول کر لیں مگر انہوں نے صاف انکار کیا" ۔[2]

ان بزرگ ہستیوں کے علاوہ انہوں نے شاہ محمد ، شاہ پانصد مستی ، میر سید محمد ، مجنوں نانک شاہی ، شاہ غلام محمد اور شاہ رحمت اللہ کا ذکر بھی بہت اچھے اور خوبصورت پیرائے میں کیا ہے ۔

---

۱ ۔ نواب درگاہ قلی خان ، مرقع دہلی ، ص ۱۹،

۲ ۔ ایضاً ۔ ص ، ۲۰

شاہ کمال جیسی بزرگ ہستی کے بارے میں رقمطراز ہیں :

"شاہ کمال بڑے رنگین مزاج اور شوخ طبیعت بزرگ ہیں ۔ اعلی سے اعلی باریک کپڑا پہنتے ہیں ۔ خورد و نوش میں بڑا تکلف اور اہتمام کرتے ہیں ----- حال و قال کی مجلسوں اور بزرگوں کے عرسوں میں بڑی پابندی سے شریک ہوتے ہیں اور عجیب و غریب حرکتیں کرتے ہیں ----- فارسی کے بے انتہا اشعار یاد ہیں اور ریختہ گوئی میں کمال حاصل ہے"۔[1]

متذکرہ بالا صوفیوں اور بزرگان دین کے مزارات اسی دور میں خانقاہی نظام کو نقطہ عروج پر ظاہر کرتے ہیں ۔ تلاش معاش میں سرگرداں لوگ حالات سے بچتے بچاتے کھیتی باڑی ، تجارت اور نوکری کا خیال ترک کر کے ان خانقاہوں میں کچھ دیر کے لیے یاد الٰہی میں مصروف ہو جاتے یا پھر وہ باصلاحیت طبقہ جو درباری سازشوں ، بدنظمی اور بادشاہ کی امور سلطنت کے علاوہ دوسری دلچسپیوں کو دیکھتے ہوئے عام زندگی سے بدظن ہو جاتا اور نتیجتاً خانقاہوں کا رخ کرتا ، ان لوگوں کو خانقاہوں پر تعلیم دی جاتی تھی کہ یہ دنیا ایک قحبہ خانہ ہے ، جہاں سے ہر انسان کو پہلو تہی کرنی چاہیئے ۔ ان تمام امور پر غور کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان بزرگوں ، خانقاہوں اور مزاروں کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا باعث اس ملک کے سیاسی اور اقتصادی حالات تھے ۔

گویا ایک طرف تو امراء و سلاطین کی عیش و نشاط کی محفلیں اور دوسری طرف کچھ طبقوں کا صوفیاء اور فقہاء کی طرف مائل ہو کر مزارات اور غیر مذہبی رسوم کا سہارا لیتے ہوئے خود کو فراموش کر دینا ، یہ فرار کے دو ایسے انتہائی راستے تھے ، جو بعض صورتوں میں یکجا ہو جاتے تھے ۔

بادشاہ امراء و روسا دنیا بھر کی عیش و نشاط کی محفلوں میں گم ہوتے ہوئے بھی

---

۱ ۔ نواب درگاہ قلی خان ، مرقع دہلی ۔ ص ، ۲۵

صوفیاء کی عزت و احترام کرتے اور ان کی دعاؤں کے طلب گار ہوتے کیونکہ وہ اخروی زندگی میں نجات کا بھی ایک راستہ سمجھتے تھے ۔ پھر بادشاہ دعا گوئی کے صلے کے طور پر مدد معاش کے بہانے ان کو جاگیریں ، منصب ، انعام و اکرام اور خطابات سے نوازتے ۔ اس طرح سے جب تصوّف کی مقبولیت اور ہردلعزیزی میں اضافہ ہوتا گیا ۔ تو عیار اور مکار لوگ اس کو ذریعہ معاش بنا کر عوام و خواص کی عقیدت سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگے ۔ اس عہد میں تصوف کا یہ فلسفہ وحدت الوجود کا فلسفہ تھا ، لہذا اس فلسفے نے حرم اور بت کدے کی درمیانی حدود ختم کر دیں ۔ اس طرح لوگ خدا اور اپنی ذات دونوں کو بیک وقت خوش رکھنے کی کوشش کرتے ۔ سعادت خاں ناصر کا بیان ہے کہ :

"شاہ عالم خواجہ میر درد کے ہاں حاضر ہوتا تھا" ۔[1]

صاحب سیر المتاخرین لکھتے ہیں کہ :

"آخری عمر میں محمد شاہ رنگیلا فقیروں کی صحبت میں خوش رہتا ۔ اور انہی کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا ۔ محمد شاہ کو درویشوں کے ساتھ اتنی ارادت تھی کہ اس نے شاہ مبارک کو برہان الطریقت ، شاہ بڑھا کو برہان الحقیقت اور شاہ رمز کو فصیح البیان کے خطابات دیے تھے" ۔[2]

عالمگیر ثانی بھی صوفیاء کے ساتھ بہت عقیدت رکھتا تھا ۔ اس کی اس ضعیف الاعتقادی کی وجہ سے فیروز شاہ کے کوٹلہ میں کسی برگزیدہ درویش سے ملاقات کے بہانے لے جا کر قتل کر دیا گیا ۔

چنانچہ فرار کی ان دونوں انتہائی راہوں کے آپس میں مل جانے کی وجہ سے سماجی زندگی میں بے اعتدالی اور بے راہ روی پیدا ہو گئی ۔ درگاہ قلی خاں نے ایسے بہت سے عرسوں اور میلوں کا ذکر کیا ہے ۔ دہلی میں سرائے خواجہ بسنت اسد خلی کے قریب کسی ماگل نامی بزرگ کا

---

۱ ۔ سعادت علی خاں ناصر ، تذکرہ خوش معرکہ زیبا ۔ ص ، ۱۸۰

۲ ۔ ڈاکٹر خلیق انجم ، مرزا محمد رفیع سودا ۔ ص ، ۲۸

کا مزار تھا ۔ اس مزار پر ہر ماہ عرس ہوتا تھا ۔ نواب صاحب اسکے بارے میں لکھتے ہیں :

"ہر مہینے کی ساتویں تاریخ کو عاشق مزاج عورتیں خوب بن ٹھن کر جوق در جوق اس مزار کی زیارت کو آتی ہیں ۔ حقیقت میں آنے کا مقصد دوسرا ہوتا ہے ۔ وہاں سیر و تفریح کرتی ہیں اور اپنے عاشقوں سے مل کر داد عیش دیتی ہیں ۔ اکثر اہل تجرید اور غریب پیشگان وہاں طرح طرح کے خوبصورت لباس پہن کر آتے ہیں تاکہ کوئی عورت انہیں قبول کرے ----- اگر کوئی اجنبی اسی نزہت کدے میں وارد ہو تو اسے اپنا جوڑا فوراً مل جاتا ہے ۔ یہاں اتنے تماشائی ہوتے ہیں کہ اس آبادی کی وسعت چیونٹی کی آنکھ سے بھی تنگ ہو جاتی ہے"۔ [1]

دہلی کے ایک امیرزادے اپنے والد میر مشرف کا عرس کرتے ہیں ۔ عرس تو ایک بہانہ تھا ۔ حقیقت میں داد عیش و انبساط دینا مقصود ہوتا تھا ۔ نواب صاحب اس عرس کے بارے میں لکھتے ہیں :

"میر مشرف کا لڑکا میر کلو بڑے طمطراق اور عجیب شان سے اپنے والد کا عرس کرتا ہے ----- بادشاہ کے دربار کے تمام امراء اور ارباب نشاط کو دعوت دیتا ہے ۔ صلائے عام ہوتی ہے ۔ چونکہ خود نوجوان تھے اور تمام رنگین طبیعت والے امیرزادے اس سے آشنا ہیں ۔ اس لیے سب اس کی خاطر ساز و نشاط اور سامان انبساط کے ساتھ آتے ہیں اور اپنی معشوقاؤں کو ساتھ لاتے ہیں ۔ ہر باغ میں ، ہر درخت اور ہر پودے کے سائے میں اور چمن کے ہر گوشہ میں رعنا کے پھولوں کی طرح رنگا رنگ خیمے استادہ کرتے ہیں ۔ شراب شروع ہو جاتی ہے۔

---

۱ ۔ نواب درگاہ قلی خان ، مرقع دہلی ۔ ص ، ۳۹

تمام رات ہر طرف رقص اور ہر طرف سرود ہوتا ہے۔ طرح طرح کے کھانے مہمانوں کے رتبہ کے مطابق ان کی جگہوں پر پہنچتے ہیں۔ رات شب برات مطلع الانوار کی طرح اور صبح عید ہزار رنگ کی طرح ہوتی ہے۔ مشتہیات اور مرغوبات نفسانی میں جس چیز کی خواہش کرو، وہاں موجود ہے"۔[1]

مذہب اور جنسی بے راہ روی کو جس طرح ایک دوسرے میں ضم کر دیا گیا تھا، اسکی مکمل تصویر خلد منزل کے عرس میں ملتی ہے۔ نواب صاحب لکھتے ہیں :

"۲۳ محرم الحرام کو عرس مذکور (خلد منزل) ترتیب دیا جاتا ہے۔ خلد منزل کی قبر قطب الاقطاب کے جوار میں ہے۔ مہر پرور جو خلد منزل کی زوجہ ہیں، حیات خان خاطر کے اہتمام سے ایک ماہ پہلے چراغان بندی کی تنزئین و ترتیب کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں۔ چراغوں سے طرح طرح کی شکلیں بنائی جاتی ہیں۔ معمار اور بادشاہ کے ملازم صنعت پیشہ عجیب و غریب شبیہیں کرتے ہیں اور طرح طرح کے ہنر دکھاتے ہیں۔ سرو چراغاں کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ چنار کے درخت کی طرح، سرو شمشاد بھی شرم سے جلنے لگتے ہیں اور درختوں کو روشنی سے اس طرح سجاتے ہیں کہ درخت آفتاب کے چراغ کو گل کر دیتا ہے، جورات کو دو گھڑی تک مطلع کے دریچہ سے اپنا سر باہر نہیں نکالتا ---- ہر گوشہ اور ہر کنار میں روشنیوں سے بھرے ہوئے بنگلے وادی ایمن کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ہر گوشہ اور ہر کنار میں لوگ اپنی محبوبوں کی بغل میں ہاتھ ڈالتے اور ہر

۱۔ نواب درگاہ قلی خان، مرقع دہلی - ص ۱۲۰، ۱۲۰

کوچہ و بازار میں عیاش لوگ نفسانی خواہشات سے لبریز برہنہ رقص کرتے پھرتے ہیں - بے خوار محتسب سے بے خوف ہو کر سبد مستی کی تلاش میں گھومتے ہیں - شہوت پرست کسی بھی مزاحمت سے بے خوف شاہد پرستی میں سرگرم نظر آتے ہیں - نوخط امرد ایسے کہ زاہدوں کی توبہ ٹوٹ جائے - عشق بے مثال کے ساتھ ایسے آہو کہ صلاح اور نیکی کی بنیادیں ہل جائیں - ------ کوچہ اور بازار دراہیں ، شریفوں اور امیروں سے اور گوشہ و کنار شر انگیز امیروں اور فقیروں سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں - یہاں مطرب و قوال مکھیوں سے زیادہ اور محتاج اور فقیر مچھروں سے افزوں ہیں - قصہ مختصر اس ترتیب وضع و شہرت کے ساتھ یہ نفسانی خواہشات کا دیار سجایا جاتا ہے اور جسمانی لذتیں حاصل کی جاتی ہیں "۔[1]

یہ مزارات ، عرس ، میلے ، ہوس کاریاں ایسی ناقص اور کمزور عمارات تھیں ، جنہیں ایک نہ ایک دن تو مسمار ہونا ہی تھا - دیکھتے ہی دیکھتے عیش و نشاط کی یہ محفلیں دہلی میں انگریزی حکومت کے قائم ہونے پر درہم برہم ہو گئیں اور یہیں پر عظیم الشان مغلیہ حکومت کی تاریخ کا آخری باب ختم ہو جاتا ہے -

بادشاہ اور عوام انفرادی اور اجتماعی فرائض اور ذمہ داریوں کو بھلا کر رامش رنگ و بو میں ڈوبے ہوئے تھے - گویا اس خود فراموشی کی کوشش میں انہوں نے مذہب کی صحیح شکل و صورت بھی مسخ کر دی تھی - لیکن ابتری ، بدنظمی اور خونریزی کے اس دور میں جب کہ سلطنت دہلی کا ٹمٹاتا ہوا چراغ فتنوں کی آندھی سے بجھ گیا تھا ، ان تباہیوں کے دور میں بھی فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے قرآن اور سنت پر عمل کرنے والے کچھ مصلحین قوم موجود تھے - قوم کی اصلاح کا بیڑا

---

۱ - نواب درگاہ قلی خان ، مرقع دہلی - ص ، ۱۱ ، ۱۲

اٹھارہویں صدی میں شاہ ولی اللہ دہلوی پیش پیش تھے ۔ اس دور میں شاہ ولی اللہ مسلمانان ہند کو مذہبی واخلاقی درماندگی سے نجات دلانے کے لیے جہاد بالقلم میں مصروف ہوگئے ۔ اور اپنے شاگردوں کو مختلف علومی مدارس میں درس و تدریس کے کام پر مامور کر دیا ۔

بادشاہ و امراء اور عوام کے درمیان شیعہ سنّی عقائد کا نزاع شروع ہو چکا تھا ۔ یہ جھگڑا بہادر شاہ اوّل کے عہد سے شروع ہوکر سادات بارھہ اور فرخ سیر کے دور حکومت میں زیادہ زور پکڑ گیا ۔ نادر شاہ (ایرانی شیعہ) کے ہندوستان میں وارد ہونے سے شیعہ عقائد رکھنے والوں کا شیعہ مذہب اور پختہ ہوگیا تھا ۔ متشدد سنّی ، شیعہ حضرات کو عموماً دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے تھے ۔ شاہ صاحب نے ان دونوں فرقوں کے بنیادی جھگڑوں کو سلجھانے اور اختلاف کو فرو کرنے کے لیے پہلے اس تصوّر کو باطل قرار دیا کہ شیعہ زمرۂ اسلام سے خارج ہیں ۔ پھر آپ نے خلفائے راشدین کی خلافت کے اثبات اور اسلام کے اصول عمرانی پر اپنی معرکۃ الاراء تصنیف " ازالۃ الخفاء عن خلافت الخلفاء " تحریر کرکے شیعوں کے فروعی اختلاف کو دور کرتے ہوئے بے معنی و بے حاصل لڑائیوں کی بیخ کنی کی ۔

شاہ ولی اللہ نے معاشرتی اصلاح کی خاطر سلاطین ، امراء ، ارکان دولت ، ملازمت پیشہ ، اہل صنعت و حرفت ، علماء و مشائخ اور صوفیاء کے طبقات کو الگ الگ مواعظ و نصائح کیں ۔ مسلم معاشرہ طرح طرح کی ہندو رسوم و توہمات میں مبتلا تھا ۔ ہندوؤں کی ہمسائیگی کی وجہ سے مسلمانوں میں عقیدہ وعمل کی خلاف وگمراہی راہ پا چکی تھی ۔ مسلمانوں پر ہندوؤں کے رسم و رواج کا اتنا اثر ہوا کہ انہوں نے ان تمام معاشرتی خرابیوں کو اپنا لیا ۔ جو مسلمانوں میں موجود نہیں تھیں ۔ مثلاً بیواؤں کی دوسری شادی نہ کرنا ۔ طلاق کو ناجائز سمجھنا ، بڑے بڑے مہر باندھنا ، خوشی اور غم کی تقریبوں پر محفل دکھاوے کی خاطر اسراف و فضول خرچی سے کام لینا ۔ چنانچہ شاہ صاحب نے اصلاح معاشرت کے لیے " تفہیمات الٰہیہ " لکھی جس میں تمام طبقات ملّت کے عیوب و نقائص کو صاف صاف تحریر کرتے ہوئے انہیں صراط مستقیم کی طرف دعوت دی ہے ۔ فرماتے ہیں ۔

"اے آدم کے بچو! تم نے ایسے بگڑے ہوئے رسوم اختیار کرلیے ہیں، جن سے دین کی اصلی صورت بگڑ گئی ہے ----- بری بری رسمیں تم میں جاری ہیں، جنہوں نے تمہاری زندگی تم پر تنگ کر دی ہے - ان رسموں میں تم اپنی دولت ضائع کرتے ہو، وقت برباد کرتے ہو اور جو صحت بخش روش تھی، اسے چھوڑ بیٹھے ہو"[1]-

مسلمانان ہند کی اخلاقی ومذہبی حالت اتنی ابتر ہو چکی تھی کہ صوفیوں، فقیہوں اور زاہدوں کو مسلم سوسائٹی میں عزت واحترام اور قدر و وقعت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا لیکن اب ان سے مسلم معاشرے کو فائدے کی بجائے نقصان پہنچ رہا تھا چنانچہ شاہ صاحب نے اس طبقہ کی بے راہ روی پر سخت نکتہ چینی کی ہے - فرماتے ہیں :

"زمانہ کا رنگ بالکل بدل گیا ہے اور مذہب کا چشمہ بہت مکدر ہوگیا ہے اور ہر پوشش جو مسلمانوں کو ظاہراً رونق دے رہی ہے، حقیقت میں اسلامی نہیں - تم پانچ طرح کے لوگوں سے اپنے آپ کو بچاؤ - ایک بے حیا صوفی، دوسرا جھگڑالو معقولی، تیسرا شیخی خور فقیہہ، چوتھا خشک زاہد، پانچواں سرکش مالدار"[2]-

شاہ صاحب اس طبقہ کو برابر تنبیہہ فرماتے رہے اور عوام کو اس کے ضرر رساں نتائج سے باخبر کرتے رہے حالانکہ یہ طبقہ کبھی واقعی مصدر فیوض وبرکات تھا لیکن اب اسی گروہ کی وجہ سے ہزاروں فتنوں نے ملک کو گھیر لیا تھا، جو اسلامی زندگی کے لیے مستقل طور پر خطرے کا الارم دے رہے تھے -

شاہ صاحب موجودہ تصوّف اور متصوفین کی ان حرکات وافعال سے سخت پریشان تھے کیونکہ یہ صوفی احکامِ خداوندی اور سنت رسول اللہ کی طرف دعوت دینے کی بجائے اپنی پرستش کے طالب،

۱- شاہ ولی اللہ، تفہیمات الٰہیہ - جلد اول - ص، ۲۸۷، ۲۸۸

۲- شیخ محمد اکرام، رود کوثر - ص، ۵۷۳ -

خود گم کردہ راہ اور دوسروں کو راہ ھدایت سے بھٹکانے والے ، اھل دین کی شکل وصورت میں حرص وھوس کے بندے ، دنیا کے پرستار اور دولت کے بھوکے تھے اور صرف تصوّف کے ذریعے سے امت مسلمہ کو راہ حق سے گمراہ کرتے تھے ۔ چنانچہ آپ نے اس سے بچنے کے لیے تصوف اور علوم اسرار وحقائق پر " خیر کثیر " اور " تفہیمات الہیہ " جیسی بلند پایہ کتب تصنیف کیں لہذا شاہ صاحب نے ان لوگوں کو بٹ مار ، دجال اور کذاب تک کہہ دیا ہے ۔ فرماتے ھیں :

" ـــــ اور اپنی مرضی کی پابندی کا لوگوں کو حکم دیتے ھیں یہ لوگ بٹ مار اور راھزن ھیں ۔ ان کا شمار دجالوں ، کذابوں ، فتنادیوں اور ان لوگوں میں سے ہے ، جو خود فتنہ اور آزمائش کا شکار ھیں "

پھر اسی خطاب میں عوام کو نصیحت فرماتے ھیں :

خبردار! " خبردار ! ھرگز اس گروہ کی پیروی نہ کرنا ، جو اللہ کی کتاب اور سنت کی طرف دعوت نہ دیتا ہو اور اپنی طرف بلاتا ہو کہ زبانی جمع وخرچ صوفیاء کرام کے اشاروں کے متعلق عام جلسوں میں نہ کہا جائے کیونکہ مقصد تو (تصوّف سے) صرف یہ ہے کہ آدمی کو احسان کا مقام حاصل ہوجائے "۔[1]

اس قول کی تائید قرآن پاک کے اس ارشاد سے ھوتی ہے ۔

" وانّ ھذا صراطی مستقیما فاتّبعوہ ولا تتّبعوا السّبل فتفرق بکم عن سبیلہ ذلکم وصّٰکم بہ لعلّکم تتّقون "۔[2]

شاہ صاحب نے اقتصادیات ومعاشیات کے مسائل پر " حجۃ اللہ البالغہ " اور بدور بازغہ " لکھیں ۔ " بدور بازغہ " میں " ابواب ارتفاقات " کے موضوع میں مالیات حکومت ، نظام عدل ، فوج ، پولیس ، حتّٰی کہ بلدیات وغیرہ کی تنظیم کے پورے طریقے پیش کیے ھیں ۔

۱۔ شاہ ولی اللہ ، تفہیمات الہیہ ۔ جلد اوّل ۔ ص ، ۲۸۲

۲۔ سورۃ انعام ۔ آیت نمبر ۱۵۳ ۔

"فیوض الحرمین" میں شاہ صاحب نے "تحقیق شریعت" کے عنوان سے ایک نہایت عمدہ بحث کی ہے، جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ رسول پاک کی زندگی امت مسلمہ کے لیے بہترین نمونہ ہے۔

شاہ ولی اللہ نے عربی زبان کی مشکلات کے پیش نظر قرآن پاک کا فارسی میں ترجمہ کیا تاکہ امت مسلمہ قرآنی تعلیمات سے استفادہ کرتے ہوئے راہ راست اختیار کریں۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے سیاسی، معاشرتی، معاشی اور مذہبی انحطاط کا سبب ہی یہ تھا کہ وہ قرآن پاک کو سمجھنے کی توفیق نہیں رکھتے تھے۔ شاہ صاحب اس زمانہ کے غلط کار علماء سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"اے بدعقلو، جنہوں نے اپنا نام علماء رکھ چھوڑا ہے تم یونانیوں کے علوم میں ڈوبے ہوئے ہو اور صرف و نحو میں غرق ہو۔ علم یا تو قرآن کی کسی آیت محکم کا نام ہے یا سنت ثابتہ قائمہ کا۔ چاہیئے کہ قرآن سیکھو۔ پہلے اس کے غریب لغات کو حل کرو۔ اس طرح جو حدیث رسول کریم صلعم کی صحیح ثابت ہو تو اسے محفوظ کرلو"۔[1]

گویا شاہ ولی اللہ نے اپنے گرد و پیش کا ایسا جائزہ لیا، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے دل میں معاشرے کی تباہی و بربادی کا درد و احساس شدت سے تھا۔ شاہ صاحب نے صرف مسلمانوں کی فکری، دینی اور اخلاقی اصلاح ہی کی طرف توجہ نہیں دی بلکہ وہ معاشی معاشرتی اور سیاسی راہنمائی میں بھی پیش پیش تھے۔

شاہ صاحب نے اٹھارویں صدی کے مسلمانوں کی روحانی، مذہبی، اخلاقی، فکری، سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی حالت کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ہر پہلو سے اصلاح کی کوشش کی۔ اسی سلسلے میں انہوں نے بے شمار کتب تصنیف کیں۔ اس دور میں بعض دوسرے علماء نے بھی اسلامی علوم اور معاشرے کی تعمیر نو میں حصہ لیا، جن میں سید غلام علی آزاد بلگرامی

۱۔ شاہ ولی اللہ، تفہیمات الٰہیہ۔ جلد اوّل۔ ص، ۲۸۲

سید مرتضی زبیدی بلگرامی ، مولوی سلام اللہ ، ملا نظام الدین بانی درس نظامیہ کے فرزند ملا عبدالعلی بحرالعلوم تھے ۔ ان کے علاوہ اس دور کے مشائخ وصوفیاء میں مرزا مظہر جانجاناں ، شاہ سعد اللہ گلشن ، شیخ فخرالدین ، سید قمرالدین دکنی ، میر ناصر عندلیب اور خواجہ میر درد بھی قابل ذکر ہیں ۔

اٹھارویں صدی عیسوی مسلمانان ہند کے سیاسی ، معاشی اور معاشرتی انحطاط کی صدی کہی جا سکتی ہے لیکن اسلامی اقدار کو قائم دائم رکھنے اور قوم وملت میں نئی روح پھونکنے کی تحریک کا آغاز شاہ ولی اللہ کے ہاتھوں ہوا ۔ اس تحریک نے مسلمانوں کے اخلاقی ومذہبی انحطاط کو روکنے میں بھرپور تعاون کیا ۔ شاہان مغلیہ اورنگ زیب کے بعد عیش پرستی اور فسق میں غرق ہوگئے تھے ۔ اس لیے امور سلطنت میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے تھے نتیجتاً سیاسی زوال کے ساتھ معاشی اور معاشرتی زوال روبہ پذیر ہونا تھا ۔ مغلیہ بادشاہوں کی لذت پرستی اور عیش وعشرت کے باعث فنون لطیفہ بھی فروغ پا رہے تھے ۔ محمد شاہ نے سیاست کے جھمیلوں سے دور رہنے کے لیے حیات بخش اور مہتاب باغ تعمیر کروائے تھے تاکہ سبزہ وگل سے دل بہلا سکے ۔ ایسے پرآشوب حالات میں علوم وفنون اور شعر وادب کے ماہرین اپنی زندگی اور ہنر سے دل برداشتہ ہوگئے تھے ۔ مغلیہ بادشاہوں میں سے اورنگ زیب کی وفات کے بعد سوائے بہادر شاہ ظفر کے کسی کے دربار سے کوئی شاعر وابستہ نہ رہا ۔ بہادر شاہ خود شاعر اور عالم تھا ۔ اس لیے اپنے دربار میں شعراء کی سرپرستی بھی کرتا تھا ۔ نواب بہادر خواجہ سرا کے قتل ہونے کے بعد میر تقی میر اور دوسرے شعراء بے روزگار ہوگئے ۔ عماد الملک کا اقبال ادبار میں تبدیل ہوا تو سودا اور دوسرے شعراء بے روزگار ہوگئے گویا ایسے نازک اور انقلاب آفریں دور میں شعراء ناکامی و نامرادی کے دن گزار رہے تھے ۔ شاعری کے ساتھ ساتھ فن موسیقی اور رقاصی بھی ترقی کے مدارج طے کرتے رہے ۔

محمد شاہ کے دربار کا مشہور گویّا نعمت خان تھا جو بعد میں سدا رنگ کے لقب سے مشہور ہوا ۔ اس نے محمد شاہ کے نام سے منسوب بہت سے خیال اور راگنیوں کے پیارے پیارے بول تجویز کیے تھے ۔

" سدا رنگ اور ادا رنگ نے خیال کی گائیکی کو اس قدر مرغوب خاطر بنایا کہ دھرپد کا رنگ پھیکا پڑگیا ۔ انہی دونوں استادوں کے بنائے ہوئے خیال گائے جاتے ہیں اور انہی کے راگ اب تک مستند مانے جاتے ہیں "۔[1]

نعمت خان بین نواز کے بارے میں صاحب مرقع دہلی کہتے ہیں :

" فن موسیقی کے ایجاد کرنے میں یگانۂ روزگار تھے ۔ موسیقی میں ایسی مہارت ہے کہ دہلی کے تمام مغنیوں کا سردار ہے ۔ سوائے شاہ وقت کے کسی کی فرمائش قبول نہیں کرتا ـــــــ ہر مہینے کی بارہ تاریخ کو خود ایک مجلس کرتا ہے جس میں دہلی کے امراء و رئیس شریک ہوتے ہیں ۔ ان مجلسوں کی مقبولیت اس درجہ ہے کہ لوگ صبح ہی سے آنے لگتے ہیں اور شام تک تل دھرنے کو جگہ نہیں رہتی جب نعمت خان بین بجاتا ہے ، تو لوگ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتے ہیں اور بے حال ہوجاتے ہیں "۔[2]

ان کے علاوہ تاج خان قوال ، اس کے دونوں بیٹے جانی و غلام رسول ، باقر طنبورچی حسن خان ربابی ، غلام محمد سارنگی نواز ، رحیم سین اور تان سین ، قاسم علی ، معین الدین قوال ، برہانی قوال ، حسین خان ڈھولک نواز ، شاہ درویش سوچہ نواز ، شجاعت خان کلاونت ، ابراہیم خان کلاونت اور شہباز دھمدمے نواز کا ذکر بھی بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے ۔

مندرجہ بالا موسیقاروں کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اٹھارویں صدی میں مغل دربار کے گرد موسیقی کا ایک نیا دبستان پرورش پا گیا تھا ۔

---

۱ ۔ ڈاکٹر محمد حسن ، اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر ۔ ص ، ۳۲
۲ ۔ نواب درگاہ قلی خان ، مرقع دہلی ۔ ص ، ۵۵

موسیقی کے ساتھ ہندوستانی رقص میں بھی تغیر و تبدل ہوا - فن رقص نے ہندی دیوی دیوتاؤں سے اپنا ناطہ توڑ کر مندروں کی فضا سے آزادی حاصل کرلی اور رقص اور مجرا نے درباری رنگ اختیار کرلیا - اس عہد میں طوائفوں کی پوری قوم وجود میں آگئی تھی - ہندوستان کا کوئی حصّہ بھی ان کے وجود سے پاک و صاف نہیں تھا - نواب صاحب نے مرقع دہلی میں اس زمانے کی بے شمار طوائفوں کے حالات بیان کیے ہیں ، جن میں نوربائی ، چمنی ، ادبیگم کمال بائی اور بھیسا شے فیل سوار زیادہ مشہور ہیں - اس صدی میں رقص اتنے عروج پر پہنچ گیا تھا کہ نادر شاہ جیسا پردیسی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا -

جہاں تک مصوّری کا تعلق ہے - مغل اسلوب مصوّری اورنگ زیب کے آخری دور ہی سے توازن اور تناسب سے انحراف کرنے لگا تھا - اسکی ایک شہادت ہمیں برنئیر کے سفرنامے سے ملتی ہے - وہ لکھتا ہے :

"ہندوستانی مصوّروں کے یہاں جو چیز کھٹکتی ہے ، وہ یہ کہ
ان کے بنائے ہوئے چہرے بڑے غیر متناسب ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی
ذہین مصور ان مصوروں کو ان نقائص سے آگاہ کر دے تو ان کی تصویریں
بہت خوبصورت بن جائیں " -[1]

مصوّری میں بھی حسن کاری اور نشاط کا پہلو پیش نظر رکھا جاتا تھا - محمد شاہ کے عہد تک فن مصوری میں ایرانی اور ہندوستانی اثرات یکجا رہے لیکن آہستہ آہستہ اس میں اصل روح ہندوستانی ہوتی جا رہی تھی اور ایرانی فن مصوّری ہندوستان سے ختم ہو رہا تھا -

---

١- ڈاکٹر محمد حسن ، اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر - ص، ٣٢

باب — دوم

(حصۂ اوّل)

شاہ ولی اللہ کے حالات زندگی

88 - 70

سلسلۂ نسب شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ، آباؤ اجداد ،
پیدائش ، تعلیم و تربیت ، حج بیت اللہ ، قرآن پاک
کا فارسی ترجمہ ، اعتراف عظمت ، تصانیف ، وفات ، اولاد

حضرت شاہ ولی اللہ کے حالات زندگی

حضرت قطب الدین احمد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ، حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت سے اسی سال بعد اور سرمایہ ملت کے نگہبان اور دین مقدس کے غیور خادم محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کی وفات ۱۷۰۷ء سے چار سال قبل (۲ شوال 1112ھ فروری ۱۷۰۳ء مین) ہو یی کے ضلع مظفر نگر کے ایک قصبہ "پھلت" مین پیدا ہوئے۔ جہالت اور خود غرضی کے اس تاریک دور مین ایک طرف لوگ حق وانصاف اور مذہب واخلاق سے بہت دور ہٹ چکے تھے تو دوسری طرف خارجی اور داخلی قوتین مسلمانون کی باہمی نا اتفاقیون اور گروہ بندیون سے فائدہ اٹھا کر دین اسلام اور حکومت پر ڈاکے ڈال رہی تھین ۔ اس وقت شدت سے یہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ کوئی جلیل القدر مرد مجاہد اور عظیم مفکر پیدا ہو جو اسلام کے نظام عقائد کے احیاء اور مسلم معاشرے کی معقول تربیت واصلاح کے لئے انقلابی روح پھونکے چنانچہ بدنظمی اور انتشار وخلفشار کے اس دور مین زبون حالی اور بگڑے ہوئے حالات کے خطرناک نتائج کو دوررس نگاہون سے دیکھنے والی شاہ ولی اللہ کی ذات ستودہ صفات تھی ۔ جو معرفت الٰہی کے عارف کامل ، شرعی علوم مین محقق امام اور حکمت عملی کے میدان کے شاہسوار تھے ۔ آپ برصغیر مین محی السنت ، وارث کمالات نبوت اور حجۃ الاسلام ثابت ہوئے ۔ جن کے فیوض وکمالات سے ملک وملت اور نظام اسلام کو حیات تازہ حاصل ہوئی ۔ علم معرفت کے اس منبع نے پرآشوب دور اور دردناک حالات مین پیام محمدی کی از سرنو تجدید کا بیڑا اٹھایا ۔ گویا موصوف کا سب سے بڑا کارنامہ مسلمانون کی اجتماعی زندگی کی تنظیم و اصلاح تھی ۔

مولانا شبلی نعمانی تاریخ علم الکلام مین رقمطراز ہین :

" ابن تیمیہ اور ابن رشد کے بعد بلکہ خود انہی کے زمانہ مین مسلمانون مین جو عقلی تنزّل شروع ہوا ۔ اس کے لحاظ سے یہ امید نہین رہی تھی

کہ پھر کوئی صاحب دل و دماغ پیدا ہوگا لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھلانا تھا کہ آخیر زمانہ میں جب کہ اسلام کا نفس بازپسیں تھا ، شاہ ولی اللہ جیسا شخص پیدا ہوا ، جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی ، رازی اور ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے "۔[1]

گویا سترھویں صدی عیسوی کے تاریک اور حوصلہ شکن دور میں ھند کی اسلامی تاریخ میں ایک عظیم مفکر اور مجدّد پیدا ہوتا ہے جسکی بلند اور دستگاہِ دوررس غزالی اور ابن رشد کو بھی مات کر دیتی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کا سلسلہ نسب والد بزرگوار کی طرف سے امیر المومنین سیدنا عمر بن الخطاب اور والدہ محترمہ کی جانب سے حضرت امام موسی کاظم سے جا ملتا ہے۔ جس کی توضیح آپ نے بخصوص رسالہ " امداد فی ماثر الاجداد " میں اس طرح فرمائی ہے۔

" سلسلہ نسب این فقیر بامیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالی عنہ میرسد باین طریق فقیر ولی اللہ ابن الشیخ عبدالرحیم بن الشہید وجیہہ الدین بن معظّم بن منصور بن احمد بن محمود بن قوام الدین عرف قاضی قاڈن بن قاضی قاسم بن قاضی کبیر عرف قاضی بدھ بن عبدالملک بن قطب الدین بن کمال الدین بن شمس الدین مفتی بن شیر ملک بن محمد عطاء ملک بن ابوالفتح ملک بن محمد عمر حاکم ملک بن عادل ملک بن فاروق بن جرجیس بن احمد بن محمد شہریار بن عثمان بن ماہان بن ھمایون بن قریش بن سلیمان بن عفّان بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالی عنہم اجمعین "۔[2]

اسلامی حکومت کے آغاز میں ھندوستان میں وارد ہونے والے اس خاندان کے پہلے بزرگ شمس الدین مفتی رُھتک تھے ، مفتی کو آپ کے بڑے بیٹے کمال الدین مفتی اور ان کے بعد شیخ عبدالملک ،

۱۔ مولانا شبلی نعمانی ، تاریخ علم الکلام ۔ ص ،۸۷

۲۔ شاہ ولی اللہ ، امداد فی ماثر الاجداد ۔ ص، ۱۵۲

قاضی کبیر الدین ، قاضی قاسم اور سب سے آخر میں قاضی قوام الدین حسرت قانون بدستور اسی منصب جلیلہ پر فائز رہے ۔ قاضی قوام الدین کے بیٹے محمد کی شادی سونی پت کے سادات میں ہوئی لیکن ان کے صاحبزادے شیخ احمد جوانی میں رہتک لوٹ آئے تھے ۔ شیخ احمد کے صاحبزادے منصور اور پوتے شیخ معظّم بھی جلالت علمی میں بلند پایہ تھے ۔ شیخ معظّم کے بیٹے شیخ وجیہ الدین (شاہ ولی اللہ کے دادا) نامور عالم دین اور صاحب دل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہادر سپاہی بھی تھے ۔ شاہ وجیہ الدین کے فرزند شیخ عبدالرحیم اپنے وقت کے متبحّر عالم ، سچے صوفی اور قناعت پسند بزرگ ہونے کے علاوہ ظاہری و باطنی علوم کے حامل اور دنیاوی عقل و فراست میں یکتائے روزگار تھے ۔ آپ دربار شاہی سے الگ تھلگ رہ کر درس و ارشاد میں مصروف رہتے تھے ۔ حکومت ہند کے آخری سیاستدان بادشاہ اور دین کی تجدید کرنے والے اجتماع کے بانی اورنگ زیب عالمگیر نے فقہ حنفی کی جامع کتاب " فتاوی عالمگیری " کی ترتیب و تدوین میں تعاون کی دعوت دی جسے آپ نے دینی خدمت سمجھ کر قبول کرلیا ۔ گویا اس خاندان کا ہر فرد آسمان علم کا مہر جہان تاب تھا ۔ حقیقت میں حضرت حکیم الامت ، مجدّد ملت شاہ ولی اللہ اپنے علمی تبحّر ، فضل و کمال ، حسن لیاقت ، شہرت عام اور خدا داد قابلیت کے لحاظ سے اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے ۔ اگرچہ اس جلیل القدر خاندان کا ہر فرد فاضل اور عالم تھا لیکن اس کے گزشتہ امتیاز و اقتدار کو قائم رکھنے اور ان میں ایک نئی جلا پھونکنے میں پیش پیش شاہ ولی اللہ تھے ۔

شاہ صاحب نے آئندہ نسلوں کی کامیابی کے لیے ایک ایسا بیج بویا جو بعد ازاں ان کی انتھک کوششوں سے پھلا پھولا اور لہلہایا ۔ لہذا اس شریف و نجیب خاندان کو دوسرے علمی خاندان پر فضیلت و ترجیح بھی آپ ہی کے طفیل نصیب ہوئی ۔

حضرت شاہ صاحب بچپن سے ہی ذہین و فطین ، قوی الحافظہ ، شریف و سنجیدہ اور بزرگانہ متانت کے حامل تھے ۔ سات سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد فارسی اور عربی کی کتب پڑھنے کے ساتھ ساتھ مذہبی ارکان و فرائض (نماز ۔ روزہ) بھی تدریجاً سیکھ لیے ۔ دس سال کی عمر میں فارسی کی نوشت و خواند میں مہارت حاصل کرکے " شرح ملّا جامی " اور

"شرح السکافیہ" تک پہنچ گئے تھے۔ اپنی ذہانت و ذکاوت طبع کے باعث صرف ونحو پر عبور حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ پندرہ سال کی عمر میں تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد، کلام اور منطق وغیرہم کی تعلیم سے فراغت حاصل کی اور ان تمام علوم میں متعدّد کتب ورسائل کا مطالعہ کیا۔

بعد ازاں نجابت وپاک دامنی کو قائم رکھنے کے لیے سنت محمدیہ پر عمل کرتے ہوئے آپ کی شادی کر دی گئی۔ والد بزرگوار نے مختلف امراض کے غلبے کے باعث آپ کو بیعت وارشاد کے ساتھ مسند تدریس پر متمکن ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ والد بزرگوار کی وفات کے بعد آپ مسند درس وتدریس پر فائز ہوکر بارہ سال تک کتب دینیہ اور معقولات (فلسفہ و منطق) کا درس دیتے رہے جیسا کہ آپ نے خود انفاس العارفین میں فرمایا ہے:

"بعد از وفات حضرت ایشان دوازدہ سال کما بیش بدرس کتب دینیہ وعقلیہ مواظبت نمود ودر ہر علمی خوض واقع شد"۔[1]

شاہ ولی اللہ علماً وعملاً ایک عظیم مفکر اور مسلم الثبوت مجدّد تھے۔ ہندوستان کے عوام وخواص اوراس عہد کے بڑے بڑے استاد اور ماہرین فن آپ سے مستفید ہوتے رہے "مدرسہ رحیمیہ" میں بارہ سال تک درس و تدریس میں مشغول رہنے کے باعث ۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۱ء میں زیارت حرمین شریفین سے سعادت اندوز ہونے کا شوق دل میں جاگزیں ہوا۔ اس بارے میں خود ارشاد فرماتے ہیں:

"بعد ازاں دوازدہ سال شوق زیارت حرمین محترمین در سرافتادہ"۔[2]

لہٰذا ۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۱ء کے آخر میں بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہوکر اور ۱۱۴۴ھ / ۱۷۳۲ء میں پورے ایک سال تک مقدمات مقدّسہ کی مجاورت سے ممتاز ہوکر اپنی تعلیم کو مکمل کیا۔ اس اثناء میں دربار قدسی سے آپ پر فیوض وبرکات کی بے انتہا بارش ہوئی۔ سفر حرمین کے دوران میں مدینہ منورہ اورمکہ معظمہ کے نامور اساتذہ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ پھرنبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک کی زیارت سے واپسی پر شیخ ابراھیم بن الحسن المدنی سے حدیث مسلسل کی بھی سند و اجازت حاصل کی۔

۱۔ شاہ ولی اللہ، الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف ۔ ص، ۵
۲۔ ایضاً ۔ ص، ۵ ۔

۱۱۴۴ھ / ۱۷۳۲ء کے آخر میں فریضۂ حج سے مشرف ہو کر اوائل ۱۱۴۵ھ / ۱۷۳۲ء میں ۱۴ رجب بروز جمعہ صحت و سلامتی کے ساتھ وطن مالوف پہنچ کر بدستور والد ماجد کے مدرسہ رحیمیہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا ۔ سفرِ حج سے قبل تقریباً انتیس سال کی عمر تک شاہ صاحب تصنیف و تالیف کی بجائے درس و تدریس میں ہی مصروف رہے لیکن اب آپ کا تمام وقت درس و تدریس ، ترویج کتب و سنت ، تلقین معارف و حقائق ، مطالعہ کتب اور تصنیف و تالیف میں گزرتا تھا ۔

حجاز سے واپسی کے بعد تقریباً ۲۲ برس کی عمر میں آپ نے تجدید و احیائے دین کے کام کا آغاز کیا ۔ ابھی اصلاحی کام کو شروع کیے ہوئے بمشکل چار سال ہوئے ہوں گے کہ نادر شاہ کے حملے نے ہندوستان کو عموماً اور دارالسلطنت دہلی کو خصوصاً زیر و زبر کر دیا ۔ اس دوران میں مسلمانوں کی بے حسی ، بے حمیتی اور بے غیرتی انتہاؤں کو چھو رہی تھی ۔ جیسا کہ باب اوّل کے تحت تفصیلاً بیان کر دیا گیا ہے ۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے کوئی عملی تحریک تو شروع نہ کی بلکہ ایک طویل عرصے تک تعلیم و تربیت کے حلقوں کے ذریعے ان کے دلوں کا میل اور دماغوں کا زنگ اتارنے کا ارادہ کیا ۔

برصغیر میں عرصہ دراز سے ہندی مسلمانوں کا یہ طریق کار چلا آ رہا تھا کہ وہ قرآن پاک کی تلاوت محض کاروباری برکت کے لیے کرتے یا پھر قرآن پاک کو قسمیں اٹھانے کے لیے استعمال کرتے ۔ ہندوستان کے مروجہ نصاب یعنی درس نظامی میں قرآن مجید اور اس کی تفسیر کو کوئی حیثیت حاصل نہیں تھی ۔ حدیث کے علوم اور درس و تدریس کو بالکل اہمیت نہیں دی جاتی تھی ۔ فقہ میں مذاہب اربعہ کی کھینچ تان اور باہمی تعصّب کا دور دورہ تھا ۔ اجتہاد کا نام و نشان تک نہیں تھا ۔ اخلاق کے بندھن کمزور ہو چکے تھے ۔ عوام اوہام پرستی ، انتہائی گمراہی اور تباہی و بربادی کے راستے پر گامزن تھے ۔ علماء و مشائخ نے شریعت و طریقت دونوں کو کھیل بنا رکھا تھا ۔

حجاز سے واپسی کے بعد شاہ صاحب کی سیاسی تحریک کا پہلا قدم قرآن پاک کا فارسی ترجمہ اور اس کی مختصر شرح تھی جس پر علمائے ہند کی برہمی ارادہ قتل کی صورت میں آشکار ہوئی ۔ شاہ ولی اللہ نے اپنی دینی یا سیاسی تحریک کے لیے قرآن کریم کو مشعل راہ بنایا ۔ شاہ صاحب نے اپنی تحریک کی بنیاد بھی قرآن شریف کی اس آیت کو بنایا :

" اولم یروا انا ناتی الارض ننقصها من اطرافها " ۔[1]

قرآن پاک کا یہ ترجمہ لفظی و معنوی صحت اور احتیاط کے اعتبار سے اب تک بے مثال ہے ۔ شاہ ولی اللہ نے علم تفسیر پر بھی بہت سی کتابیں تصنیف کیں ، جن میں " الفوز الکبیر فی اصول التفسیر " بہت کار آمد اور مشہور کتاب ہے ۔ اس کتاب میں شاہ صاحب نے نسخ آیات ۔ " روایات اسرائیلی اور رسوم جاہلیت کے بارے میں بھی راہ راست دکھائی اور اس تفسیر سے فہم قرآن میں جو الجھنیں اور رکاوٹیں تھیں ، دور ہوگئیں ۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بعد علم حدیث کا ذوق وشوق بھی جاتا رہا تھا ۔ شاہ ولی اللہ نے اس کو مسلمانوں کی اخلاقی وروحانی اصلاح کے لیے از سر نوزندہ کیا ۔ شاہ صاحب نے سفر حجاز کے دوران میں بہترین اور جلیل القدر اساتذہ سے علوم حدیث کی سند بھی حاصل کی ۔ حدیث رسول اللہ کی برتر افادیت اور دلکشی کا آپ کے دل پر بہت اثر تھا ۔ ملفوظات میں شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں :

" کہ علم حدیث از مدینہ آورد پدرم وقت رخصت از مدینہ استاد خود عرض کرد داد خوش شد کہ ہرچہ خواندہ بودم فراموش کردم الا علم دین یعنی حدیث " ۔[2]

گویا آپ نے چودہ ماہ حرمین شریفین میں رہ کر سند حدیث حاصل فرمائی ۔

ہندوستان میں شاہ ولی اللہ ، ان کے جانشین اور ان کے تلامذہ ایسے علماء وفضلاء کرام

۱۔ سورۃ الرعد ۔ آیت نمبر ۴۱ ۔

۲۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ، ملفوظات عزیزی ۔ ص ۲۰ ۹

ھیں - جن کے طفیل ھندوستان میں حدیث نے بہت بلند مقام حاصل کیا کہ کوئی اسلامی ملک اسکی ھمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا -

شاہ ولی اللہ اپنے وصیت نامہ " وصیت ششم" طریق تعلیم دین ،کے تحت فرماتے ھیں کہ :

" جب طالب علم کو عربی زبان پر قدرت ھو جائے تو موطا بروایت یحیی بن یحیی مصمودی پڑھائی جائے اسے کسی حال میں نہ چھوڑا جائے کہ یہ علم حدیث کی اصل واساس ھے - اس کے پڑھنے میں بہت ھی فیض ھے "- [1]

حجاز سے واپس آکر آپ مدرسہ رحیمیہ میں درس دیتے رھے لہذا طالب علموں کی کثیر تعداد کے باعث مدرسہ رحیمیہ کی وسعت تنگ ھوگئی ، اس لیے محمد شاہ رنگیلے نے دھلی شہر میں ایک عالیشان حویلی دی۔ جس میں آپ نے دار الحدیث قائم کیا - جس سے ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۷ء تک تشنگان علم حدیث نبوی دور دراز سے جوق درجوق اپنی پیاس بجھانے آتے رھے - شاہ صاحب کے درس حدیث اور ان کی کتابوں سے ھندوستان میں ان کے منصب تجدید واحیائے اسلام کی تکمیل ھوئی اور یہی ان کا مقصد عظیم تھا - تفسیر وحدیث کے بعد شاہ صاحب نے مذاھب فقہ اور مسئلہ تقلید واجتہاد میں ایک معقول اورمتوسط طریق اختیار کیا - انہوں نے چاروں مذاھب فقہ کے اختلافات کی بنیاد کو واضح کرنے کے لیے ایک کتاب " انصاف فی بیان سبب الاختلاف " لکھی - شاہ صاحب مذاھب اربعہ میں کوئی فرق نہیں کرتے - انہوں نے کسی ایک کی جانب داری اور دوسرے مذاھب کی نکتہ چینی نہیں کی - اپنی تصنیف " تفہیمات الہیہ " میں لکھتے ھیں کہ " ابو حنیفہ اور شافعی کے مذاھب زیادہ مشہور ھیں اور مسلمانوں میں زیادہ پیرو بھی انہی کے پائے جاتے ھیں - کتابیں بھی انہی کی زیادہ ھیں - فقہاء ،محدثین ،مفسرین ،متکلمین اور صوفیاء زیادہ تر مذھب شافعی کے پیرو ھیں - اور حکومتیں اور عام لوگ زیادہ تر مذھب حنفی پر قائم ھیں - اس وقت جو امر حق

۱- ابو العلا محمد اسمعیل گودھروی ، وصیت نامہ - وصیت ششم - ص ۲۰ ، ۲۱

ملاءاعلیٰ کے علوم سے مطابقت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ ان دونوں مذہبوں کو یکجا کر دیا جائے۔ دونوں کے مسائل کو دواوین حدیث سے مقابلہ کرکے دیکھا جائے جو ان کے موافق ہوں ان کو باقی رکھا جائے اور جس کی کوئی اصل نہ ملے، اس کو ساقط کر دیا جائے، پھر وہ چیزیں تنقید کے بعد ثابت نکلیں اور اگر دونوں مذہبوں میں متفق علیہ ہوں تو ان کو مضبوطی سے پکڑ لیا جائے اور اگر دونوں کے درمیان اختلاف ہو تو مسئلے میں دونوں قول تسلیم کر لیے جائیں اور دونوں پر عمل کرنا صحیح قرار دیا جائے"۔[1]

ان علوم کی ترویج واشاعت کے علاوہ شاہ صاحب نے اپنے اس لائحہ عمل کو عملی جامہ پہنانے کیلئے ایک مرکزی جماعت بنائی۔ اس جماعت کے افراد مولانا محمد عاشق پھلتی، مولوی نور اللہ بڈھانوی اور مولانا محمد امین کشمیری وغیرہم تھے۔ یہ جماعت صوفیاء وعلماء امراء ورؤساء کے حلقوں میں رشد وہدایت اور تعلیم کے ذریعے انقلابی تحریک کی اشاعت کرتی رہی۔

اعتراف عظمت :

سید المفسرین، علماء المتاخرین، شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ بیک وقت مفسر، محدث، فقیہہ مجتہد، متکلم اور صوفی تھے۔ انہوں نے اصول عقائد، علم منطق، علم معانی، علم ہندسہ وحساب اور علم ہیئت کا بنظر غائر مطالعہ کیا تھا۔ شاہ صاحب نے درس وتدریس اور اپنی جلیل القدر تصانیف سے ہندوستان میں علوم ومعارف کے دریا بہا دیے۔ آپ کی علمی فیاضیوں اور عظمت وجلالت کے باعث دور دراز کے ممالک سے شائقین علم ومعارف آپ کے حلقہ درس میں شامل ہو کر علمی برکتیں سمیٹنے کے لیے آتے یہاں تک کہ علوم کتاب وسنت کے اس دریا سے بے شمار نہریں کٹ کٹ کر ہندوستان کے گوشہ گوشہ کو سیراب کرنے لگیں۔

علمبردار محاسن واخلاق "تاجدار علم وفضل اور اماموں کے امام تحمّل اور بردباری کی زبردست چٹان بن کر ساطوں اور بدسلقیوں کے جم غفیر کو نہایت صبر واطمینان سے مدلّل جواب دیتے، جس سے

۱۔ شاہ ولی اللہ، تفہیمات الٰہیہ۔ جلد اوّل۔ ص ۲۷۹، ۲۸۰

ہرگروہ مطمئن ہو جاتا ۔ آپ کی زبردست علمی خدمات اور مجتہدانہ تحقیقات کی بنا پرھی نواب صدیق حسن خان مرحوم فرماتے ھیں کہ :

"انصاف این است کہ اگر وجود او در صدر اوّل وزمانہ ماضی می بود ، امام آلائمہ و تاج المجتہدین شمردہ می شد" ۔[1]

شاہ صاحب نے اپنی زندگی میں اپنے فرائض منصبی کو نہایت آزادی ،مستعدی اور جوانمردی سے انجام دیا ۔ آپ نے عزم صمیم کرلیا تھا کہ سرزمین ھند میں کتاب و سنت کا ایسا مضبوط علم گاڑ دیا جائے جو کبھی سرنگون نہ ھونے پائے اور آپ اپنے اس مقصد عظیم میں کامیاب رھے ۔ اسکی تائید میں ایس ۔ ایم ۔ اکرام رقمطراز ھیں :

"ھم شاہ صاحب کو محض کم ھمتی اور تقلید پسندی سے امام نہیں کہتے ورنہ جہاں تک علمی تبحر ، دماغی قابلیت ، مجتہدانہ نظر ، سلیم الخیالی اور اشاعت کتاب و سنت کے سلسلے میں عظیم الشان قومی اور مذھبی خدمات کا تعلق ھے ۔ دنیائے اسلام میں بہت ھی کم بزرگ ھوں گے ، جن سے آپ پیچھے رھے ھیں ۔ آپ نے بیسیوں کتابیں لکھیں ۔ تفسیر ، حدیث ، تصوف ، فقہ ، تاریخ ، علم الکلام غرضیکہ علوم اسلامی کی کوئی شاخ نہیں ، جسے آپ نے سیراب نہ کیا ھو اور اللہ کا فضل ایسا شامل حال تھا کہ جس چیز کو ھاتھ لگاتے کندن ھوجاتی" ۔[2]

تاریخ اسلام میں بہت کم ھستیاں آپ کے پایہ کی گزری ھیں اور ھندوستان میں تو خصوصاً اس مرتبہ کا آدمی کوئی ھوا ھی نہیں ۔ نواب صدیق حسن خان فرماتے ھیں :

"ھمت علمی برین صفت آنست کہ اورا خلقت فاتحیت دادند وفتح دورۂ باز پسین بردست وی کردند" ۔[3]

۱۔ نواب صدیق حسن خان ، اتحاف النبلاء ۔ ص ، ۲۳۰

۲۔ شیخ محمد اکرام ، رود کوثر ۔ ص ، ۵۵۱

۳۔ نواب صدیق حسن خان ، اتحاف النبلاء ۔ ص ۲۲۹

شاہ صاحب کے عہد میں مغلیہ حکومت کے اقتدار کی جڑیں کمزور ہوکر اکھڑتی جا رہی تھیں ۔ غیر اسلامی طور طریقوں کو اپنانے ، عیش وعشرت کی شمعیں روشن رکھنے اور قومی وملّی وجود کے احساس سے بے گانہ رہنے کے باعث حاکم ومحکوم طبقہ کے لوگ حد درجہ کمزور ، کھوکھلے اور آرام طلب ہوگئے تھے ۔ ان حالات میں شاہ صاحب مسلمانوں کی طرف اژدہوں کی طرح بڑھنے والے گوناگوں خطرات کا الارم دے کر انہیں خبردار کرنے کی کوشش کرتے رہے ۔ جیسا کہ آپ کے اس شعر سے واضح ہوتا ہے ۔

"كأن نجوما أومضت في الغياهب عيون الأفاعي او رؤس العقارب" ۔[1]

لیکن اس کے باوجود مسلمان قوم اپنی کاہلی وسستی کے باعث خوابِ خرگوش کے مزے لیتی رہی اور شاہ صاحب ، مسلمانوں کے دینی ومذہبی وجود کے تحفظ کے لیے اپنا عمدہ اور ٹھوس کام سرانجام دے گئے ۔ شاہ صاحب نے سیاسی انحطاط و زوال کے بدترین دور میں دینی علوم کی جس طرح ترتیب وتدوین کی ، یہ ہندوستان کے مسلمانوں پر خصوصاً اور باقی دنیا کے مسلمانوں پر عموماً شاہ صاحب کا احسان ہے ۔ صاحب اتحاف النبلاء شاہ صاحب کے علم وفضل اور اشاعت حدیث کی تعریف میں ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں :

"جناب شاہ ولی اللہ کا علوم متداولہ میں وہ پایہ تھا ، جس کا شمہ بھی بیان کرنے سے انسانی طاقت محض عاجز ہے ۔ آپ فنون عقلیہ میں وہ دستگاہ رکھتے تھے جس کا عشر عشیر بھی دوسروں کو نصیب نہ تھا ۔ قطع نظر ان تمام علوم کے حدیث میں اپنے تمام ہمعصروں سے امتیازیہ قوت رکھتے تھے اور اس علم میں مقتدائے وقت اور فرید عصر شمار کیے جاتے تھے ۔ آپ کی تقریر میں اس بلا کا جادو تھا کہ مخالف وموافق پر اس کا بڑا اثر پڑتا تھا ۔ ابتدائی زمانہ سے اگرچہ آپ کے فضل وکمال کے جھنڈے ایک عالم میں گڑ چکے تھے اور آپ کے نام کا امتیازی پھریرا ہندوستان سے لے کر عرب وعجم تک لہرا رہا تھا لیکن جب آپ عرب کے مقدس ومبارک سفر سے واپس تشریف لائے اور علم حدیث کی اور بھی اشاعت کی تو اب آپ اپنی مقبولیت کے سبب سے واقعی ہردلعزیز

۱۔ شاہ ولی اللہ ، اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم ۔ ص ۔ ۲

ہوگئے اور اعزاز واقتدار کا آفتاب بڑی تابانی کے ساتھ چمکنے لگا ۔ حقیقت میں جناب شاہ ولی اللہ کی درسگاہ اس وقت علوم حدیث وتفسیر کا مخزن اور حنفی فقہ کا سرچشمہ تھی۔اس مقدس اور بلندپایہ علم کی خدمت جس قدر آپ سے وجود پذیر ہوئی ، فی الواقع ہندوستان میں کوئی شخص اس کا دعوے دار نہیں ہو سکتا ۔ "عمل بالحدیث کا بیج ہندوستان کی بنجر اور ناقابل کاشت زمین میں آپ کے والد بزرگوار جناب شیخ عبدالرحیم صاحب نے ڈالا اور آپ نے اپنی ان تھک کوششوں سے اسے یہاں تک سینچا کہ چند ہی روز میں اس کا پودا اگا اور سرسبز وشاداب ہوکر لہلہانے لگا اور اس کے پھل پھول سے لوگ جھولیاں بھر بھر کر لے جانے لگے ۔ اسے ہندوستان کی بڑی خوش نصیبی کہنا چاہیئے کہ جہاں علم حدیث کا نام ونشان تک زبان پر نہ لیا جاتا تھا ، آج اس کے گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں علم حدیث کے آوازے سنے جاتے ہیں " ۔[1]

شیوخ حرم بھی موصوف کی فہم وفراست ، شرح حدیث ، معانی حدیث اور توضیح مطالب کے قائل تھے ۔ چنانچہ شیخ ابوطاہر کردی موصوف کے متعلق فرماتے تھے :

"انہ یسند عنی اللفظ وکنت اصحح منہ المعنی"۔[2]

اگرچہ اس جلیل القدر اور محترم خاندان کے ہر فرد کی خوش بیانی ، برجستہ گوئی اور فصاحت وبلاغت کا ہر شخص اعتراف کرتا ہے لیکن شاہ ولی اللہ کا مقام ان سب سے بلند تر ہے کیونکہ آپ ان تمام صفات میں غیرمعمولی شخصیت کے حامل تھے ۔ برصغیر پاک وہند میں علوم اسلامیہ کی تاریخ میں ان کا کوئی ثانی و ہمسر نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ سید عبد الحئی لکھنوی شاہ صاحب کے حالات کا آغاز ان الفاظ میں کرتے ہیں :

"شیخ امام الھمام ، حجۃ اللہ بین الانام ، امام الائمہ ، قدوۃ الامۃ ، علامۃ العلماء ، وارث الانبیاء ، آخر المجتہدین ، اوحد علماء الدین ، زعیم المتقلمین بحمل اعباء الشرع المتین ، محی السنۃ ومن عظمۃ اللہ بوعلینا النعمۃ شیخ الاسلام قطب الدین احمد ولی اللہ بن عبدالرحیم بن وجیہہ الدین العمری الدھلوی" ۔[3]

---

۱ ۔ نواب صدیق حسن خان ، اتحاف النبلاء ۔ ص ۴۳۰ ، ۴۱۷

۲ ۔ سید عبدالحئی لکھنوی ، نزھۃ الخواطر ۔ جلد ۔ ٦ ، ص ۴۰۲

۳ ۔ ایضاً ۔ ص ۴۰۲

شاہ صاحب انشاء پردازی اور تقریر و بیان میں بھی یکتائے روزگار تھے - آپ کی بلند پایہ کتب ، مکاتیب و خطوط اور علمی مناظروں سے آپ کی انشاء پردازی کا پتہ چلتا ہے - تقریر و بیان میں بلا کا جادو تھا - بڑے بڑے مناظروں اور علمی مجلسوں میں اپنی فصاحت و بلاغت سے ہر موافق و مخالف پر محویت طاری کر دیتے - شعر و شاعری میں بھی دلچسپی تھی - عربی میں آپ کے قصائد اور فارسی میں بعض غزلیں اور رباعیاں موجود ہیں - فارسی میں آپ اپنا تخلص امین فرماتے تھے گویا شاہ صاحب کو تمام علوم دینی دنیوی پر عبور حاصل تھا - یہی وجہ ہے کہ صاحب نزھۃ الخواطر فرماتے ہیں :

"ان الشیخ ولی اللہ شلہ کشل شجرۃ طوبی ، اصلھا فی بیتہ وفرعھا فی کل بیت من بیوت المسلمین فما من بیت ولا مکان من بیوت المسلمین وامکنتھم الا وفیہ فرع من تلک الشجرۃ لا یعرف غالب الناس این اصلھا " -[1]

شاہ ولی اللہ بہت سی عظیم الشان اور جلیل القدر کتب کے مصنف ہیں - انہوں نے ایک سو ۱۰۰ سے زائد کتب تصنیف کیں جو زمانہ کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکیں بلکہ بعض کتابوں کا تو نام و نشان بھی مٹا دیا گیا - ان میں چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد اکاون ۵۱ کے قریب ہے ، جن میں سے نصف کتب دستیاب ہیں اور باقی ابھی تک نادر اور نایاب ہیں - بعض ارباب تحقیق کے مطابق کچھ ظالموں نے نہ صرف کتابیں لکھ کر شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان سے منسوب کر کے شائع کیں بلکہ ان کی کتابوں کی عبارتوں کو بھی بدل دیا - یوں تو آپ کی تمام تصنیفات بلند پایہ ہیں لیکن ان میں سے سب سے زیادہ مشہور " حجۃ اللہ البالغۃ " ہے - آپ کی مندرجہ ذیل تصنیفات تفسیر ، حدیث ، اسرار شریعت ، تصوف ، سیر ، عقائد اور مناظرہ میں چھپ چکی ہیں -

---

۱- سید عبدالحئی لکھنوی ، نزھۃ الخواطر - جلد - ۶ ، ص ۴۰۲

تفسیر :

(۱) فتح الرحمن فی ترجمۃ القرآن : (فارسی) یہ ترجمہ حسن و خوبی میں لاثانی ہے اور اسکی مختصر شرح بہت سے فوائد کی حامل ہے۔ قرآن مجید کا یہ فارسی ترجمہ شاہ صاحب کی وسعت نظر اور علم کی پختگی پر بہت بڑی دلیل ہے، جس کی قدر و قیمت کا اندازہ فقط علماء محققین ہی کر سکتے ہیں۔

(۲) الفوز الکبیر فی اصول التفسیر : (فارسی) اصول تفسیر پر نہایت مفید، بصیرت افروز اور جلیل القدر تصنیف ہے۔ صغیر الحجم ہونے کے باوجود اس قدر جامع ہے کہ مطالب قرآن، تاویل حروف کے مقطعات، رموز قصص الانبیاء اور اصول ناسخ و منسوخ کے بڑے بڑے پیچیدہ مسائل کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

(۳) فتح الخبیر : (عربی) اصول تفسیر میں الفوز الکبیر کا دوسرا حصّہ ہے مگر شاہ صاحبؒ نے اس کا علیحدہ نام تجویز کیا ہے۔

حدیث :

(۴) المسوّی فی احادیث الموطا اور (۵) المصفّی فی شرح الموطا میں اوّل الذکر عربی زبان میں اور موخر الذکر فارسی زبان میں موطا امام مالک کی شرح ہے۔

(۶) تراجم البخاری : (عربی) صحیح بخاری کے ترجمۃ الباب کی شرح ہے جو دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہو چکی ہے۔

(۷) اربعین حدیثا مسلسلات بالاشراف فی غالب سندھا : (عربی) اس میں اصول دین پر مبنی چالیس حدیثیں جمع کر دی ہیں۔

(۸) الارشاد الی مہمات علم الاسناد : (عربی) علم اسناد حدیث اور اس کے اثبات میں ایک چھوٹا سا مفید رسالہ ہے۔

(۹) الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ : (فارسی) اس کا پہلا حصّہ تصوّف کے بارے میں اور دوسرا حصّہ کتب حدیث اور فقہ کی اسانید کے متعلق ہے۔

(۱۰) الدر الثمین فی مبشرات النبی الکریم : (عربی) چند صفحوں پر مشتمل چالیس حدیثوں کا یہ رسالہ شائع ہوچکا ہے - آپ کو یا آپ کے دسی بسزرگوں کو نبی کریم سے جو مبشرات ملے اس میں ان کا بیان ہے -

اسرار شریعت:

(۱۱) حجۃ اللہ البالغہ: (عربی) شاہ صاحب کی یہ تصنیف اسرار شریعت، حدیث، فقہ، تصوّف، اخلاق اور فلسفہ میں معرکۃ الاراء اور بے مثال کتاب ہے - ایک حدیث کا طالب علم اپنی اطمینان بخش احادیث اصولی اپنے اصول کے دلائل، فقیہہ اپنے مذہب کے فقہی براھین اور فلسفی اپنے دلائل فلسفہ کو اس میں پا لیتا ہے -

نواب صدیق حسن خان مرحوم اس کتاب کی فضیلت میں رقمطراز ہیں :

"این کتاب اگرچہ در علم حدیث نیست امّا شرح احادیث بسیار در آن
کردہ، وحکم و اسرار آن بیان نمودہ، تا آنکہ در فن خود غیر مسبوق الیہ
واقع شد ومثل آن درین دوازدہ صد سال ہجرت از ہیچ یکے از علمائے
عرب وعجم تصنیفے موجود نیامدہ" -[1]

(۱۲) انصاف فی بیان سبب الاختلاف : (عربی) اس کتاب میں یہ بات صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی ہے کہ قرآن اور حدیث کی موجودگی میں اقوال فقہاء کوئی حقیقت نہیں رکھتے - جب کسی کے پاس کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ موجود ہے تو ان کے مقابلہ میں امام کی تقلید حرام ہے -

(۱۳) عقد الجید فی احکام الاجتہاد التقلید : (عربی) اس میں بھی "الانصاف" کی طرح اجتہاد و تقلید کے احکام نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں -

تصوّف:

(۱۴) فیوض الحرمین : (عربی) حرمین شریفین میں قیام کے زمانہ میں حق تعالی کی طرف سے جو الہامات یا روح پر فتوح سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے جو افاضات آپ کو ہوئے اور

---

۱ - نواب صدیق حسن خان، اتحاف النبلاء - ص، ۲۱

جو خاص تعلیم وتلقین کی گئی ، آپ نے ان سب کو اس رسالہ میں جمع کر دیا ہے - گویا یہ شاہ صاحب کے مکاشفات کا نہایت قیمتی مجموعہ ہے اس میں بعض رویائے صادقہ بھی موجود ہیں -

(۱۵) القول الجمیل :- (عربی) یہ کتاب بیعت کی حقیقت ، پیر طریقت کی صحیح شناخت اور تین مشہور سلاسل طریقت قادریہ ، چشتیہ اور نقشبندیہ کے اذکار و اشغال اور اس قسم کے دوسرے مسائل پر بے حد مفید اور معتقادہ تصنیف ہے -

(۱۶) الطاف القدس (فارسی) تصوف کے اصل مقصد کو حاصل کرنے کا جو مخصوص طریقہ خود شاہ صاحب کے قلب مبارک پر الہام کیا گیا ، اس کی تفصیل اس کتاب میں بیان کی گئی ہے - گویا یہ شاہ صاحب کا ایک مدوّن علم ہے -

(۱۷) تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء : (عربی) قصص انبیائے کرام کے نکات و اسرار پر مبنی ہے -

(۱۸) الخیر الکثیر : (عربی) تصوف اور علم اسرار حقائق میں یہ بلند پایہ کتاب ہے - اسکی اشاعت مجلس علمی ڈابھیل نے حال ہی میں کی ہے -

(۱۹) کشف الغین فی شرح رباعتین : (فارسی) یہ کتاب خواجہ باقی باللّٰہ کی دو رباعیوں کی شرح ہے -

(۲۰) ہوامع شرح حزب البحر : (فارسی) یہ حقائق و معارف پر بہترین کتاب ہے -

(۲۱) البدور البازغہ : (عربی) اس کتاب کو " حجۃ اللّٰہ البالغۃ " کے خاص خاص ابواب کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے - اس کتاب کو بھی مجلس علمی والوں نے طبع کیا ہے -

(۲۲) تفہیمات الٰہیہ : (عربی و فارسی) یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے اور اس کا اکثر حصّہ طریقت اور تصوّف کے متعلق مقالات پر مبنی ہے - عام تعلیمات شرعیہ کے متعلق بھی اس میں بعض نہایت مفید مضامین ہیں -

(۲۳) زہراوین : (عربی) یہ سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران کی تفسیر میں بہترین رسالہ ہے -

(۲۴) شفاء القلوب : (عربی) یہ حقائق و معارف میں بہت عمدہ تصنیف ہے - ان کے علاوہ

(۲۵) ہمعات : (فارسی)

(۲۶) سطعات : (فارسی) (۲۷) لمحات (فارسی) (۲۸) فیض عام : (فارسی)

(۲۹) عوارف : (عربی) ھیں ۔

سیر وادب :

(۳۰) سرور المحزون فی سیر الامین المامون : (فارسی) ۔

(۳۱) اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم : (عربی) سیرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بائیہ قصیدہ ھے ۔ اس کے ساتھ تین اور قصیدے ھمزیہ ، تائیہ اور لامیہ بھی شامل ھیں ۔

(۳۲) انفاس العارفین : (فارسی) اس میں شاہ صاحب نے اپنے بزرگوں کے احوال قلم بند کیے ھیں اور یہ کتاب الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف ۔ (۳۳) بوارق الولایۃ ۔ (۳۴) شوارق المعرفۃ ۔

(۳۵) امداد فی مآثر الاجداد (۳۶) النبذۃ الابریزیۃ فی اللطیفۃ العزیزیۃ (۳۷) عطیۃ الصمدیۃ فی انفاس المحمدیۃ (۳۸) انسان العین فی مشائخ الحرمین پر مشتمل ھے ۔

مناظرہ :

(۳۹) ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء : (فارسی) شاہ صاحب کی سب سے بڑی ، جامع اور بلند پایہ تصنیف ھے ۔ خلافت صحابہ کے متعلق حدیث وتفسیر ، تاریخ ، استخراج مسائل اخذ و استنباط کا بہترین مرقع ھے ۔ شاہ عبد العزیز محدث دھلوی نے اپنی کتاب تحفہ اثنا عشریۃ کے حاشیہ میں اسکے بعض فوائد درج کیے ھیں ۔

(۴۰) قرۃ العین فی تفضیل الشیخین : (فارسی) صدیق اکبر اور فاروق اعظم کی فضیلت میں دس گیارہ جز کا مطبوعہ رسالہ ھے ۔

عقائد :

(۴۱) المقدمۃ السنیۃ فی قوانین الترجمہ : (فارسی) فتح الرحمن کے ترجمہ کے اصول و قوانین کو بیان کرنے اور ان کی مشکلات کو دور کرنے کے لیے لکھا گیا ھے ۔

(۴۲) المقالۃ الوضیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ : (فارسی) شاہ صاحب کا یہ وصیت نامہ آٹھ وصیتوں پر مشتمل ھے ۔

مکتوبات :
======

(۴۳) مکتوبات مع مناقب الی عبداللہ اسمعیل بخاری و فضلیت ابن تیمیہ ۔

(۴۴) مکتوبات فارسی (مشمولہ کلمات طیبات) ۔

(۴۵) مکتوبات عربی (مشمولہ حیات ولی) ۔

(۴۶) مکتوب المعارف مع مکتوب ثلاثہ ۔

(۴۷) مکتوبات شاہ ولی اللہ مرتبہ خلیق احمد نظامی ۔

(۴۸) دیوان اشعار عربی جس کو شاہ عبدالعزیز نے جمع کیا اور شاہ رفیع الدین نے مرتب کیا۔

صرف :
=====

(۴۹) صرف میر ۔

متفرق :
======

(۵۰) رسالہ دانش مندی ۔

عظیم المرتبت عالم ربانی اور جلیل القدر مجدّد دین شاہ ولی اللہ کی ہر تصنیف و تالیف اس قدر محققانہ اور مجتہدانہ ہے کہ آپ زر سے لکھنے پر بھی اس کا حق ادا نہیں ہو سکتا ۔ ظلمت اور تاریکی کے اس دور میں شاہ صاحب اپنے مقصد اعلیٰ کو سرانجام دینے یعنی بہت سی کتب تصنیف کرنے کے بعد تجدید ملّت کے سلسلے میں ایک مکمل لائحہ عمل مرتّب کر گئے ۔ اس کے بعد کوئی انقلابی قدم اٹھانا آپ کے بعد میں آنے والوں کا کام تھا جسے آپ کے علمی پوتے مولانا شاہ اسمعیل شہید اور دوسرے روحانی پوتے سید احمد شہید نے مناسب وقت پر سرانجام دیا۔

یہ امر مسلم ہے کہ دنیا کے عظیم الشان انقلابات ، حیرت ناک تغیر و تبدل اور ناپائیداری و بے ثباتی میں ہر شخص ایک دن موت کا تلخ اور زہر آلود ساغر منہ سے لگائے گا۔ ہزاروں عظیم الشان سلاطین ، دنیا کے مشہور و نامور تاجدار ، خدا کے بڑے پیارے اور برگزیدہ بندے چند روز مسافرانہ زندگی بسر کرنے کے بعد اصلی مرکز کی طرف رجوع کر گئے ۔ ظاہری و باطنی

علوم کے جامع ، مجتہد وقت ، مجدد دین اور آفتاب علم وفضل ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء میں خفیف سی علالت کے بعد سفر آخرت اختیار کر گئے - (انا للہ وانا الیہ راجعون) - شاہجہان آباد سے جنوب میں پرانی دلی میں مہندیوں کے اندر اپنے والد شیخ عبدالرحیم کے پہلو میں راحت فرما ہوئے - اس خاندان کے ہر فرد کے آفتاب علم حدیث ہونے کے باعث یہ قبرستان " محدثین کے قبرستان " کے نام سے بھی مشہور ہے -

شاہ صاحب کی بعدی عمر کے بارے میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے - حیات ولی کے مصنف نے یہ لکھا ہے کہ " جناب شاہ صاحب عمر کے تریسٹھ سال طے کر چکے تو چند روز خفیف سی بیماری میں مبتلا ہو کر ۱۱۷۶ھ میں عازم سفر آخرت ہوئے " -[1] لیکن اسکے برعکس ملفوظات عزیزیہ کے جامع نے شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی کا یہ قول نقل کیا ہے -

" عمر شریف یعنی شصت یک سال و چہار ماہ شد چہارم شوال تولد گشت - در بست نہم محرم وفات یافت تاریخ تولد شاہ ولی اللہ چہارم شوال و چہار شنبہ ۱۱۱۴ ھجری بود تاریخ وفات او بود امام اعظم دین دیگر ہائے دل روزگار رفت بست نہم محرم وقت ظہر " -[2]

اگرچہ سن ولادت و وفات میں کوئی اختلاف موجود نہیں لیکن حیات ولی میں آپ کی عمر تریسٹھ (۶۳) برس لکھی گئی ہے - جب کہ آپ کے فرزند گرامی نے آپ کی عمر اکسٹھ برس اور چار ماہ لکھی ہے اور یہی قول صحیح ترین معلوم ہوتا ہے -

خداوند کریم نے آپ کو چار مایہ ناز فرزند عطا فرمائے تھے جو فرزندی کے علاوہ آپ کے صحیح جانشین بھی ثابت ہوئے - (۱) شاہ عبدالعزیز (۲) شاہ رفیع الدین (۳) شاہ عبدالغنی (۴) شاہ عبدالقادر - لیکن تحقیق کرنے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ شاہ ولی اللہ کے ایک اور بیٹے شاہ محمد دھلوی بھی تھے - جو چاروں بھائیوں سے مختلف البطن اور سب سے بڑے اخیافی بھائی تھے - ان کا ذکر مولوی محسن بن یحیی الترہتی نے الیانع الجنی میں اس طرح کیا ہے -

---

۱- عبدالرحیم بخش دھلوی ، حیات ولی ، ص ۵۸۲
۲- شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی ، ملفوظات عزیزی - ص ۲۰۰ -

"وکان لعبد العزیز اخ اقدم منه سنّا اسمه محمد وکان اخا لابیه اخرز عن ابیه وهو ایضا" قدیما الوفاة رحمہ اللہ تعالی"۔[1]

شاہ ولی اللہ صاحب کا پہلا عقد شیخ عبید اللہ صاحب پھلتی کی صاحبزادی فاطمہ کے ساتھ چودہ سال کی عمر میں ہوا تھا ۔ ان سے ایک صاحبزادے شیخ محمد عاشق صاحب ہوئے ۔ صاحب نزھۃ الخواطر رقم طراز ہیں :

"(وقرء) شمائل ترمذی سماعا علیه بقراۃ اخیه الشیخ محمد "۔[2]

اس لیے شاہ محمد کی وجہ سے بعض مقامات پر شاہ ولی اللہ اپنی کنیت "ابو محمد" لکھتے ہیں ۔ چنانچہ "الارشاد الی مہمات الاسناد (درمطبع احمدی دھلی) کے سرورق پر شاہ ولی اللہ کی کنیت "ابو محمد" درج ہے اور اس کتاب میں اس بات کو ان الفاظ میں واضح کر دیا گیا ہے :

، وله ولد قبل مولدهما عبدالعزیز مسمی بمحمد فکنی بابی محمد "۔[3]

ان تمام مستند بیانات اور معتبر روایات کے مطابق شاہ محمد کی شخصیت کے بارے میں کسی قسم کے احتمال اور شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی ۔

۱۔ مولوی محسن بن یحییٰ الترہتی ، الیانع الجنی ۔ ص ، ۷۶

۲۔ سید عبدالحی لکھنوی ، نزھۃ الخواطر ۔ جلد ۔ ۷ ، ص ۲۶۸۰

۳۔ شاہ ولی اللہ ، الارشاد الی مہمات الا سناد ۔ ص ، ۲

باب — دوم

(حصۂ دوم)

شاہ عبدالعزیز کے حالات زندگی

89—116

(الف) پیدائش ، تعلیم و تربیت ، اساتذۂ کرام ، جامعیت علوم ، اردو ، فارسی ، عربی اور عبرانی زبانوں سے واقفیت ، حدیث و تفسیر ، موسیقی ، حافظہ و یادداشت ، تقریر و خطابت ، آخری درس قرآن ، وفات ، نماز جنازہ ، اولاد ۔

(ب) شاہ صاحب کے خاندان کے متعلق چند غلط روایات اور ان کی تردید ۔

(ج) شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی کی زندگی کے دو اھم کارنامے : شاہ عبدالعزیز کا شیعیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا اور شاہ عبدالعزیز کا فتوی دارالحرب ۔

خاتم المحدثین حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی طوائف الملوکی اور انتشار و خلفشار کے اس دور میں پیدا ہوئے جب کہ نادر شاہی حملے سے ہندوستانی معاشرے کی مضبوط عمارت بوسیدہ ہو چکی تھی اور اسلامی حکومت کی ان لرزتی دیواروں کو مسمار کرنے والے سب سے قوی اور خطرناک دشمن سکھ اور مرہٹے تھے۔ ان دشمنوں کے خلاف مسلمانوں کے مختلف سرداروں اور خلیفوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کرنے والی شاہ ولی اللہ کی ذات ستودہ صفات تھی ، جن کے ناپاک عزائم اور بے بنیاد خوابوں کو خاک میں ملانے کے لیے شاہ صاحب نے اپنی فراست و ذہانت کو بروئے کار لاتے ہوئے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے اور ان سے مقابلہ کرنے کی دعوت دی۔ نادر شاہی حملے کے بعد شاہ عبدالعزیز کے عہد میں احمد شاہ ابدالی نے ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۸ء سے لے کر جنوری ۱۱۷۵ھ/۱۷۶۱ء تک ہندوستان پر یکے بعد دیگرے کئی حملے کیے۔ تباہی و بربادی ، بدامنی اور قتل و غارت گری کے اس دور میں ، جب کہ دہلی آئے دن لوٹ مار کا نشانہ بنی رہتی تھی ، مسلمانوں کے عظیم راہبر و راہنما اور مذہبی پیشوا ہندوستان کی عظمت رفتہ پر آنسو بہاتے ہوئے اپنے احساسات کا اظہار عربی اشعار میں کرتے ہیں۔

"جزی اللہ عنا قوم سکھ و مرہٹ عقوبۃ شرا جلا غیر اجل" ۔[1]

گویا ان اشعار میں شاہ عبدالعزیز نے اسلامی حکومت کے ناسازگار سیاسی حالات پر جس پریشانی اور بے چینی کی حالت میں اپنے تاثرات بیان کیے ہیں ، وہ اس بات کی پختہ دلیل ہیں کہ شاہ صاحب جنوبی ہند کے مرہٹوں کے سیل رواں اور پنجاب سے سکھوں کے بڑھتے ہوئے طوفان سے بے خبر اور غافل نہ تھے اور مسلمان بھی نہایت اضطراری کیفیت میں دشمنوں کے اس سیلاب میں ڈوبنے اور طوفان میں گم ہونے کے منتظر تھے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کی حقائق انگیز شخصیت نے اس سیاسی انتشار اور ناسازگار حالات سے متاثر ہو کر اپنے چچا شاہ اہل اللہ کے نام عربی میں چند خطوط تحریر فرمائے ہیں۔

بحث

۱۔ عبدالرحیم/دہلوی ، حیات ولی ۔ ص ۔ ۲۰۱

افضل الفضلاء ، اکمل الکملاء ، استاذ الاساتذہ اور زبدۃ المفسرین شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ ۱۱۵۹ھ / ۱۷۴۵ء میں خطہ ہند میں پیدا ہوئے ۔ شاہ ولی اللہ کے بعض رفقاء نے آپ کا تاریخی نام غلام حلیم رکھا ۔ جیسا کہ ملفوظات میں ہے کہ :

" ایک شخص نے میرا تاریخی نام قرآن سے نکالا ہے ۔ فبشرناہ لغلام حلیم " ۔[۱]

آپ کا سلسلہ نسب چونتیس ۳۴ واسطوں سے امیر المومنین سیدنا عمر بن الخطاب تک پہنچتا ہے ۔ جیسا کہ شاہ ولی اللہ کے حالات زندگی کے تحت آپ کا شجرہ نسب اور خاندانی پس منظر بیان کر دیا گیا ہے ۔

زمانہ شیر خواری سے ہی شاہ عبدالعزیز کی کشادہ پیشانی سے مستقبل کی جلالت وعظمت اور شان و شوکت نمایاں ہوتی تھی ۔ پانچ سال کی عمر میں آپ نے قرآن پاک پڑھنا شروع کیا ۔ علم کی طرف رغبت کے باعث قلیل مدت میں ہی آپ نے قرآن پاک حفظ کرلیا اور اسلام کے ابتدائی مسائل و احکام کی تعلیم سے فراغت حاصل کرلی ۔ حفظ قرآن پاک کے بعد زیادہ تر تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی ۔ بعدازاں شاہ ولی اللہ نے اپنے تین اور قابل ارشد خلفاء مولانا شاہ محمد عاشق اور مولانا خواجہ امین اللہ کو اپنے ہونہار و قابل بیٹے کی تعلیم و تربیت پر مامور فرمایا ۔ آپ نے فقہ کی تعلیم اپنے خسر مولانا نوراللہ سے حاصل کی ۔ آپ نے اپنی ذہانت و ذکاوت سلیم الطبعی اور غیر معمولی حافظے کے باعث دو سال کے عرصے میں عربی کے مختلف علوم وفنون میں حیرت انگیز ترقی کی ۔ تیرہ سال کی عمر میں کتب درس ، صرف ونحو ، فقہ ، اصول فقہ ، منطق کلام ، عقائد ، ہندسہ ، ہیئت اور ریاضی وغیرہ میں مہارت حاصل کرلی تھی ۔ ان علوم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد آپ اپنے والد بزرگوار کی درسگاہ میں جانے لگے اور ذہین وفطین اور بہادر و جفا کش طلباء کے وسیع حلقہ میں شرکت کرکے حدیث کی سماعت کرنے لگے ۔ دو سال میں شاہ عبدالعزیز نے حدیث کی تمام کتب پر عبور حاصل کرلیا ۔ اور آپ کا شمار بہت بڑے بڑے علماء وفضلاء میں ہونے لگا ۔ جیسا کہ ملفوظات میں فرماتے ہیں کہ :

۱۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ، ملفوظات عزیزی ۔ ص ۹۷

"حضرت والد ماجد صاحب نے ہر فن میں ایک آدمی تیار کیا تھا اور اس فن کے طالب علم کو اس (آدمی) کے سپرد فرماتے تھے اور خود معارف گوشی اور معارف نویسی میں مشغول رہتے تھے اور حدیث شریف پڑھایا کرتے تھے"۔[1]

پندرہ سال کی عمر میں آپ تمام مروّجہ علوم وفنون سے فارغ ہو چکے تھے جیسا کہ تذکرہ علمائے ہند رقمطراز ہیں کہ :

"بعمر پانزدہ سالگی بخدمت والد ماجد خود از تحصیل علوم عقلیہ ونقلیہ وتکمیل خفیہ وجلیہ فارغ شد"۔[2]

اس جلیل القدر خاندان میں اتنی قلیل مدت میں اس مقام عالی کو پا لینے والی شخصیت صرف شاہ عبدالعزیز ہی کی نہ تھی بلکہ اس خاندان کا ہر فرد وبشر بہت بلند مقام پر فائز تھا۔ ابھی آپ سترہ برس کے تھے کہ شاہ ولی اللہ اس دارفانی سے کوچ فرما گئے۔ والد بزرگوار کی وفات کے بعد شاہ عبدالعزیز اپنے تینوں بھائیوں سے عمر اور علم میں ممتاز ومشہور ہونے کے باعث مسند درس و ارشاد پر متمکن ہوئے۔

شاہ عبدالعزیز تمام علوم متداولہ وغیر متداولہ اور فنون عقلیہ ونقلیہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے جیسا کہ صاحب علم وعمل رقمطراز ہیں کہ "آپ علم تفسیر، حدیث، فقہ سیرت اور تاریخ میں شہرۂ آفاق تھے اور ہیئت، ہندسہ، مجسطی، مناظر، اصطرلاب، جرثقیل، طبیعات، الہیات، منطق، مناظرہ، اتفاق، اختلاف، ملل، نحل، قیافہ، تاویل، تطبیق، مختلف اور تشریح مشتبہ میں یکتائے زمانہ تھے"۔[3]

گویا آپ کے مرجع علوم وفنون ہونے کے باعث تمام فقراء و سلاطین وامراء شیعہ و سنّی آپ کی مدح میں رطب اللسان رہتے تھے۔ شہرت ولیاقت علمی کے باعث علم وفضل کے میدان

۱۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، ملفوظات عزیزی - ص ۲۰۰

۲۔ رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند - ص ۱۲۲

۳۔ وقائع عبدالقادر خانی، علم وعمل - جلد دوم - ص ۲۲۶ -

کے بہت نامور شاہسوار تھے ۔ شاہ صاحب کی علمی جامعیت کا یہ ذوق شوق اس خاندان میں مسلسل باقی رہا ۔ ملفوظات کے جامع نے شاہ عبدالعزیز کا یہ قول نقل کیا ہے کہ :

جن علوم کا میں نے مطالعہ کیا ہے اور جہاں تک مجھے یاد ہے ۔ ایک سو پچاس علوم ہیں ۔ نصف سابقین اولین کے ہیں اور نصف علم اس امت میں ہیں " ۔[1]

شاہ عبدالعزیز کے عہد میں اردو زبان خاصی مقبول و مسروت تھی ۔ اسی زمانے میں شاہ عبدالقادر نے قرآن پاک کا تحت اللفظ اردو ترجمہ کیا تھا ۔ اس دور کے نامور شعراء خان آرزو سودا میر ، مظہر اور درد وغیرہ معاشرے میں نہایت عزّت و وقار کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے ۔ شاہ عبدالعزیز اور آپ کے بھائی شاہ عبدالقادر اردو زبان سیکھنے کے لیے خواجہ میر درد کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور ان کی مجلس وعظ و تقریر میں تمام محاورات پوری توجّہ اور انہماک سے سنتے ۔ شاہ ولی اللہ اس فن (اصول زبان) کے بارے میں اپنے بچوں سے فرمایا کرتے تھے کہ " جس طرح اصول حدیث اور اصول فقہ فن ہیں ۔ اسی طرح اصول زبان بھی ایک فن ہے اور اردو زبان کے موجد اور مجتہد میر درد ہیں ۔ آپ کی صحبت کو اس فن کے واسطے غنیمت سمجھو کیونکہ خواجہ صاحب پختہ زبان ہیں " ۔[2]

شاہ صاحب اردو ادب میں نہایت ارفع و ممتاز مقام رکھتے تھے ۔ اس دور کے بڑے بڑے اردو داں اور شعراء و فصحاء اپنے کلام کی اصلاح کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے ۔ سید ناصر نذیر فراق لال قلعہ کی ایک جھلک میں لکھتے ہیں " کون نہیں جانتا کہ حضرت شاہ نصیر صاحب ، اکبر شاہ ثانی ، ابوظفر بہادر شاہ ظفر اور شیخ ابراہیم ذوق کے استاد تھے ۔ جب شاہ نصیر صاحب کا شیخ ذوق سے دل کھٹا ہوگیا اور اصلاح موقوف ہوئی تو ہر جمعہ کو مولانا عبدالعزیز کے وعظ میں جانے لگے اور وعظ بہت غور سے سننے لگے ۔ کسی دوست نے اس کا سبب پوچھا تو ذوق نے کہا استاد مجھ گنہگار سے ناخوش ہوگئے ۔ شعر و سخن میں اصلاح نہیں ملتی ۔ اس کا بدل میں نے یہ نکالا ہے کیونکہ مولانا عبدالعزیز صاحب اردو زبان داں

---

۱ ۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ، ملفوظات عزیزی ۔ ص، ۳۶

۲ ۔ سید ناصر نذیر فراق ، لال قلعہ کی ایک جھلک ۔ ص، ۸۸ ۔

میں شاہ نصیر سے کسی طرح کم نہیں ۔ میں اس وعظ کی بدولت بہت سے محاورات سیکھ لیتا ہوں "۔[1]

شعراء آپ کی زبان دانی کے معترف تو تھے ہی لیکن اس دور کے امراء اور شہزادے بھی آپ کی علمی لیاقت کی شہرت و ناموری سے متاثر ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے ۔ "ایک دفعہ شیخ ابراہیم ذوق نے اکبر شاہ ثانی کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا اور شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کیا ۔ شاہ صاحب نے دیکھ کر اس کو پڑھنے کی اجازت دے دی لیکن ولی عہد (ابو ظفر بہادر شاہ) نے اس کو پھر شاہ صاحب کی خدمت میں بھیجا ۔ شاہ صاحب نے اس پر مندرجہ ذیل شعر لکھ کر واپس کر دیا ۔

بود بگفتہ من حرف اعتراض چنان کسی بدیدۂ بینا فرو برد انگشت "۔[2]

اردو زبان کے ساتھ ساتھ شاہ عبدالعزیز صاحب فارسی زبان میں بھی خاصی دلچسپی رکھتے تھے ۔ شاہ صاحب نے قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد فارسی کے مختصر رسائل بھی تھوڑے عرصے میں پڑھ لیے تھے ۔ محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں جب آپ اپنی عمر کی ابتدائی منازل طے کر رہے تھے تو ان دنوں میں مسجدوں ، درباروں اور خانقاہوں میں قصہ خوانی عام ہوتی تھی ۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نماز عشاء کے بعد عوام اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں کا بڑا گروہ قصے سننے اور زبان سیکھنے کی غرض سے جمع ہو جاتا تھا ۔ محمد شاہ کے عہد میں فارسی کی ضخیم کتاب "بوستان" امراء و روساء کی خاص مجلسوں میں پڑھی اور سنی جاتی تھی ۔ اس کے علاوہ بھی مدارس میں اکثر فارسی کتب گلستان ، سکندر نامہ اور بہار دانش کی تعلیم دی جاتی تھی ۔ خود شاہ عبدالعزیز فارسی زبان سیکھنے اور اس پر قدرت رکھنے کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ :

"میرے والد ماجد کے متوسلین میں سے ایک عورت لاڈلی خانم تھی ۔ ہم (بچوں) سے اس کو بہت محبت تھی ۔ ہم بھی اس سے فارسی قصوں کی فرمائش کرتے تھے اور ہم نے فارسی زبان بولنی اس عورت سے سیکھی ہے "۔[3]

---

۱ ۔ سید ناصر نذیر فراق ، لال قلعہ کی ایک جھلک ۔ ص ۸۷ ، ۸۸ ۔

۲ ۔ محمد حسین آزاد ، دیوان ذوق ۔ ص ۱۲ ،

۳ ۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ، ملفوظات عزیزی ۔ ص ۵۶ ،

شاہ صاحب کے اس قول سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ آپ فارسی زبان میں کافی دسترس رکھتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے مسلمانان ہند کے لیے دہلی کی فارسی زبان میں تحفہ اثنا عشریہ جیسی مایہ ناز کتاب تصنیف کی تھی ۔ اس کے علاوہ بھی آپ کی دیگر کتب فارسی زبان میں طبع ہوئی ہیں ۔

عربی زبان پر مکمل دسترس ہونے کے باعث شاہ صاحب نے عربی عبارت بہت عمدہ اور خوبصورت انداز سے تحریر فرمائی ہے ۔ آپ نے پانچ سال کی عمر میں حفظ قرآن کے بعد اپنی جولانی طبع اور تیزی ذہن کے باعث گیارہ سال کی عمر میں فارسی کتب کے ساتھ ساتھ عربی زبان کی ابتدائی کتب پر مکمل عبور حاصل کرلیا تھا ۔

اہل سنت والجماعت کے سربرآوردہ عالم و فاضل شاہ عبدالعزیز عبرانی زبان بھی جانتے تھے ۔ ان کے ملفوظات میں خود ان کی زبانی یہ الفاظ درج کیے گئے ہیں کہ :

" اکابر علماء میں سے عبرانی زبان کے جاننے والے کوئی فاضل میرے پاس آئے ۔ میں نے ان سے توریت تحقیق کی جو عبرانی زبان میں ہے ۔ چنانچہ انہوں نے توریت کی چند آیتیں مع ترجمہ کے پڑھ کر سنائیں " ۔[1]

شاہ صاحب کا یہ قول اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ شاہ صاحب عبرانی زبان سے واقفیت رکھتے تھے ۔ اور ضعیف العمری کے باوجود کافی شوق اور دلچسپی سے یہ زبان سیکھی تھی ۔

جماعت دیوبند کے پیشوائے اعظم شاہ عبدالعزیز مندرجہ بالا زبانوں کے علاوہ جغرافیائی معلومات میں ملکہ رکھتے تھے ۔ شاہ ولی اللہ کے مدرسہ رحیمیہ میں حدیث و تفسیر کے ساتھ ساتھ منطق و ریاضی کی بھی تعلیم دی جاتی تھی ۔ دوسرے طلباء کے ساتھ شاہ عبدالعزیز بھی اس عظیم درسگاہ کے ہر علم سے فیض یاب ہوئے ۔ آپ بہت چھوٹی عمر میں ایک ماہر ریاضی دان بن چکے تھے ۔ سوڈان کے حالات و واقعات پر لکھا ہوا شاہ عبدالعزیز صاحب کا قصیدہ اس بات کی پختہ دلیل ہے کہ آپ جغرافیائی معلومات پر مکمل عبور رکھتے تھے ۔ اس کے علاوہ

۱۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ، ملفوظات عزیزی ۔ ص ۲۷

مفتی انتظام اللہ شہابی نے تراجم الفضلاء میں شاہ عبد العزیز کی جغرافیائی علم کی وسعت کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ :

" روزے یک انگریز برائے ملاقات مولوی صاحب رفتہ بود ذکر در سفر دریا بعضے جزائر کہ سفائن را در انجا خطرہ ہا است افتاد۔ مولوی صاحب عرض و طول آن جزیرہ و خم و پیچ دریا وغیرہ بان تسط بیان کردند کہ فرنگی در حیرت افتادہ " ۔[1]

مندرجہ بالا واقعہ اس بات کی قوی شہادت ہے کہ شاہ صاحب اس میدان علم کے بھی ماہر شہسوار تھے ۔ کمالات عزیزی کے مصنف آپ کے اسی علم کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ :

" ایک بار مسٹر ولیم فریزر نے کہا کہ میں بحکم سرکار ولایت کابل جاتا ہوں ۔ حضرت مولانا نے حال راستہ مفصّل بیان فرمانا شروع کیا ۔ فریزر صاحب نے سب حال انگریزی میں لکھ لیا ۔ کسی مقام پر بفاصلہ بعید حضرت مولانا صاحب نے چند درخت اور ایک چاہ بیان فرمایا تھا ۔ فریزر صاحب جو وہاں پہنچے ۔ چاہ نہ تھا ۔ لوگوں سے پوچھا ۔ انہوں نے ناواقفیت بیان کی ۔ ہنگام واپسی صاحب موصوف اس جگہ قیام پذیر ہوئے اور موضع قریب کے باشندوں سے بلا کر دریافت کیا ۔ انہوں نے چاہ بتلایا اور کہا کہ زمین میں دب گیا ہے ۔ صاحب نے اس مقام کو کھدوا کر دیکھا تو واقعی چاہ تھا ۔ جب صاحب دہلی آئے اور جناب مولانا صاحب کے پاس حاضر ہوئے تو صاحب نے عرض کیا کہ جو راستہ میں آپ نے مقام و نشان بتلائے تھے سب پائے لیکن چاہ نہیں ملا حضرت نے فرمایا ۔ چاہ وہاں ضرور ہے ۔ مٹی میں دب گیا ہوگا " ۔[2]

اس واقعہ سے شاہ صاحب کی علم جغرافیہ کے متعلق غیر معمولی ذہانت ولیاقت کا پتہ چلتا ہے ۔

سراج الہند شاہ عبدالعزیز ان تمام علوم کے علاوہ کلام الٰہی کی تفسیر اور احادیث کی روشنی میں اس کے معانی کی تشریح و توضیح پر پوری توجّہ دیتے تھے ۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے

---

۱ ۔ انتظام اللہ شہابی " تراجم الفضلاء ۔ ص ، ۱۶

۲ ۔ مولوی ظہیر الدین سید احمد ، کمالات عزیزی ۔ ص ، ۳۲

والد بزرگوار سے حاصل کرنے کے ساتھ ہی بعض کتب احادیث کی سند اپنے والد کے جلیل القدر تلامذہ شاہ محمد عاشق پھلتی اور خواجہ امین اللہ کشمیری سے لی ۔ قرآن و حدیث کا بنظر غائر مطالعہ اور درس و تدریس آپ کا مقصد حیات تھا ۔ شاہ عبدالعزیز کی قرآن پاک و حدیث نبوی کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں صاحب تراجم الفضلاء رقمطراز ہیں :

"شاہ عبدالعزیز دھلوی ابن شاہ ولی اللہ محدث دھلوی کا برا من کابر درعلم حدیث وفقہ اصول وتمامی علوم عربیت خامہ لشت شہرہ اند وجناب مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب در صغر سن حفظ کلام مجید کردہ تجوید قرأت آموخت و در سیزدہ سالگی از تحصیل علوم رسمی فراغت حاصل کردہ چند گاہ بر مسند تدریس متمکن شدہ خلائق را با فاضہ علوم و اشاعت انوار احادیث بہرہ مند ساخت"۔[1]

شاہ صاحب اپنے والد بزرگوار کی مسند درس وارشاد پر متمکن ہوتے ہی احادیث نبوی کی تحقیق و تدوین ، اشاعت و تبلیغ ، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے ۔

شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی دھلی کے ماہر مدرس ، مصنف ، خطیب ، واعظ ، شیخ طریقت ، فقیہہ ، محدث ، مفسر عالم اور عارف کامل تھے ۔ آپ نے مسند درس و سلوک پر متمکن ہوتے ہی شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کے مطابق اصلاح امت کے لیے کام کرنا شروع کر دیا ۔ شاہ صاحب نے نہایت دلنشین و موثر اور سادہ وقابل فہم انداز میں درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا جس میں طلباء سے زیادہ عوام دلچسپی لینے لگے ۔ آپ نے درس و تدریس ، تصنیف و تالیف ، افتاء و فصل خصومات ، وعظ و پند اور علوم ومعارف دینیہ سے ملت اسلامیہ کی گران قدر خدمات سرانجام دیں محدثین ومشائخ کے قابل فخر استاد مولانا شاہ عبدالعزیز سیاسی انتشار اور ناسازگار حالات میں بھی اسلام وایمان کے قیام وفروغ اور بقا واستحکام کے لیے کوشاں رہے جیسا کہ صاحب اتحاف النبلاء رقمطراز ہیں کہ :

۱۔ انتظام اللہ شہابی ، تراجم الفضلاء ۔ ص، ۱۵، ۱۶

"خاندان ایشان علوم حدیث وفقہ حنفی ست خدمت این علم شریف چنانکہ ازین اہل بیت بوجود آمدہ درین کشور از خاندان دیگر معلوم و مسموع نیست تنغم عمل بالحدیث درحقیقت پدر ایشان درین سرزمین کاشتہ اند وایشان آنرا برگ وبار بخشیدہ اند دربلاد ہند جزفقہ حنفی ہیچکس علم حدیث وتمسک بدان در علم وعمل نمی شناخت" ۔[1]

گویا ہندوستان میں حدیث وفقہ کے علوم کا سلسلہ شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ اور آپ کے بھائیوں پر منتہی ہوا ۔

شاہ صاحب نے اپنی انتھک کوششوں اور مسلسل مساعی جمیلہ سے مسلمانوں میں اصلاحی روح پھونکتے ہوئے عظیم انقلاب پیدا کیا ۔ علوم کی تحقیقات اور مخالفین کے ساتھ مذاکرہ ومباحثہ میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز مقام رکھتے تھے ۔ شاہ صاحب نے علوم اسلامی کی اشاعت اور اہل سنت والجماعت کی حمایت وحفاظت اور علمی قابلیت کے باعث اپنے جلیل القدر خاندان کو تمام دنیا سے متعارف کروایا ہے ۔

شاہ صاحب کے عہد میں قرآن پاک صرف بیماروں کی جھاڑپھونک کے لیے کھولا جاتا تھا ۔ قرآن پاک سے اس بے توجہی اور بے رخی کو دور کرنے اور اسکی طرف شوق اور رغبت دلانے کے لیے شاہ ولی اللہ نے اس کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا تھا ۔ پھر ان کے بیٹوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے قرآن پاک کے اردو ترجمے کیے ۔ ان تراجم کے باعث لوگوں میں قرآن پاک پڑھنے اور سمجھنے کا شوق پیدا ہوا ۔ شاہ عبدالعزیز کی ان تبلیغی کوششوں سے قرآن پاک کی تعلیم کا میلان ورجحان اس حد تک بڑھا کہ مسجدوں اور خانقاہوں میں مدارس اور مکاتیب قائم ہوگئے ۔

ہندوستان کے جلیل القدر سپوت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ان تمام علوم میں مہارت تامہ رکھنے کے علاوہ موسیقی میں بھی یگانۂ روزگار تھے ۔ آپ کو یہ فن دوسرے علوم وفنون کی طرح اپنے والد بزرگوار سے وراثتاً ملا تھا ۔ شاہ ولی اللہ کے فن موسیقی میں ذوق ودلچسپی کا اندازہ ان

---

۱ - نواب صدیق حسن خان ، اتحاف النبلاء - ص ۲۹۷

کی تصحیح الفوز الکبیر سے ہوتا ہے جس میں وہ یونانیوں کے گانوں کے طریقے اور قواعد کے علاوہ اہل ہند کے مختلف راگوں سے تخلیق کردہ راگ اور راگنیوں کا تذکرہ بہت خوبصورت انداز میں کرتے ہیں ۔

چنانچہ اکثر تذکروں خصوصاً " نزہۃ الخواطر " تذکرہ شاہ ولی اللہ اور ملفوظات شاہ عبدالعزیز سے ان کے اپنے شوق اور دلچسپی کا پتہ چلتا ہے ۔ ملفوظات میں ہے کہ : جس وقت میری عمر چودہ برس کی تھی ۔ میں مزامیر نہیں سنتا تھا ۔ ایک شخص خیز شدہ ، جو میرے والد کا خلیفہ اور شاگرد تھا ۔ مزامیر سنا کرتا تھا ۔ اس نے ایک روز میں مجلس سرود و مزامیر کے وقت مجھے بھی بلایا ۔ میں گیا دیکھ کر متحیر ہوا ۔ ناچار بیٹھ گیا ۔ اس مجلس میں کسی قدر وجد بھی اس وقت تھا اور یہ شعر پڑھے تھے ؎

از مدرسہ بکعبہ روم یا بکیدہ — اے پیر رہ بگو کہ طریق صواب چیست ۔[1]

مندرجہ بالا واقعہ اس بات کی پختہ دلیل ہے کہ شاہ صاحب اپنے عہد شباب میں ہی فن موسیقی سے واقف تھے ۔ صاحب نزہۃ الخواطر بھی آپ کے اس فن کے بارے میں رقمطراز ہیں :

" وکانت لہ مھارۃ فی الرمی والفروسیۃ والموسیقی " ۔[2]

شاہ صاحب ملفوظات میں خود رقمطراز ہیں کہ : " میں نے اپنی جوانی میں ایک خوش گو قصہ گو کی آمد کے بارے میں سنا ۔ احباب کے رغبت دلانے سے میں نے اس کے پاس جانے کا ارادہ کیا ۔ دفعتاً میرے کان میں مزامیر اور رقص کی آواز آئی ۔ میں نے ایک دیوار کے پیچھے بیٹھ کر اس کو سننا چاہا ۔ جوں ہی میں بیٹھا مجھے نیند آگئی ۔ جب آنکھ کھلی ، صبح تھی ۔ دوسری مرتبہ بھی اس طرح سے ماجرا پیش آیا تھا " ۔[3]

١۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ، ملفوظات عزیزی ۔ ص ٣٠

٢۔ سید عبدالحئی لکھنوی ، نزہۃ الخواطر ۔ جلد ۔ ٧ ، ص ٢٦٩

٣۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ، ملفوظات عزیزی ۔ ص ٩٠

اس واقعہ سے شاہ صاحب کے فن موسیقی میں انتہائی شوق کا پتہ چلتا ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک کون کون سے آلات مزامیر سے خارج ہیں۔ اس سلسلے میں آپ نے فرمایا ہے کہ "اس باب میں بہت کچھ دیکھا اور سنا ہے۔ بعض محققین نے کہا ہے کہ ہر وہ آلہ جس سے حرف وصوت کی آواز پیدا ہو جیسے سارنگی اور ستار وغیرہ کہ تمہیں الفاظ خوب کرتے ہیں، حرام ہیں بخلاف طنبورہ کے، کہ وہ آواز مطلق نہیں کرتا مگر حرام ہونے کی کوئی علت ظاہر نہیں کی"۔ پھر فرماتے ہیں کہ "ایک دن ایک شخص نے سوال کیا۔ میں اس کے جواب دینے میں حیران تھا۔ اچانک القا ہوا۔ مزامیر کی حرمت کی وجہ یہ ہے کہ محض اچھی آواز جس سے اچھے معنی کے الفاظ ظاہر کیے جائیں اور جس سے عقل میں ایک کیفیت سرور پیدا ہوتی ہو اور پھر قلب حرکت میں آ جاتا ہو۔ اس فائدہ کی خاطر ایسی آواز کو مباح کیا گیا ہے اور مزامیر کی آواز جو محض ایک بے معنی آواز ہے اور جس سے طبیعت میں جوش پیدا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ قلب بھی مسرور ہوتا ہے۔ لہذا ان مزامیر کو ممنوع قرار دیا گیا ہے کیونکہ طبیعت کو اتنا جوش میں لانا شریعت میں مقصود نہیں ہے۔ دف اور غازیوں کے طبل (ڈھول) وغیرہ جن کو آنحضرت نے سنا ہے۔ اور ان کے سننے سے آپ نے منع نہیں فرمایا، اس علت سے یہ چیزیں حرمت سے مستثنیٰ ہیں"۔[1]

گویا شاہ صاحب نے اسلامی شریعت کے مطابق مزامیر کے معنی کی وضاحت کرتے ہوئے ان وجوہات کو بیان کر دیا ہے جن کے تحت مزامیر کو مباح اور ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

شاہ صاحب عہد شباب میں فن موسیقی کے دلدادہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین استاد بھی تسلیم کیے جاتے تھے لیکن ایام جوانی میں ہی جب کہ آپ کی عمر پچیس[25] برس تھی، متعدد مہلک امراض میں مبتلا ہو چکے تھے اور اب فن موسیقی میں پہلے کی طرح دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اگر اس دوران میں بھی کبھی موسیقی سننے کو دل چاہتا ہے تو ان مہلک امراض کے باعث مزامیر سننے سے گریز کرتے، مبادا طبیعت میں ہیجان برپا ہو جائے جس کا اظہار آپ کے اس قول سے ہوتا ہے کہ

۱۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، ملفوظات عزیزی، ص ۲۱، ۲۲

"ایک شخص اپنی اصطلاح کے مطابق مستی کی حالت میں کچھ گا رہا تھا ۔ آپ نے سنا تو ارشاد فرمایا کہ دھدا سری ہے یا ایمن یا ملتانسی اور پھر گانے کی دوسری قسموں کو بیان فرمایا ۔ پھر فرمایا کہ پہلے مجھے اس فن سے بڑی دلچسپی تھی چنانچہ اس فن کے مشہور لوگ ، میرے پاس پوچھنے آتے تھے۔ اب میں نے اس میں حصّہ لینا ترک کر دیا ہے ۔ لیکن لوگ اب بھی آجاتے ہیں مگر مجھے اس سے ضرر پہنچتا ہے کیونکہ قلب میں ایک ہیجان کی سی کیفیت ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے مرض لاحق ہوتا ہے"۔[۱]

لیکن اشتداد مرض کے اس دور میں بھی شاہ صاحب کا شوق موسیقی اسی طرح برقرار رہا اور اگر معلوم ہوتا کہ کوئی شخص خوش آواز ہے تو طبیعت کی ناخوشگواری کے باوجود بھی کچھ نہ کچھ سننے کے لیے تیار ہو جاتے ۔ ملفوظات میں آپ کا یہ قول اس امر کی واضح دلیل ہے کہ "ایک قوال اپنے نومولود بچے کا نام معلوم کرنے کے لیے حاضر ہوا ۔ حضرت نے سلام یا سلامت اللہ نام فرمایا پھر اس قوال سے آپ نے فرمایا کہ کچھ دھدا سری میں سناؤ ۔ مدرسہ شریف میں قوال نے کچھ گایا اور پھر دوسرا کلام شروع کیا ۔ فرمایا کہ وہی خوب تھی ۔ اس میں مجاز بہت غالب ہے ۔ تھوڑی دیر بعد ایک مرید کی طرف دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ پہلے میرے سر میں جو درد ہو رہا تھا ، گانا سننے سے جاتا رہا اور سر میں جو کپڑا درد کی وجہ سے بندھا ہوا تھا اسکی گرہ کھول دی"۔[۲]

اگرچہ شاہ صاحب کو بے شمار امراض نے گھیر لیا تھا ۔ اور آپ موسیقی میں بہت کم دلچسپی لینے لگے تھے لیکن آہستہ آہستہ یہ دلچسپی ختم ہوگئی جیسا کہ فرماتے ہیں کہ " دو مہینے ہوتے ہیں کہ میں حضرت سلطان المشائخ کی زیارت کو گیا تھا ۔ عجیب کیفیت تھی کوئی مرزا مور کے ساتھ گا رہا تھا لیکن مجھے مطلق ظلمت پیدا نہ ہوئی اور میں نے اس کے گانے کی طرف بھی توجّہ نہیں کی ۔ پھر کسی نے سجدہ کیا ۔ اس کی ظلمت نے میرے اوپر اثر کیا"۔[۳]

۱۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ، ملفوظات عزیزی ۔ ص ۸۶۔

۲۔ ایضاً ۔ ص ۶۵۔

۳۔ ایضاً ۔ ص ۱۰۸۔

شاہ صاحب کے ملفوظات کے مندرجہ بالا اقتباسات اس بات کی پختہ اور مضبوط شہادت پیش کرتے ہیں کہ آپ فن موسیقی کے علمی پہلوؤں میں مکمل مہارت رکھتے تھے - گویا ان امراض کے دوران میں شاہ صاحب نے موسیقی میں بہت کم دلچسپی لی اور شاہ صاحب کے اس شوق میں اس حد تک کمی آگئی کہ رجحان و میلان قرآن کی تفسیر اور حدیث و سنت کی طرف بڑھتا گیا - شاہ صاحب کے قول کے مطابق انہوں نے ایک سو پچاس علوم کا مطالعہ کیا ہے - آپ کے ان الفاظ سے آپ کے طلب علم کی وسعت کا پتہ چلتا ہے -

ملفوظات کے ان اقتباسات کی روشنی میں ہم شاہ صاحب کے اس فن کے بارے میں کسی تصنیف کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اس سلسلے میں ان کی کوئی تصنیف بھی موجود ہے یا نہیں لیکن شاہ صاحب کے مشہور سوانح نگار ضد الدین کی تحقیق کے مطابق شاہ صاحب کی ایک تصنیف " سانگیت شاستر " رضا لائبریری رام پور کے ذخیرہ کتب سے ملی ہے - یہ کتاب فارسی زبان میں سولہ صفحات اور تین ابواب پر مشتمل ہے -

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ رسالہ شاہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے تو اگر یہ مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کی ہی تصنیف ہے تو آپ کے کسی ہم عصر ، استاد یا شاگرد نے کسی تصنیف میں اشارتاً بھی اس رسالے کا ذکر کیوں نہیں کیا - تو اس کا جواب ناممکن نہیں - شاہ صاحب کے ملفوظات کے اقتباسات سے آپ کی فن موسیقی میں طبعی ذہانت و واقفیت ، علمی دلچسپی اور انتہائی شوق کا پتہ چلتا ہے لیکن بعض اقوال اس بات کی قوی شہادت ہیں کہ شاہ صاحب نے اپنی عمر کے آخری حصے میں بے شمار مہلک امراض کے باعث فن موسیقی میں دلچسپی لینی کم کردی تھی اور علوم دینیہ خصوصاً حدیث و تفسیر کی طرف توجہ دینی شروع کردی تھی تو عین ممکن ہے کہ آپ نے یہ رسالہ جوانی کے زمانہ میں تحریر فرمایا ہو اور وقت کے ساتھ ساتھ جب آپ نے مدرسہ رحیمیہ میں مسلمانان ہند کو درس دینا شروع کیا ہو تو آپ کے شاگردوں نے آپ کے اس فن میں زیادہ دلچسپی نہ لینے کے باعث اس کو خاص اہمیت نہ دی ہو یا پھر اس فن کو آپ کی شخصیت سے منسلک

کرنے کو مناسب نہ سمجھتے ہوئے اس رسالے کا کہیں بھی ذکر نہ کیا ہو۔ عضد الدین کے نزدیک اس رسالے کا اسلوب بیان آپ کی دیگر فارسی تصانیف کے اسلوب سے ملتا ہے گویا ممکن ہے کہ آپ کے فن موسیقی میں شوق کے مدھم ہونے کے باعث اس رسالے کی طرف کسی کی توجہ مائل نہ ہوئی ہو اور یہ کتب کے انبار میں ویسے کا ویسے ہی پڑا رہ گیا ہو۔ بہرحال شاہ صاحب فن موسیقی میں یقینا" دلچسپی رکھتے تھے کیونکہ جن علماء وفضلاء یا شاگردوں کے ذریعے روایات ہم لوگوں تک پہنچتی ہیں وہ شاہ صاحب کی صحبت میں رہتے ہوئے آپ کی شخصیت کے ہر پہلو سے بخوبی واقف تھے۔ لہذا انہوں نے آپ کے اس فن میں ماہر ہونے کے جو شواہد پیش کیے ہیں وہ بالکل درست ہیں۔

شمس الہند شاہ عبدالعزیز صاحب ذکاوت و ذہانت، فہم وفراست اور سرعت حافظہ کے ساتھ ساتھ ظرافت طبعی اور برجستہ جوابی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ پندرہ برس کی عمر میں مدرسہ رحیمیہ میں درس و تدریس سے خلق کثیر کو فیوض علمی و دینی سے مالا مال کیا۔ شاہ صاحب کے غیر معمولی حافظے اور قوت ادراکیہ میں بچپن سے لے کر ضعیف العمری تک اضافہ ہی ہوتا گیا۔ ملفوظات میں اپنے بچپن کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ "میں پانچ چھ سال کا تھا کہ والد ماجد نے ایک مسئلہ بیان کیا وہ شافعی مذہب کے مطابق نکلا"۔[1]

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی درس و تدریس کے زمانہ میں اچھی یادداشت کے بل بوتے پر غیر مشہور کتابوں کی طویل عبارتیں اپنے طلبا کو لکھواتے طویل عرصے کے بعد ان عبارتوں پر غور وخوض کرنے اور اصل کتابوں سے مقابلہ کرنے پر ذرا سا بھی فرق دکھائی نہ دیتا سرسید احمد خان آپ کے حافظے کی ان الفاظ میں تعریف کرتے تھے کہ "حافظہ آپ کا نسخہ لوح تقدیر تھا۔ بارہا اتفاق ہوا کہ کتب غیر مشہورہ کی اکثر عبارات طویل اپنی یاد کے اعتماد پر طلباء کو لکھوا دی تھیں اور جب اتفاقا" کتابیں دستیاب ہوئیں تو دیکھا گیا کہ جو عبارت آپ نے لکھوا دی تھی اس میں من وعن کا فرق نہ تھا"۔[2]

گویا شاہ صاحب اس قدر ذہین وفطین تھے کہ کسی تحریر یا قصیدے کو ایک مرتبہ پڑھتے یا سنتے تو آپ کے لوح حافظہ پر نقش ہو جاتا۔ مفتی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ "ایک دفعہ کلکتہ

۱۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، ملفوظات عزیزی۔ ص، ۲۷

۲۔ سرسید احمد خان، آثار الصنادید۔ ص، ۷۰

کے سفر میں شاہ صاحب نے قاموس کا ایک نسخہ دیکھا تھا ۔ مدتوں کے بعد ناپید ہو جانے پر وہ دھلی میں فروخت کے واسطے دست بدست شاہ صاحب کے مدرسہ میں پہنچا ۔ شاہ صاحب نے ہاتھ میں لے کر فرمایا یہ وہ نسخہ ھے جس کو میں نے دیکھا ھے پھر فرمایا کہ دیکھو فلاں حاشیہ پر یہ عبارت تو نہیں لکھی ہے ۔ دیکھا گیا تو وہی تھی ۔ آخر میں معلوم ہوا کہ یہ وہی نسخہ ھے"۔[1]

شاہ صاحب کی زھانت وفطانت کا صرف یہی ایک واقعہ نہیں بلکہ تاریخ کی کتابیں ان واقعات سے بھرپور ھیں ۔ شاہ صاحب نے تحفہ اثنا عشریہ کی تصنیف کے وقت اپنی غیر معمولی قوت حافظہ کو بروئے کار لاتے ہوئے تمام دقیق علمی مسائل ونکات کے حل اور حوالہ جات کے لیے شیعوں کی کتابوں کی عبارتیں اور روایتیں زبانی لکھی تھیں کہ شیعہ حضرات صرف ان کتابوں کے ناموں سے ہی واقف تھے ۔

شاہ صاحب سخت جسمانی امراض میں مبتلا ہونے کے باوجود بھی قوی الحافظہ تھے مجلس درس وتدریس میں علمی ودینی رموز ونکات نہایت سرگرمی و مستعدی سے بیان فرماتے کہ سننے والوں پر استغراق ومحویت کی کیفیت طاری ہو جاتی ۔ مولانا رشید الدین صاحب بیان کرتے ہیں کہ " جب شاہ صاحب معذور ہوگئے اور امراض سخت میں گرفتار ہوگئے تو مراق کی وجہ سے اکثر مدرسہ میں ٹہلا کرتے تھے ۔ اسی دوران میں بعض لوگ سبق بھی پڑھا کرتے تھے ۔ چنانچہ میں مقامات حریری پڑھتا تھا ۔ آگے آگے شاہ صاحب اور پیچھے پیچھے میں مقامات لئے پڑھتا جاتا تھا ۔ مقامات کی عبارت دو فقری تھی ۔ میں ایک فقرہ پڑھتا تھا تو دوسرا شاہ صاحب معاً پڑھ دیتے تھے یا تو یہ فقرہ وہی ہوتا تھا جو کتاب کا ہوتا یا ان ہی کا ہوتا تھا جو کتاب کے فقرہ سے زیادہ چست اور اچھا ہوتا تھا ۔ یہ اس وقت کا ذکر ھے جب کہ شاہ صاحب کو چودہ امراض مہلک عارض ہو گئے تھے کہ اگر ان میں سے ایک مرض بھی خدا نخواستہ دوسرے کو لاحق ہو تو سلب حواس کے واسطے کافی ھے"۔[2]

۱۔ سید عبدالحئی لکھنوی ، دھلی اور اسکے اطراف ۔ ص ، ۱۰۹

۲۔ ایضاً ۔ ص ، ۱۰۸ ، ۱۰۹

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود ان متعدد امراض اور ضعف العمری کے شاہ صاحب اپنی قوت حافظہ کے باعث باطنی فیوض کی برکات اور قویٰ روحانی کی حدت سے لوگوں کے دلوں کو منور کرتے تھے۔

حکومت ہند نے آپ کو علامہ تفضّل حسین کے ذریعہ کلکتہ کے مدرسہ عالیہ کی صدارت کی پیش کش کی لیکن آپ نے شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کو عوام تک پہنچانے، درس و تدریس اور وعظ و خطابت سے عوام الناس کو رشد وہدایت کی طرف لانے اور علوم اسلامی کی اشاعت کو اس دنیاوی عز وجاہ پر ترجیح دی اس سے قبل بھی عالمگیر بادشاہ نے آپ کے دادا شاہ عبدالرحیم کو فقہ حنفی کے فتاوی کے ترتیب کرنے کے لیے علماء کے بورڈ کا ممبر بنانا چاہا لیکن آپ نے دنیاوی عزت وعظمت پر جذبۂ خدمت خلق کو ترجیح دی۔ اس خاندان کے صبر وضبط، جفاکشی، محبت وشفقت اور تمام مادی اغراض سے بالاتر ہوکر مخلوق خدا کی خدمت اور اس کے لیے ہر قسم کی قربانی کے جذبے کی صرف یہی ایک مثال نہیں بلکہ اکثر لاتعداد واقعات موجود ہیں۔ دلّی میں وبا پھیلنے پر مسلمانوں نے جامع مسجد میں جمع ہوکر دوگانہ پڑھنے اور دعا کرنے کا فیصلہ کیا جب بادشاہ کی طرف سے اجتماع کے انتظامات مکمل ہوگئے تو بادشاہ کی طرف سے ایک خاص ایلچی نے شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر ان سے اجتماع میں شرکت کی درخواست کی جب آپ وقت مقررہ پر آمادہ ہوئے جامع مسجد پہنچے تو عین اسی وقت بادشاہ کی سواری پہنچی۔ "ملفوظات" میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ "میں جامع مسجد کی سیڑھیوں پر تھا کہ بادشاہ آگئے اور سلام و مصافحہ کے بعد مجھ سے کہا کہ آپ کا بہت حرج ہوا۔ میں نے کہا کہ آپ کی اور خلق خدا کی خاطر اگر کچھ وقت صرف ہوجائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ پھر مجھ سے درخواست کی کہ میں مولوی رفیع الدین صاحب کو امامت کرنے کے لیے کہوں۔ میں نے بادشاہ سے کہا کہ جامع مسجد کے امام آپ کے تابعدار ہیں آپ ان کو حکم دیں وہ ضرور اس کی پیروی کریں گے۔ پس بادشاہ نے جاکر امام مسجد کو طلب کیا اور ان کو نماز کی بابت فرمایا۔ میں نے بھی ایک گوشے میں نماز دوگانہ ادا کی۔ پھر بادشاہ نے مجھے اپنے پاس بلایا جس میں نے علیحدہ بیٹھنے کی معذرت کی لیکن بادشاہ نے مجھے اپنے قریب بٹھایا پھر بھی میں بادشاہ

سے ایک بالشت کے فاصلہ پر بیٹھا ۔ توبہ ، کلمہ اور دعا کی تعلیم وتلقین کا سلسلہ رہا پھر شاہ غلام علی صاحب کی تشریف اور ان کی خوبیوں کا تذکرہ ہوا ۔ میں نے بادشاہ سے کہا کہ ان کو آپ یہاں طلب فرمائیں بادشاہ (اکبر ثانی) نے ان کو بلوایا ۔ پھر سب نے دعا کی خدا قبول فرمائے" ۔[1]

مسلمانان ہند کے لیے شاہ صاحب کی دینی خدمات کی صرف چند ایک ہی مثالیں نہیں بلکہ بے شمار اور بھی واقعات ہیں ۔

مناظروں کا سلسلہ اگرچہ عہد اکبری میں ہی شروع ہو چکا تھا لیکن شاہ عبدالعزیز کے زمانے میں مناظروں نے ایک مکمل شکل اختیار کر لی تھی اور شاہ صاحب ان میں شامل ہونے کو دینی خدمت سمجھتے تھے ۔شاہ عبدالعزیز صاحب سے پہلا مناظرہ دارالسلطنت دہلی کی جامع مسجد میں ایک عیسائی کے ساتھ ہوا تھا ۔ " شاہ صاحب درس قرآن دے رہے تھے کہ دوران درس میں ایک انگریز مناظرہ کے لیے آپ کے پاس آیا ۔ عربی وفارسی میں دستگاہ کامل رکھتا تھا ۔۔۔۔ اس نے آتے ہی عرض کیا کہ حضرت میرے سوال کا جواب دیجئے ۔ آپ نے فرمایا کہو ۔ اس نے ایک شعر پڑھا ۔۔۔

کسے بگفت کہ عیسی ز مصطفی اعلی است
کہ این بزیر زمین دفن و آن باوج سماست

اور کہا اس شعر سے بلندی رتبہ حضرت عیسی علیہ السلام ظاہر ہوتی ہے کہ وہ آسمان پر ہیں اور آپ کے نبی زیر خاک ۔

حضرت مولانا صاحب نے اسی وقت شعر اس کے جواب میں پڑھا ۔۔۔

بگفتمش کہ نہ این حجت قوی باشد
حباب برسر آب و گہر تہ دریاست ۔[2]

۱۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ، ملفوظات عزیزی ۔ ص ۷۸ ،

۲۔ مولوی ظہیرالدین سید احمد ، کمالات عزیزی ۔ ص ، ۳۵

شاہ صاحب ان تمام خوبیوں اور صفات سے متصف ہونے کے ساتھ ساتھ وعظ و تقریر میں بھی ملکہ رکھتے تھے۔

شاہ صاحب کی سلجھی ہوئی معجزانہ تقریر میں بلا کا جادو تھا۔ آپ کی شیوا بیانی کا ہر موافق و مخالف پر یکساں اثر ہوتا تھا۔ صاحب اتحاف النبلاء رقمطراز ہیں کہ:

"در کثرت حفظ وعلم" تبحیر روئیا و سلیقہ وعظ و انشا و تحقیقات نفائس علوم و مذاکرہ ومباحثہ بالخصوص ممتاز اقران بودند ومعتقد فیہ موافق ومخالف تمام عمر در تدریس افتاد و فصل خصومات و وعظ و تربیت مریدان و تکمیل شاگردان گزار دہند"۔[۱]

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا آخری درس آیت "اعدلوا ھو اقرب للتقوی" کی تفسیر تھا۔ یہاں سے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے تفسیر شروع کی اور ان کا آخری درس "ان اکرمکم عنداللہ اتقکم" کی تفسیر تھا۔ مرض کی شدت کے بعد وعظ سے کچھ دیر قبل غذا بالکل ترک کر دی تھی۔ ابتداء میں آپ کو خفیف سی تبخیر ہوئی پھر آہستہ آہستہ طبیعت کچھ بحال ہوئی۔ لیکن وقتاً فوقتاً مرض شدت اختیار کر جاتا تھا۔ اس اضطراری کیفیت میں بھی فرائض وسنن ان کے صحیح اوقات میں ادا کرتے تھے۔ چنانچہ وعظ کے دن آپ نے حاضرین سے فرمایا کہ مجھے اٹھا کر بٹھا دو۔ اور دو آدمی میرے مونڈھے پکڑے رہو لیکن جب بیان کرنا شروع کروں تو دونوں شخص مجھے چھوڑ کر علیحدہ ہو جائیں چنانچہ آپ کے ارشاد کی فوراً تعمیل ہوئی آپ ناتوانی اور کمزوری کی اس حالت میں اطمینان سے وعظ فرماتے رہے۔ وعظ کے بعد ہاتھ اٹھا کر تمام مسلمانوں کے لیے رب ذوالجلال کے حضور نہایت خشوع وخضوع سے دعا کی اس کے بعد آیت "ذوی القربی والیتٰمی والمسٰکین وابن السبیل" کی تلاوت فرمائی۔ پھر آپ کے ارشاد کی تعمیل پر تمام نقد وجنس اور مال واسباب ایک جگہ جمع کر دیا اور مذکورہ بالا آیت کے مطابق تمام جائز وارثوں کے حصے اپنے ہاتھ سے تقسیم کیے بعد ازاں معرفت الٰہی کے رنگ میں ڈوبے ہوئے

۱۔ نواب صدیق حسن خان، اتحاف النبلاء۔ ص، ۲۹۶

چند عربی وفارسی اشعار نہایت دردناک لہجہ میں ادا کیے۔ پھر اپنی تجہیز وتکفین کے بارے میں کچھ ضروری ہدایات دیں کہ مجھے اسی کپڑے کا کفن پہنایا جائے جو میں پہنتا ہوں نیز غسل کے وقت ارکان غسل / سنن میں سے کوئی رکن ترک نہ ہو۔ سلطان وقت کو میری نماز جنازہ اور جنازے میں شمولیت کے لیے مدعو نہ کیا جائے۔ اس کے بعد ذکر وعبادت میں مصروف ہوگئے۔ ہندوستان کا یہ آفتاب علم وحکمت ۲ شوال بروز اتوار ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء میں بعد نماز فجر غروب ہوگیا۔

" اناللہ وانا الیہ راجعون " اس وقت آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے توفنی مسلما" والحقنی بالصالحین " چنانچہ اس جلیل القدر خاندان کی قابل ولائق ، فخر روزگار ، فرید عصر اور یگانہ روزگار شخصیت کی وفات پر تمام لوگوں نے صبر واستقلال کا بھرپور مظاہرہ کیا۔

شاہ محمد اسحاق نے ترکمان کے دروازے کے باہر آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ اس کے بعد نصیر الدین صاحب شافعی لکھنوی کے مقبرہ میں نماز جنازہ ہوئی۔ پچپن مرتبہ آپ کی نماز جنازہ پڑھی گئی اور پورے ملک سے جوق در جوق لوگ اس میں شامل ہوئے۔

مومن خان مومن نے آپ کی وفات پر ایک پر درد اور پر سوز مرثیہ تحریر کیا۔ جس کے آخری مصرع سے آپ کی تاریخ وفات نکلتی ہے ۔۔

فقر ودین وفضل وہنر و لطف وکرم علم وعمل

آپ کے ایک ہمعصر شاعر حسن نے بھی آپ کی تاریخ وفات کا ایک قطعہ لکھا۔ علاوہ ازیں امام ربانی مجدد الف ثانی کی اولاد میں سے حضرت مولانا شاہ رؤف احمد نے بھی ایک قطعے میں آپ کی تاریخ وفات کہی ہے۔ یہ قطعات کمالات عزیزی اور آثار الصنادید کے علاوہ متعدد کتب میں موجود ہیں۔

شاہ صاحب کی اولاد میں تین صاحبزادیاں تھیں۔ ان کے ہاں کوئی اولاد نرینہ پیدا نہ ہوئی اور یہ تینوں صاحبزادیاں آپ کی زندگی میں ہی وفات پا گئیں۔ سب سے بڑی بیٹی کا عقد مولوی محمد عیسی (شاہ رفیع الدین کے بڑے بیٹے) سے ہوا۔ دوسری صاحبزادی کا عقد شیخ محمد افضل

سے ہوا اور ان سے دو بیٹے مولانا محمد اسحاق اور مولانا محمد یعقوب صاحب پیدا ہوئے ۔ تیسری بیٹی کا نکاح شاہ صاحب کی بیوی کے بھتیجے عبدالحئی بڈھانوی سے ہوا تھا لیکن ان کے ہاں بھی کوئی اولاد نہ ہوئی ۔

شاہ صاحب کے خاندان کے متعلق چند غلط روایات :

تاریخ میں اکثر وبیشتر ایسا ہوتا ہے کہ کسی اہم شخصیت کے متعلق قیاس آرائی سے کچھ فرضی کہانیاں اور غیر تاریخی واقعات وضع کرکے اس سے منسوب کردیے جاتے ہیں ۔ کبھی کبھی ان افسانوں کو گھڑنے والے ایسے عقیدت مند اکابر اور ثقہ راوی ہوتے ہیں کہ جن کے بے بنیاد قصّوں کو ان کی ثقاہت کی بنا پر درست تسلیم کرلیا جاتا ہے ۔ اسی سلسلے میں شاہ عبدالعزیز اور ان کے خاندان سے چند غلط روایات کو منسوب کیا گیا ہے ۔ تاریخی حقائق کی روشنی میں ان کا تجزیہ کرنے سے یہ بات بخوبی ثابت ہوگئی ہے کہ یہ روایات غلط اور بے بنیاد قصّوں پر مبنی ہیں ۔

امیر شاہ خان "امیر الروایات" میں شاہ عبدالعزیز کے متعلق اس طرح روایت بیان کرتے ہیں کہ "اس زمانے میں روافض کا نہایت غلبہ تھا چنانچہ دہلی میں نجف علی خان کا تسلّط تھا ۔ جس نے شاہ ولی اللہ کے پہنچے اتروا کر بیکار کردیے تھے تاکہ وہ کوئی کتاب یا مضمون تحریر نہ کرسکیں ، مرزا مظہر جان جاناں کو شہید کرا دیا تھا اور شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ رفیع الدین کو اپنی قلمرو سے نکال دیا تھا اور ہر دو صاحبان مع زنانوں کے شاہدرہ تک پیدل آئے تھے ۔ اس کے بعد مولانا فخرالدین صاحب کی سعی سے زنانوں کو تو سواری مل گئی تھی اور وہ پھلت روانہ ہوگئے تھے مگر شاہ عبدالعزیز صاحب پیدل جونپور چلے گئے تھے کیونکہ ان دونوں کو سوار ہونے کا حکم نہ تھا اور نہ ساتھ رہنے کا اور دو دفعہ روافض نے شاہ صاحب کو زہر دیا تھا اور ایک مرتبہ چھپکلی کا ابٹن ملوا دیا تھا جس سے شاہ صاحب کو برص اور جذام ہوگیا تھا اور جونپور کے سفر میں شاہ صاحب کو لو بھی لگی تھی جس سے مزاج میں سخت حدّت پیدا ہوگئی تھی ۔ اس سے جوانی میں بینائی جاتی رہی تھی اور ہمیشہ سخت بے چین رہتے تھے" ۔[1]

---

۱ ۔ اشرف علی تھانوی ، امیر الروایات ۔ ص ۲۲۰

شاہ صاحب کی اس روایت کو اکبر اکابر علماء مثلاً" مولانا مناظر احسن گیلانی ، مولانا محمد میاں اور مفتی انتظام اللہ شہابی نے شاہ عبدالعزیز کے سوانح کے تحت اپنی کتب میں نقل کیا ہے ۔ تعجّب ہے کہ ان علماء نے بھی ان روایات کو تحقیق اور تنقید کے بغیر ہو بہو نقل کر دیا ۔

امیر شاہ خان کی اس روایت کی مکمل تحقیق سے قبل مرزا نجف علی خان کے کچھ حالات جاننا ضروری ہے ۔ ایران کے شاہی خاندان کا یہ بہادر سپوت اٹھارہ سال کی عمر میں ھندوستان آیا ۔ یہاں محمد قلی خان (الہ آباد کے قلعہ کے عامل) اور میر قاسم کے ہاں ملازمت اختیار کرنے کے بعد ۱۷۷۱ء میں شاہ عالم کی ملازمت اختیار کی ۔ شاہ عالم نے اس کی بہادری اور کارھائے نمایاں سے متاثر ہو کر اس کو ذوالفقار الدولہ نواب نجف خان غالب جنگ کا خطاب دیا ۔ اس کے بعد وہ امیر الامراء[39] کے عہدے پر فائز ہوا اور دس سال (۱۷۷۲ء سے ۱۷۸۲ء تک) دھلی پر حکومت کرنے کے بعد انچاس برس کی عمر میں ۸ جمادی الآخر ۱۱۹۶ھ مطابق ۲۲ اپریل ۱۷۸۲ء میں دھلی میں وفات پا گیا۔

دھلی پر نجف خان کی حکومت ۱۷۷۲ء سے دس سال پیشتر ۱۷۶۲ء میں شاہ ولی اللہ انتقال فرما چکے تھے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کا کوئی سانحہ نجف خان کے عہد میں نہیں ہوا لیکن اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ آپ کے ہاتھوں کے پانچے نجف خان نے نہیں کسی اور شیعہ نے اتروائے تو پھر شاہ ولی اللہ کے کسی شاگرد ، ہم عصر اور صاحبزادے نے اس واقعہ کا ذکر کیوں نہیں کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ واقعہ سراسر بے بنیاد ہے ۔

شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی اپنے والد بزرگوار شاہ ولی اللہ کی وفات ۱۷۶۲ء میں سترہ برس کے تھے ۔ نجف خان کے دھلی پر تسلّط کے وقت آپ کی عمر ۲۷ برس تھی اور نجف خاں کے انتقال کے وقت آپ کی عمر سینتیس برس ہوتی ہے ۔[37]

امیر شاہ خان کی روایت کے مطابق نجف خان نے شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کو اپنی قلمرو سے نکال دیا تھا ، شاہ رفیع الدین پیدل لکھنؤ گئے تھے اور شاہ عبدالعزیز پیدل جونپور گئے تھے۔[20]

نجف خان متعصّب ایرانی شیعہ تھا لیکن شاہ صاحب کی چالیس برس کی عمر یعنی تقریباً" مرزا نجف کے عہد تک آپ کی کوئی بھی تصنیف شیعیت کے خلاف یا رَدّ میں دکھائی نہیں دیتی جس

کی بنا پر نجف خان آپ کو اور آپ کے اہل وعیال کو شہر بدر کر دیتا بلکہ شاہ صاحب کی کتاب "سیر الشہادتین" اسی زمانے کی تصنیف کردہ ہے۔ جس میں اکثر باتیں شیعی نقطہ نظر کے مطابق ہیں۔ اسی لیے اس تصنیف پر کسی شیعہ کو اعتراض بھی نہیں ہے۔ آپ کی اس تصنیف کے باعث متعدد لوگ آپ کو شیعہ سمجھتے تھے۔ اس کی تائید میں ملفوظات کا ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ "حافظ آفتاب ہمیشہ میرے درس میں شامل ہوتے تھے۔ ایک روز حضرت علی کا ذکر شروع ہوا جیسا کہ سنیوں کی عادت ہے کہ کسی صحابی کا ذکر ہو تو جان و دل سے اس کے فضائل و مناقب بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح شاہ صاحب نے حضرت علی کے مناقب بیان کرنے شروع کیے۔ اس روہیلہ پٹھان نے آپ کو شیعہ سمجھ لیا اور درس میں آنا بھی موقوف کر دیا"۔[1]

گویا اہل بیت کے فضائل و مناقب بیان کرنے کی بنا پر اس زمانے میں اکثر لوگ شاہ صاحب کو شیعہ سمجھتے تھے مندرجہ بالا توضیح کے بعد اگر یہ کہا جائے کو شاہ صاحب نے شیعوں کے خلاف کوئی اقدام اختیار کیا تھا تو بالکل غلط ہے۔

شاہ صاحب نے تفسیر فتح العزیز اور تحفہ اثنا عشریہ چالیس برس کی عمر کے بعد لکھی تھیں۔ اگرچہ شاہ صاحب کی تحفہ اثنا عشریہ شیعوں کے خلاف سب سے اہم تصنیف ہے۔ اگر شیعہ حضرات اس وجہ سے آپ کے خلاف ہوئے بھی ہوں تو کچھ کہا نہیں جا سکتا لیکن وہ لوگ آپ کو اس ناکردہ جرم کی پاداش میں ایسی کوئی سزا نہیں دے سکتے تھے بلکہ انہوں نے تحفہ کا جواب اس کے رد سے دیا تھا اور پھر تحفہ اثنا عشریہ نجف خان کے عہد کے بعد کی تصنیف ہے۔ اس کتاب کو آپ نے ۱۲۰۴ھ مطابق ۹۰-۱۷۸۹ء میں تصنیف کیا جبکہ نجف خان آٹھ برس پہلے ۱۷۸۲ء میں انتقال کر چکا تھا اور اگر یہ تصور کیا جائے کہ نجف خان کے بعد کسی اور شیعہ حکمران نے آپ اور آپ کے خاندان پر ظلم و ستم کیے ہوں گے تو یہ بھی قرین قیاس نہیں کیونکہ نجف خان کے انتقال کے بعد دہلی میں غلام قادر روہیلہ پٹھان (کٹر سنّی) اقتدار سنبھال لیتا ہے اور دہلی میں

۱۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، ملفوظات عزیزی۔ ص، ۳۲

شیعوں کا اثر کافی حد تک کم ہو جاتا ہے ۔ پھر اس خوشگوار دور میں لکھی گئی تحفۂ اثنا عشریہ کے خلاف سوائے اس کا رد لکھنے کے کوئی بھی آپ کو سنگین سزائیں دینے کی جرأت نہیں کر سکتا ۔ اوّل تو شاہ عبدالعزیز کے ساتھ یہ حوادث نہ تو نجف علی خان کے ہاتھوں اور نہ ہی اس کے عہد میں واقع ہوئے لیکن اگر شاہ صاحب پران کی عمر کے کسی دور میں بھی یہ المناک واقعات پیش آئے ہوں تو اس دور کے کسی تاریخ نگار یا تذکرہ نویس نے اپنے تذکرے میں شاہ عبدالعزیز کے جونپور تشریف لانے اور شاہ رفیع الدین کے لکھنؤ آنے کا معمولی سا بھی ذکر نہیں کیا ۔ کیا امیر شاہ خان کے نزدیک ہندوستان کے دینی و علمی خدمات میں معروف و مشہور خاندان کے افراد اتنے ہی بے یار و مددگار تھے کہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے شاگردانِ رشید میں سے کسی نے ان حوادث کے خلاف آواز نہ اٹھائی ہو ۔ امیر شاہ خان کی روایت کے مطابق سفر میں لوکی حدّت کے باعث شاہ صاحب کی بینائی ختم ہوگئی تھی لیکن جہاں تک شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی بینائی زائل ہونے کا تعلق ہے ۔ اس کے بارے میں وقائع عبدالقادر خانی فرماتے ہیں :

"شاہ عبدالعزیز صاحب بینائی جاتے رہنے کی وجہ سے خود نہیں لکھ سکتے تھے ۔ دوسرے کو بلا تامل املا فرماتے تھے" ۔[1]

عبدالقادر خانی نے شاہ عبدالعزیز کا زمانہ پایا ہے تو ان کے اس قول سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ نے شاہ صاحب کو خود دیکھا تھا ۔ لہٰذا اگر اس قسم کا کوئی سانحہ پیش آیا ہوتا تو عبدالقادر صاحب اس المناک واقعے کا بھی ذکر ضرور کرتے ، جس کے بارے میں امیر شاہ خان نے تحریر فرمایا ہے ۔

امیر شاہ خان کی روایت کے مطابق روافض نے دو دفعہ آپ کو زہر دیا تھا اور ایک مرتبہ آپ کے جسم پر چھپکلی کا ابٹن ملوایا تھا ، جس سے شاہ صاحب کو برص اور جذام ہوگیا تھا ۔ امیر شاہ خان کے اس قول کی تردید عبدالحئی لکھنوی کے اس قول سے ہوتی ہے :

"هذا وقد اعترته الأمراض المؤلمة وهو ابن خمس وعشرين

۱۔ وقائع عبدالقادر خانی ، علم و عمل ۔ جلد دوم ۔ ص ۲۲۵ ۔

فادت الی العراق والجذام والبرص والعمٰی ونحو ذلک حتی عد منہا اربعۃ عشر مرضا مزمنا"۔[1]

عبدالحئی لکھنوی صاحب کے مندرجہ بالا قول سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ شاہ صاحب پچیس ۲۵ برس کی عمر میں ہی متعدّد امراض میں مبتلا ہو چکے تھے اور اسی عمر میں آپ کی بینائی بھی زائل ہوگئی تھی جب کہ نجف خان کا دہلی میں ظہور بھی نہیں ہوا تھا چنانچہ یہ بات واضح ہوگئی کہ شاہ صاحب کی بینائی، برص اور جذام کا کسی حادثے یا واقعے سے تعلق نہ تھا بلکہ آپ عہد شباب سے متعدّد مہلک امراض میں مبتلا ہوگئے تھے اور صحت خراب رہتی تھی۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی زندگی کے دو اہم کارنامے :

(۱) شاہ عبدالعزیز کا شیعیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا۔

(۲) شاہ عبدالعزیز کا فتوی دارالحرب۔

ہندوستان میں شاہ ولی اللہ کے خاندان میں خصوصاً شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور آپ کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر محدث دہلوی شیعیت کے سیلاب کو روکنے میں پیش پیش رہے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کی وفات کے بعد شاہ عبدالعزیز اور ان کے بھائی شیعوں کی مخالفت میں اس قدر متشدد نہ تھے بلکہ اس زمانے میں تو آپ نے سرّالشہادتین جیسی معرکۃ الآراء کتاب لکھی تھی جو شیعہ حضرات کے عقائد کے مطابق تھی لیکن کچھ عرصے بعد ۱۲۰۲ھ مطابق ۹۰-۱۷۸۹ء میں شاہ صاحب نے شیعہ عقائد کے رد میں "تحفۂ اثنا عشریہ" جیسی مایہ ناز کتاب لکھی تھی جس کو پڑھ کر یہ تعجّب ہوتا ہے کہ کیا یہ وہی شاہ عبدالعزیز ہیں جنہوں نے کچھ عرصہ قبل شیعہ حضرات کے عقائد کے مطابق سرّالشہادتین " جیسی کتاب لکھی تھی۔ لیکن اب وہی شاہ عبدالعزیز صاحب کی حویلی تحفہ کی تصنیف کے جرم کی پاداش میں ضبط ہوتی ہو تو یہ جا نہ ہوگا۔

۱۔ سید عبدالحئی لکھنوی، نزہۃ الخواطر۔ جلد ۷، ص ۲۷۰۰

اس لیے کہ اس سے قبل آپ کی کوشش باقاعدہ تصنیف شیعہ عقائد کے رد میں نہیں تھی ۔

شاہ عبدالعزیز کا دوسرا کارنامہ فتوٰی دار الحرب ہے ۔ شاہ عبدالعزیز کے زمانے میں انگریز اپنا اثر و رسوخ بڑھانے اور عروج و اقتدار قائم کرنے کی ہرممکن کوشش کر رہے تھے ۔ آپ کے دور میں تو دہلی پر انگریزوں کے قبضہ اور پھر ظلم و ستم سے حالات مزید خراب ہو تے گئے ۔ مغلیہ بادشاہ انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھا ۔ انگریزوں نے ہندوستانی عوام کو سیاسی و معاشی طور پر کمزور کرنے کے بعد ان کے مذہبی شعائر میں بھی دخل اندازی شروع کر دی ۔ ان کے پادریوں نے محض انجیل کی وعظ کو کافی نہ سمجھا بلکہ دیگر اقوام کے مذہبی امور وعقائد پر الزام تراشی بھی کی ۔ ہندوستانی عوام کی اکثریت ، خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو ، ہمیشہ اپنی مذہبی اقدار و جذبات کی پابند رہی ہے چنانچہ وہ اپنے مذاہب پر اتہامات برداشت نہ کر سکے ۔ ان ناگزیر حالات میں شاہ ولی اللہ نے خواص اور امراء کے ذریعے مذہبی حالات کی اصلاح کے لیے جو انقلاب کی کوششیں کیں ، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے ان کی مساعی جمیلہ کو عوام الناس کے ذریعے پورا کیا ۔

انگریزی حکومت نے ہندوستانی عوام کو فوج میں بھرتی کے علاوہ دیگر محکموں میں بھی ملازمتیں دینا شروع کر دی تھیں ۔ انگریزوں کا یہ قدم بظاہر رعایا کی فلاح وبہبود کے لیے تھا لیکن حقیقتاً وہ اسلام اور مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے در پے تھے ۔ شاہ عبدالعزیز اور دیگر ارباب بصیرت اپنی دور رس نگاہوں کے باعث ایسٹ انڈیا کمپنی کی ان عیاریوں اور مکاریوں سے بخوبی آگاہ تھے ۔ آپ کی سیادت ولیاقت ، دیانت داری اور روشن خیالی انگریزوں کے نزدیک بھی مسلم تھی چنانچہ شاہ صاحب کے زیر تربیت بے شمار مشائخ وطلباء انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی کرنے لگے ۔ اسی عرصہ کے دوران میں شاہ صاحب کے پاس ایک استفتا پیش ہوا ۔ شاہ صاحب نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے خطرے کو محسوس کرتے ہوئے اپنی دور اندیشی اور تبحر علمی سے انگریزی حلقۂ اقتدار کو دار الحرب قرار دیا اور انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا ہر مسلمان کا اولین فرض قرار دیا ۔ فتوے کے الفاظ یہ ہیں " نصارٰی بلکہ کافروں کی نوکری کئی قسم کی ہے ۔ بعض

مباح ، بعض مستحب ، بعض حرام ، بعض مکروہ اور بعض کبیرہ مفضی الی الکفر ۔ اگر کافر کسی مسلمان کو نیک رسموں کو پھیلانے اور اچھے کاموں کے انجام دینے کے لیے نوکر رکھے تو یہ نوکری جائز ہے جیسے چوروں اور رہزنوں کو ختم کرنے کے لیے شریعت کے مطابق فتوی دینے پل سرائے وغیرہ بنوانے کے لیے نوکری کرنا مستحب ہے جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے خزانوں کے انتظام کی نوکری کی اور عدل وانصاف کرنے کے لیے درخواست کی یا حضرت موسی کی والدہ نے حضرت موسی کو دودھ پلانے کی نوکری قبول فرما لی تھی ۔

اگر بری رسمیں اور چیزیں نوکری میں نظر آئیں مثلاً سپہ گری ، خدمت گاری مشی گیری میں ظلم کی امداد کرنی پڑے ، تعظیم وتکریم کے لیے بار بار اٹھنے میں ذلت معلوم ہو یہ نوکری حرام ہے اور جس نوکری میں مسلمانوں کو قتل اور ریاست کو درہم برہم کرنے یا کفر کو رواج دینے یا دین میں عیب نکالنے کا فرض انجام دینا ہو تو یہ ایسا بڑا گناہ ہے جو کفر کی سرحد کے قریب لے جاتا ہے۔[1]

شاہ صاحب کے نزدیک انگریزی پڑھنا یعنی انگریزی کا حرف پہچاننا اور لکھنا اور اس کی لغت اور اصطلاح جاننا ، اس میں کچھ بھی قباحت نہیں بشرطیکہ صرف مباح ہونے کے خیال سے انگریزی حاصل کی جائے ۔

چنانچہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی میں کالج قائم کیا اور مسلمان اس کالج میں تعلیم پانے پر آمادہ نہ ہوئے تو شاہ صاحب نے ان کے شکوک وشبہات کو رفع کرکے دہلی کالج سے استفادہ کرنے کی تلقین کی ۔ گویا شاہ صاحب علی گڑھ کالج کے قیام سے پچاس سال پہلے ہی انگریزی سکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے چکے تھے ۔

دہلی کے نامور صوفی بزرگ اور خاتم الاولیاء شاہ غلام علی صاحب نے شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں ایک خط لکھا " مولوی عبدالحئی صاحب کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ انگریزوں کی نوکری کرنے لگے ہیں اس کے جواب میں شاہ صاحب نے فرمایا " اس شخص کا میل جول فرنگیوں کے ساتھ ہرگز نہ ہوگا ، نہ اسے کسی ناجائز کام کی تلقین دی جائے گی بلکہ اسے شہر کے کسی الگ مکان میں

۱۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ، فتاوی عزیزی ۔ ج ۔ ۱ ، ص ۱۶۰ ۔

رہنا ہوگا کہ شرع محمدی کے موافق بلا تامّل و وسواس حکم دیتے رہیں گے"۔[1]

شاہ عبدالعزیز کا مندرجہ بالا فتوی دارالحرب اور انگریزوں کی ملازمت کی مخالفت حکام زمانہ کی ناپسندیدگی اور ناراضگی کا باعث ہو سکتا تھا اور عین ممکن ہے کہ انگریز آپ سے ناراض ہوئے ہوں اور اسی ناراضگی کے سبب اور ردّعمل کے طور پر آپ کو اپنی حویلی سے نکال دیا ہو یہ فتوی یقیناً کرنل لیک کے ۱۸۰۳ء میں دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد ہی دیا گیا تھا۔ اس وقت سے دہلی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حفاظت کے لیے ایک ریزیڈنٹ مقرر کیا گیا تھا۔ ممکن ہے، اسی ریزیڈنٹ نے آپ کی حویلی کی ضبطی کے احکام جاری کیے ہیں۔ آپ کے ملفوظات میں ریزیڈنٹ سٹین کا نام بھی ملتا ہے۔ یہ انگریز ریزیڈنٹ ۱۸۰۶ء سے ۱۸۱۱ء تک دہلی میں اس عہدے پر فائز رہتا ہے۔ شاہ صاحب کے ملفوظات سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ سٹین آپ کا معتقد تھا اور اکثر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا جیسا کہ ملفوظات میں ہے کہ "سٹین بھی دو مرتبہ میرے پاس آیا ہے لیکن وہ جاہل اور خوشامدی ہے چنانچہ ایک دن میرے ساتھ پرانے شہر میں جائے ولادت پر گیا تھا اور اس جگہ پر ایک یادگار بنانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اس مقام پر اس نے ایک عمارت بنوائی تھی مگر وہ درست نہیں تھی جیسا کہ حسب ذکر دریافت کیا گیا تھا"۔[2] پھر فرمایا کہ "سٹین جو ایک قلیل دوست ہے۔ انہوں نے مجھے اپنے مکان پر بلایا تھا اور ان کی خواہش تھی کہ میں کبھی کبھی ان کے پاس جایا کروں"۔[3]

مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں پتہ چلتا ہے کہ سٹین سے آپ کے دوستانہ تعلقات تھے اور وہ آپ کو امراء و رؤساء کی طرح عقیدت مندانہ طور پر ملتا تھا۔ لہٰذا اگر آپ کی حویلی آپ کی کتاب تحفہ اثنا عشریہ یا پھر فتویٰ دارالحرب کی وجہ سے ضبط ہوئی ہو تو بقول ایوب قادری یہی ریزیڈنٹ سٹین آپ کی ضبط شدہ جائداد کے واگزاشت کرنے کی سفارش ان الفاظ میں کرتا ہے۔

۱۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، فتاوی عزیزی ۔ ج ۔ ۱، ص ۸۲

۲۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، ملفوظات عزیزی ۔ ص ۱۱۷

۳۔ ایضاً ۔ ص ۱۲۷

"The resident Delhi forwards copy and letter from the superintendent of the assigned territory and recomends the land in Havely Palam formerly owned by Moulvi Shah Abdul Aziz be resorted to him" [1]

گویا شاہ عبدالعزیز کی درخواست منظور ہونے پر دس جولائی ۱۸۰۷ء کو سکرٹری پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ریذیڈنٹ کو مطلع کیا گیا کہ گورنمنٹ شاہ عبدالعزیز صاحب کی جائیداد واگزاشت ہونے کی تجویز منظور کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ سنٹن کے تعلقات شاہ صاحب کے ساتھ نہایت خوشگوار تھے اور اسی نے آپ کی جائیداد کی واپسی میں آپ کی مدد کی ہوگی۔ شاہ صاحب کے ان فتاوی سے آپ کی دینی بصیرت اور علمی پختگی کا اندازہ لگانا بہت آسان ہے کہ شاہ صاحب کیسے مشکل اور دقیق مسائل میں لوگوں کی صحیح راہنمائی فرماتے تھے۔

آپ صرف ایک عالم ہی نہیں تھے بلکہ عملی دنیا میں بھی اسلامی اقدار کو زندہ رکھنے اور مسلمانوں کی شیرازہ بندی کے لیے خاص مقام رکھتے تھے۔ آپ اپنی مساعی جمیلہ کی بدولت ممتاز ترین شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں، جنہوں نے مسلمانوں کے لیے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر چند مخصوص چیزوں کا پابند کر دیا اور انہیں غلامی کے طوق سے نجات دلائی۔

۱- ایوب قادری، فضائل صحابہ و اہل بیت - ص ۵۵، ۵۶

باب — سوم

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے اساتذہ کرام اور شاگردان رشید کا تذکرہ

(الف) علمی ترقی کے ذرائع ،شاہ عبدالرحیم ،شاہ ولی اللہ اور مدرسہ رحیمیہ کا پہلا دور ، شاہ عبدالعزیز اور مدرسہ رحیمیہ کا دوسرا دور ، مدرسہ عزیزی اور تیسرا دور۔

(ب) اساتذہ کرام :۔ شاہ ولی اللہ ، خواجہ محمد امین کشمیری ،شاہ محمد عاشق پھلتی

(ج) شاگردان رشید :۔

شاہ رفیع الدین محدث دہلوی : حالات زندگی ،تصانیف ،وفات ،تلامذہ ،اخلاق

شاہ عبدالقادر محدث دہلوی : حالات ، تلامذہ ،وفات۔

شاہ عبدالغنی محدث دہلوی : حالات ، وفات ، اخلاق ۔

شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی : حالات ، ابتدائی تعلیم ،فضل وکمال ،تصانیف ،تلامذہ

شاہ محمد یعقوب محدث دہلوی : حالات زندگی ، فضل وکمال ۔

شاہ محمد اسمٰعیل شہید :۔ نام ، سن پیدائش ،تعلیم وتربیت ، زہادت و ذکاوت ، سپاہیانہ ورزشیں ،شاہ اسمٰعیل شہید کا پہلا وعظ اور عوام الناس کی مخالفت ،شاہ صاحب کی شخصیت اور ان کی عظمت کا اعتراف ، شہادت ۔

شاہ محمد مخصوص اللہ : تعلیم وتربیت ،وفات ،تلامذہ ۔

مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی : ابتدائی تعلیم وتربیت ،علم وفضل ،تصانیف ،تلامذہ

مولوی رشید الدین دہلوی : ابتدائی تعلیم وتربیت ، وفات ، تصانیف ۔

علامہ فضل حق خیرآبادی : شجرہ نسب ، ابتدائی تعلیم ، ذہانت و فطانت اور درس و تدریس ، ملازمت ، علامہ صاحب اور ان کے ہمعصر ۱۸۵۷ء کا غدر اور علامہ فضل حق خیرآبادی کا فتویٰ ، وفات ، علامہ صاحب کی علمی و ادبی شہرت و عظمت ، تصانیف ، اخلاق ۔

سید احمد شہید رائے بریلوی : شجرہ نسب ، ابتدائی تعلیم ، بچپن میں مردانہ کھیل اور مشاغل ، سفر لکھنؤ و دہلی ، سفر حج اور مراجعت ، شہادت ، سید احمد شہید کی شخصیت ، تصانیف ۔

شیخ الاسلام مولانا عبدالحئی بڈھانوی : تعلیم و تربیت ، حج بیت اللہ ، وفات ، تصانیف ۔

مولوی محبوب اللہ دہلوی : حالات ، تعلیم و تربیت ، وفات ، تصانیف ۔

مولوی عبدالخالق دہلوی : تعلیم و تربیت ، وفات ۔

شاہ احمد سعید مجددی : پیدائش ، تعلیم و تربیت ، وفات ، فضیلت و عظمت ، اولاد ، تصانیف ۔

شاہ ابو سعید : پیدائش ، تعلیم و تربیت ، شاہ صاحب کی عظمت ، وفات ، اولاد

حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی : تعلیم و تربیت ، علمی عظمت و فضیلت ، وفات ، تصانیف و تالیف ۔

مرزا حسن علی صغیر محدث لکھنوی : پیدائش ، تعلیم و تربیت ، وفات ، تلامذہ ، تصانیف ۔

شاہ غلام علی دہلوی : پیدائش ، تعلیم و تربیت ، زاہد و عابد عالم ، وفات ۔

مولوی عبدالرحیم گورکھپوری : تعلیم و تربیت ، تصانیف ۔

علمی ترقی کے ذرائع :

کسی قوم کی تہذیبی ترقی اور علمی و سعت کے لیے ان کے ہاں متعدد قومی کتب خانوں کا مسلسل اور مرتب طور پر موجود ہونا اشد ضروری ہوتا ہے۔ جس قوم میں یہ علمی ذرائع موجود نہ ہوں ، وہ قوم عدم مطالعہ کے باعث کبھی بھی مناسب طریق پر جہالت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں دو لا ئبریریاں موجود تھیں ۔ جن میں ایک قلعے کا شاہی کتب خانہ ، جس میں اسلامی حکومت کے آغاز سے ہی کتابوں کے جمع کرنے کا عمل شروع ہو چکا تھا اور دوسرا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا کتب خانہ ، جس کی ابتداء آپ کے دادا شاہ عبدالرحیم محدث دہلوی نے کی تھی ۔ پھر ان کے بیٹے شاہ ولی اللہ نے اس میں بے شمار کتب کا اضافہ کیا ۔ شاہ (ولی اللہ) صاحب کے بعد شاہ عبدالعزیز کے زمانہ میں کتب کی معتدبہ افزائش سے یہ ایک باقاعدہ اور منظم کتب خانہ بن چکا تھا ۔ آپ کے عہد میں کتب میں مسلسل اضافے کے علاوہ اس دور کے گورنر جنرل نے اسی مقصد کے لیے ایک بڑی رقم بھی آپ کی نذر کی تھی اور اس کتب خانے کی ترقی کے لیے مصر اور عرب وغیرہما سے کتب بھی منگوا کر دی تھیں گویا ہندوستان میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا کتب خانہ ایک بہت عظیم الشان کتب خانہ تھا ۔

شاہ عبدالرحیم ، شاہ ولی اللہ اور مدرسہ رحیمیہ کا پہلا دور :

شاہ عبدالعزیز کے دادا شاہ عبدالرحیم محدث دہلوی نے عالمگیر کے عہد میں غالباً سترھویں صدی کے ربع آخر میں کتب خانے کے آغاز کے ساتھ ساتھ پرانی دہلی میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا ۔ برصغیر کا یہ تعلیمی مرکز عظیم معلمین اور مدرسین کی عظمت کے باعث غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا ۔ یہ مدرسہ ایک درسگاہ کے علاوہ انقلابی تحریک کا مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خانقاہ کی حیثیت بھی رکھتا تھا ۔ ابتداء میں اس مدرسہ میں طلباء کی تعداد زیادہ نہ تھی ۔ اس دور کے نمایاں اور ممتاز طالب علم شاہ ولی اللہ اور بدرالحق پھلتی ہیں ۔ شاہ عبدالرحیم کی حیات مبارکہ میں ہی شاہ ولی اللہ

نے تحصیل علوم سے فراغت پانے کے بعد اس درسگاہ میں مدرس کے فرائض سرانجام دینے شروع کر دیے تھے۔ اپنے والد بزرگوار کی وفات کے بعد جب آپ ان کے قائم مقام اور خلیفہ مقرر ہوئے تو آپ نے اس مدرسہ پر اپنی پوری توجہ منہمک کر دی اور بہت محنت اور احساس ذمہ داری سے طالبان ہدایت کی راہنمائی کے لیے تقریباً بارہ سال تک دینیات اور معقولات کی کتابوں کی درس و تدریس میں مصروف رہے۔ اس دوران میں کتب دینیہ اور عقلیہ کی تحصیل کے لیئے سینکڑوں تشنگان علم جوق در جوق آپ کے مدرسہ میں آنے لگے اور استفادہ کر کے اس روشنی سے بے شمار لوگوں کو منور کرتے۔ شاہ ولی اللہ نے مسند تدریس پر جلوہ افروز ہوتے ہی نصاب تعلیم میں ترمیم کرنے کے علاوہ درس قرآن کریم کو نصاب کا ایک حصہ قرار دیا اور شاہ محمد عاشق کو ترجمہ قرآن پڑھانے کے بعد اس ترجمہ کو قلم بند کرنا شروع کیا۔ جس کا ایک حصہ سفر حج سے پہلے باقی حصہ سفر حج کے بعد ۱۱۵۱ھ / ۱۷۳۹ء میں مکمل کیا ۱۱۵۶ھ / ۱۷۴۳ء میں خواجہ محمد امین کشمیری نے اس مدرسہ میں اس ترجمہ کو نصاب تعلیم کا ایک جزو بنا لیا۔ بارہ سال تک اس مدرسہ میں داد تدریس دینے کے بعد ۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۱ء میں آپ (شاہ ولی اللہ حرمین شریفین تشریف لے گئے اور وہاں حج و زیارت کے دوران میں آپ نے محدثین حرمین سے بھرپور استفادہ کیا۔ حج سے واپس تشریف لا کر "مدرسہ رحیمیہ" کی محفل کو از سر نو گرم کیا اور حدیث و تفسیر کا درس دینا شروع کیا گویا شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بعد اس دور میں آپ نے حدیث شریف کو فروغ بخشا۔ پرانی دلی اب اندرون ملک اور بیرون ممالک سے آنے والے شائقین علم حدیث کے لیے "دار الحدیث" بن گئی گویا اس وقت یہ تعلیمی مرکز علوم و حدیث و تفسیر کا سرچشمہ اور حنفی فقہ کا مخزن بن گیا تھا۔ سفر حج سے پہلے بارہ سال کے عرصہ میں جو تلامذہ فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔ ان میں شاہ محمد عاشق، اخوند محمد سعید، خواجہ محمد امین کشمیری اور شاہ اہل اللہ کے نام قابل ذکر ہیں یہ حضرات سفر حج کے بعد مدرسہ میں شاہ ولی اللہ کے رفیق و معاون ثابت ہوئے۔ اب جب کہ شاہ ولی اللہ ہر فن میں کوئی نہ کوئی استاد پیدا کر چکے تھے اور خاص طور پر ان کے فنون نکھر دیے کے ساتھ ساتھ تدریس کی تربیت بھی ہو چکی تھی۔ اب آپ نے مدرسہ میں درس و تدریس کو چھوڑ کر اب صرف نگرانی اور سرپرستی تک محدود ہو کر اپنے آپ کو فکر و تحقیق اور تصنیف و تالیف کے لیے وقف کر

لیا تھا جیسا کہ شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ :

"حضرت والد ماجد از ہر ایک فن شخصے طیّار کردہ بودند طالب ہر فن با وے می سپردند و خود مشغول معارف گوئی و نویسی بودند و حدیث میخواندند بعد مراقبہ ہر چہ کشف می پرسید می نگاشتند عوض ہم کم می شدند" ۔[1]

شاہ صاحب کے عہد میں درس و تدریس میں تلامذہ کی تعداد حیرت انگیز طور پر کم رہی لیکن پھر بھی یہ دور مدرسہ کا روشن ترین دور ہے ۔

حج سے مراجعت کے بعد شاہ صاحب کے علمی کمالات کی شہرت کا چرچا ہونے پر اطراف و اکناف سے تشنگان علم حدیث مدرسہ میں استفادہ کی غرض سے سیل رواں کی طرح آنے لگے ۔ اب مدرسہ رحیمیہ کی وسعت ان کے لیے تنگ ہوگئی تو محمد شاہ بادشاہ نے شاہ جہان آباد میں ایک عالی شان حویلی مدرسہ کو دے دی ، قدیم مدرسہ غیرآباد ہوگیا اور نئے مدرسے نے ایک بہت بڑی جامعہ کی حیثیت اختیار کرلی ۔ شاہ عبدالعزیز سولہ سال کی عمر میں اپنی خدا داد لیاقت اور استعداد سے اس درسگاہ سے مختلف علوم میں بخوبی کماحقہ حاصل کرچکے تھے ۔ آپ اتنی چھوٹی سی عمر میں تمام علوم کے ناپیدا کنار دریاؤں کو طے کرتے ہوئے تعلم دشوارگذار علمی مراحل میں اپنے ہم عمروں سے فوقیت لے گئے ۔ بارھویں صدی کے یہ جید باعمل عالم اور علوم دینیہ کے متبحر فلاسفر کو اپنے والد بزرگوار سے سند علمیہ حاصل کرنے کے بعد درس و تدریس کا شوق پیدا ہوا لیکن والد بزرگوار کے عزت و احترام کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ان کی حیات مبارکہ میں درس و تدریس کے میدان میں قدم رکھنے کو اپنے والد بزرگوار کی ہمعصری کی گستاخانہ جرأت سمجھتے تھے لہذا جب راس العلماء شاہ ولی اللہ کا سایہ آپ کے سر سے اٹھ گیا تو مجبوراً آپ کو اپنے والد بزرگوار کی درسگاہ کو آباد کرنا پڑا ۔ یہ تھا مدرسہ کا پہلا دور ۔

---

۱ ۔ شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی ، ملفوظات ۔ ص ۲۰۰

شاہ عبدالعزیز اور مدرسہ رحیمیہ کا دوسرا دور :

شاہ ولی اللہ کی وفات ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء کے بعد مدرسہ رحیمیہ کی صدارت کا بوجھ شاہ عبدالعزیز نے نہایت ہمت و استقلال سے برداشت کیا ۔ اس وقت ان کے رفیقوں میں ان کے اساتذہ کرام اور شاہ ولی اللہ کے معاون ہی مدرسہ کی بہترین کارکردگی میں آپ کے مددگار رہے ۔ جب چار سال بعد ۱۱۷۹ھ/۱۷۶۵ء میں شاہ رفیع الدین بھی فارغ التحصیل ہو گئے تو مدرسہ کے اراکین میں ایک جواں سال باہمت رکن کا اضافہ ہو گیا ۔ چند سال بعد شاہ عبدالقادر کا شمار بھی مدرسین کی فہرست میں ہونے لگا ۔ بعد ازاں چاروں بھائیوں (شاہ عبدالعزیز ، شاہ رفیع الدین ، شاہ عبدالقادر ، شاہ عبدالغنی) کے اخلاف ، فخر روزگار شاہ محمد اسحاق شاہ محمد یعقوب ، شاہ محمد اسمٰعیل ، شاہ محمد مخصوص اللہ ، شاہ محمد موسیٰ اور شاہ عبدالعزیز کے بعض تلامذہ مثلاً مولوی رشید الدین وغیرہ نے مدرسہ میں طالبان علوم دین کی تشنگی کو دور کرنے کے لیے درس وتدریس کا آغاز کر کے اس مدرسے کو چار چاند لگا دیے ۔ شاہ عبدالعزیز کے درس قرآن کا سلسلہ ، جو بہت دلنشین وموثر اور سادہ و قابل فہم انداز میں شروع ہوا تھا ، طلباء سے زیادہ عوام کی دلچسپی کا مرکز بن گیا اور مدرسہ کے ایک سبق کی بجائے مجلس کا موضوع ہو گیا ۔ اس زریں دور کے مزید مدرسین خواجہ محمد امین کشمیری ، بابا فضل اللہ ، شاہ محمد عاشق ، شاہ نور اللہ اور مولوی عبدالحئی بڈھانوی ہیں ۔ اس دور میں شاہ عبدالعزیز کے تلامذہ کا شمار ہزاروں تک پہنچ جاتا ہے ۔ شاہ عبدالعزیز کے فتاویٰ کی ضخیم جلدیں سے اندرون و بیرون ممالک سے آپ کی طرف زبانی و تحریری سوالات کے تسلسل اور رجوع کرنے والوں کا اندازہ لگانا بہت آسان ہے ۔ شاہ عبدالعزیز کی حیات مبارک میں آپ کی ضعف البصر کی بیماری کے باعث اس مدرسہ کی صدارت کے فرائض شاہ رفیع الدین نے سرانجام دینے شروع کر دیے تھے ۔ شاہ عبدالعزیز کی زندگی میں ہی شاہ عبدالقادر اکبر آبادی مسجد کے حجرہ میں قیام پذیر تھے ۔ اس لیے طلباء ان سے استفادہ کی غرض سے تشنگی علم کو رفع کرنے کے لیے جاتے تھے لیکن ۱۲۳۹ھ/۱۸۱۷ء میں آپ کے انتقال پر شاہ محمد اسحاق اپنے نانا کے جانشین مقرر ہوئے ۔

مدرسہ عزیزی اور تیسرا دور :

شاہ عبدالعزیز کی وفات پر آپ کے نواسے شاہ محمد اسحاق مدرسہ میں صدر ، خلیفہ اور جانشین مقرر ہوئے ۔ اس دور کے مدرسین میں شاہ محمد یعقوب ، شاہ مخصوص اللہ ، شاہ محمد موسی اور مولوی رشید الدین خاں کے نام قابل ذکر ہیں ۔ صدر المدرسین شاہ محمد اسحاق ، محنت وشفقت اور جفا کشی وتندھی سے اپنا تمام وقت درس وتدریس میں گزارتے کیونکہ آپ ہی مدرسہ عزیزیہ کے نگران اعلی تھے ۔ انیس سال بعد شاہ محمد اسحق کی ہجرت حرم ۱۲۵۸ھ/۱۸۳۶ء پر اس مدرسہ کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ کا اختتام ہوگیا ۔ محمد شاہ رنگیلے نے شاہ جہاں آباد میں جو شاہ ولی اللہ کو اس مدرسے کے لیے جگہ دی تھی دلّی کے پرانے کھنڈرات کا سب سے بڑا ماہر مولوی بشیر الدین احمد ، محمد شاہی عطیہ کے بارے میں اس طرح رقمطراز ہے کہ " یہ مدرسہ کسی زمانہ میں نہایت عالیشان اور خوبصورت تھا اور بڑا دارالعلوم سمجھا جاتا تھا " ۔[1] اس درسگاہ کی پختگی اور استحکام کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ مدرسہ ۱۲۷۹ھ/۱۸۵۷ء تک اپنی اصلی حالت پر قائم تھا ۔ بقول بشیر الدین احمد " غدر میں مکانات لوٹ لیے گئے ، گرا دیے گئے ، کڑی تختہ تک لوگ اٹھا لے گئے ، خلعہ خالی را دیو می گیرد ۔ ایک شورش گردی تھی کہ الہی توبہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس جس کا جس پر قابو چلا قابض ہوگیا ۔ اب متفرق مکانات اس جگہ بن گئے ہیں مگر محلہ شاہ عبدالعزیز صاحب مدرسے کے نام سے آج تک پکارا جاتا ہے " ۔[2] یہ مدرسہ اندازاً چالیس سال تک غیر آباد رہا ۔ بالآخر شاہ رفیع الدین کے نواسے مولوی سیّد ناصر الدین کے پوتے مولوی سید احمد نے ۱۳۱۹ھ/۱۸۹۷ء میں ایک مطبع کے ساتھ ایک مدرسہ بھی قائم کیا اور اس مدرسہ کا نام " مدرسہ عزیزی " تجویز کیا ۔

شاہ عبدالعزیز جیسے لاثانی عالم اور شاہ محمد اسحق جیسے بلند پایہ فاضل کی بابرکت مجلس میں دن رات طلباء کا جم غفیر رہتا تھا ، جو آپ سے تمام علوم میں استفادہ کرتے تھے ۔ آپ بھی دن کا تمام حصہ طلباء کے ساتھ درس وتدریس میں گزارتے تھے سوائے تھوڑے سے وقت کے ، جب کہ آپ فتاوی

۱۔ مولوی بشیر الدین احمد ، دار الحکومت دہلی ۔ جلد دوم ، ص ۱۷۳

۲۔ ایضاً ۔ ص ۱۷۴

اور وعظ میں مصروف ہوتے ۔ ہندوستان کے علاوہ بیرون ممالک سے اکثر علماء جو دستار فضیلت باندھے ہوئے ہوتے ، آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر زانوئے تلمذ طے کرتے اور نکات باطنی حل کرتے تھے ۔ شاہ عبدالعزیز اپنے وقت کے مجتہد علماء اور مستند دینی فضلاء میں منفرد تھے ۔ آپ کی بے ساختہ جواب دہی پر گوش بھی آپ کے سامنے کسی عقلی یا نقلی دلائل پر لب نہیں کھول سکتا تھا ۔ آپ کے موثر حسن بیان سے ہر مخالف و موافق کا سر تسلیم خم ہو جاتا تھا ۔ آپ نے اپنی تمام عمر تعلیم و تلقین اور ترتیب کتب میں گزار دی ۔ آپ کے علوم و فنون کے فیض بہا سرچشموں سے ہزاروں تشنہ لب سیراب ہوئے کہ جن کا احصار مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے ۔ تسلسل حوادث (غدر کا زمانہ) سے یہ شمع گل ہونے پر بھی اس سے روشن و فروزاں ہونے والے تمام اسلامی دنیا کے فیض یافتہ علماء بیرون ملک میں اسکی سینکڑوں شاخیں کھولے ابھی تک سرگرم عمل ہیں ۔ پانی پت کا تاریخی معرکہ کارزار بھی اسی مدرسہ کے ایک رکن کا برپا کیا ہوا ہے ۔ سرحد و پنجاب کے میدانوں میں رنجیت سنگھ کی فوجوں سے محاذ آرائی کرنے والے سرفروش مجاہدین بھی اسی درسگاہ سے درس جہاد لے کر نکلے تھے ۔ جزائر انڈمان کے قبرستان میں اسی دبستان فکر و عمل کے مستفیدین اور متعلمین محو خواب راحت ہیں ۔ مدرسہ کا دوسرا دور اپنے ماقبل اور مابعد کے ادوار سے ہر پہلو اور ہر اعتبار سے ایک تابناک اور روشن دور ہے کہ جس سے ہزاروں لوگ تربیت پا کر ہندوستان کے آفتاب و ماہتاب بنے ۔ ان میں سے چند شاگردان رشید کے اسمائے گرامی تحریر کروں گی اور بخوف طوالت صرف کچھ مشہور شخصیتوں کے حالات زندگی کا ذکر کرنے پر اکتفا کرنا مناسب ہوگا ۔ شاہ عبدالعزیز کے اساتذہ میں مشہور شخصیتیں آپ کے والد گرامی شاہ ولی اللہ ، علاوہ ازیں شاہ محمد عاشق پھلتی ، خواجہ محمد امین کشمیری اور شیخ نور اللہ بڈھانوی ہیں آپ کے شاگردوں میں آپ کے بھائی ، شاہ رفیع الدین ، شاہ عبدالقادر ، شاہ عبدالغنی ، آپ کے نواسے ، شاہ محمد اسحاق ، شاہ محمد یعقوب ، آپ کے بھتیجے شاہ محمد اسمٰعیل ، شاہ مخصوص اللہ ۔ علاوہ ازیں صدر الدین آزردہ دہلوی ، رشید الدین دہلوی ، مولانا فضل حق خیر آبادی سید احمد شہید ، قاضی ثناء اللہ پانی پتی ، عبدالحئی بڈھانوی ، مولوی محبوب علی دہلوی ، مولوی عبدالخالق دہلوی ، شاہ احمد سعید بن ابو سعید ، شاہ ابو سعید ، مولانا حسین احمد ملیح آبادی ، مولانا کریم اللہ دہلوی ، مولانا محمد شکر مچھلی شہری ، مولانا محمد بخش دہلوی ،

مولانا خرم علی بلہوری ، مولوی حیدر علی رام پوری ، شاہ رؤف احمد مصطفی آبادی ، مفتی الہی بخش کاندھلوی ، سید حیدر علی بن سید عنایت علی ، مولوی امام الدین ، مولانا سید اولاد حسن قنوجی ، مولانا حیدر علی فیض آبادی ، مولانا سید احمد علی بجنوری ، مولانا سلامت اللہ کشفی بدایونی ، مولانا سعادالدین احمد بدایونی ، مولانا شاہ سید آل رسول برکاتی مارہروی ، اخوند حافظ عبدالعزیز قادری دہلوی ، مولانا سید محمد اسحاق بن سید محمد عرفان ، شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی ، مولانا غلام جیلانی رفعت رام پوری ، مولانا کرم اللہ محدث دہلوی ، شیخ قمرالدین حسینی سونی پتی ، مولانا سید رمضان علی امروہی ، شیخ فضل حق عرف غلام مینا ساحر علوی کاکوروی ، مولانا شاہ ظہور الحق قادری پھلواری ، مولوی بہو علی دہلوی اور مولوی دھومن سہارنپوری وغیرہم اسی حقیقی چشمہ سے سیراب ہوئے - مذکورہ بالا اصحاب آسمان فضیلت کے وہ روشن ستارے ہیں جنہوں نے اپنے انوار کمالات سے دنیا کو چمکایا -

شاہ عبدالعزیز کے اساتذہ کرام :

شمس الہند ، شاہ عبدالعزیز کے اساتذہ کرام میں آپ کے والد گرامی شاہ ولی اللہ ، خواجہ محمد امین کشمیری اور شاہ محمد عاشق پھلتی کا شمار ہوتا ہے - آپ کے والد بزرگوار کے حالات باب دوم کے تحت بیان کردیے گئے ہیں - یہاں باقی دونوں اساتذہ کا ذکر کیا جاتا ہے -

خواجہ محمد امین کشمیری :

خواجہ محمد امین کشمیری دہلوی بمقام بخارا پیدا ہوئے اور دہلی میں سکونت اختیار کی - آپ کا شمار شاہ ولی اللہ کے عظیم ترین اصحاب اور ممتاز شاگردوں میں ہوتا ہے - آپ اپنے استاد شاہ ولی اللہ سے انتساب پر بے حد فخر کرتے تھے اور ان کی نسبت سے ہی مشہور و معروف تھے - شاہ ولی اللہ سے کتب دینیہ اور عقلیہ میں استفادہ کرنے کے بعد ان کے ہی مدرسہ میں تشنگان علم کی پیاس کو رفع کرنے لگے - شاہ ولی اللہ کے ترجمہ قرآن کو مدرسہ میں نصاب تعلیم کا جزو قرار دینے والی آپ کی ذات بابرکات تھی پھر مدرسہ رحیمیہ کے دوسرے دور میں بحیثیت مدرس کے طالبان علوم دین کی علمی تشنگی کو دور

کو کہ مدرسہ کا نام پیدا کرنے والی شخصیت بھی آپ ہی کی تھی ۔ آپ کے قابل فخر شاگرد شاہ عبدالعزیز نے اپنے والد گرامی شاہ ولی اللہ کی وفات کے بعد آپ سے حدیث کی اجازت لی تھی ۔ شاہ عبدالعزیز کے جلیل القدر استاد شیخ محمد امین کشمیری ۱۱۸۷ھ میں اس جہان فانی سے کوچ کرگئے (انا للہ وانا الیہ راجعون) آپ کے سن وفات کا ذکر آپ کے جلیل القدر شاگرد شاہ عبدالعزیز نے اپنی تصنیف "عجالہ نافعہ" میں کیا ہے ۔[1]

شاہ محمد عاشق پھلتی :

عظیم محدث شاہ محمد عاشق بن عبداللہ بن محمد صدیقی پھلتی بمقام پھلت ، کھاتولی ضلع مظفرنگر میں پیدا ہوئے ۔ آپ کا سلسلہ نسب اکیتس واسطوں سے محمد بن ابوبکر صدیق سے ملتا ہے ۔ شاہ صاحب ، شاہ ولی اللہ کے بھیجھیرے بھائی تھے ۔ ایام طفولیت میں آپ کا شمار شائقین علم میں ہوتا تھا ۔ اس لیے بچپن میں ہی اس شوق کو مدنظر رکھتے ہوئے تحصیل علم میں مصروف ہوگئے ۔ آپ نے علوم ظاہری وباطنی کی تکمیل شاہ ولی اللہ سے کی اور زیادہ تر ان کی صحبت میں رہ کر متعدد علوم میں معرفت حاصل کی ۔ شاہ محمد عاشق حرمین شریفین تشریف لے جانے سے بارہ سال قبل ہی فارغ التحصیل تلامذہ میں شامل ہوگئے تھے ۔ ۱۱۴۳ھ میں شاہ ولی اللہ کی معیت میں حج وزیارت کی غرض سے حرمین تشریف لے گئے ۔ حرمین شریفین میں آپ نے شاہ صاحب کے ساتھ وہاں کے جلیل القدر استاد شیخ ابو طاہر کردی مدنی سے علم حدیث کی تحصیل سے فارغ ہو کر سند حدیث حاصل کی اور علم و معرفت کے اس مقام عالی پر پہنچ گئے جو شاہ صاحب کے شاگردوں میں کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکا ۔ شاہ محمد عاشق ، شاہ ولی اللہ کے اسرار ورموز کے ترجمان ، قدر دان اور بہترین ساتھی تھے ۔ شیخ ابو طاہر کردی نے شاہ محمد عاشق کو جو سند حدیث عطا کی تھی ۔ اس میں آپ کے بارے میں یہ الفاظ بھی تحریر فرمائے تھے ۔

"انسہ مراۃ کمالہ وخدین جمیل خصالہ" ۔[2]

۱۔ شاہ عبدالعزیز ، عجالہ نافعہ ۔ ص ، ۵۲

۲۔ سید عبدالحئی لکھنوی ، نزھۃ الخواطر ۔ جلد ۶ ، ص ، ۳۲۹ ۔

شاہ محمد عاشق مدرسہ رحیمیہ کے پہلے دور میں شاہ صاحب کے ساتھ بھرپور تعاون کرتے ہوئے ان کے بہترین رفیق ثابت ہوئے ۔ شاہ صاحب کی وفات کے بعد اس درسگاہ کو قائم دائم رکھنے کے لیے آپ اپنے شاگرد رشید شاہ عبدالعزیز کے معاون و مددگار ثابت ہوئے اور بحیثیت مدرس کے اپنے فرائض بخوبی سرانجام دیے ۔ شاہ ولی اللہ آپ سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں :

یحدثنی نفسی بانک واصل الی نقطة قصواه وسط المراکز

وانک فی تلک البلاد مشخم یکلمک یوما کل شیخ وناهز

شاہ محمد عاشق پھلتی ۱۱۸۷ھ میں اس جہان فانی سے کوچ کرگئے ۔ یہ سن وفات شاہ عبدالعزیز کی تصنیف "عجالۃ نافعہ" سے اخذ کیا گیا ہے جو انہوں نے سید ابو سعید بریلوی کی طرف لکھی تھی۔

تلامذہ :
=======

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ،آپ کے چھوٹے بھائی شاہ رفیع الدین محدث دہلوی ، اور سید ابو سعید بریلوی جیسے جلیل القدر شاگردوں کے علاوہ دیگر بے شمار لوگوں نے آپ سے استفادہ کیاہ

تصانیف :
=====

موصوف کی تصانیف میں ایک کتاب " سبیل الرشاد " ہے جو تصوّف پر بہترین اور مبسوط کتاب ہے ۔آپ کی دوسری تصنیف " القول الجلی فی مناقب الولی " ہے ۔ یہ کتاب آپ نے اپنے استاد شاہ ولی اللہ کے حالات پر تحریر فرمائی تھی ۔ علاوہ ازیں " دعا الاعتصام" اور "تبیض المصفیٰ شرح الموطا" بھی آپ نے شاہ ولی اللہ کے لیے ہی تصنیف فرمائی ۔

شاہ رفیع الدین محدث دہلوی کے حالات زندگی
==============================

شاہ رفیع الدین بن شاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم محدث دہلوی سرزمین ہندوستان کے علم وتقوی میں مشہور و بابرکت خاندان میں ۱۱۶۳ھ/۱۷۴۹ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے ۔ شاہ ولی اللہ کے بیٹے فرزند ارجمند شاہ عبدالعزیز سے چھوٹے اور شاہ عبدالقادر سے بڑے تھے ۔ آپ نے سند حدیث اپنے

والد گرامی ، مشہور محدث شاہ ولی اللہ سے حاصل کرنے کے علاوہ باقی تمام کتب بھی ان ہی سے پڑھیں اور مزید تحصیل علم کے لیے ایک طویل عرصہ تک شاہ عبدالعزیز کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتے رہے ۔ اس دوران میں اپنے ماموں شاہ محمد عاشق سے بھی تحصیل علم میں مصروف رہے ۔ والد محترم کی وفات کے بعد آپ کی تربیت آپ کے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز نے کی ۔ علوم متداولہ اور فنون عقلیہ وغیرہم کی تعلیم کی طرف خاص توجہ دیتے ہوئے ان میں بھی یکتائے زمانہ ہوگئے ۔ آپ نے بیس سال کی عمر میں مفتی اور مدرس کا منصب سنبھالا اور اس عہدہ کے فرائض بڑی تندہی ، راستبازی ، انصاف پسندی اور محنت وکاوش سے سر انجام دیے ۔ اس سلسلے میں شاہ عبدالعزیز اپنے ایک مکتوب ۱۱۷۹ھ بنام شاہ ابو سعید راشے بریلوی میں تحریر فرماتے ہیں ۔

" رفیع الدین بفضل الٰہی تحصیل علوم سے فارغ ہوگئے ہیں ۔ ایک مجلس میں علماء و فقراء کے سامنے ان کے دستار تبرک باندھی گئی اور درس کی اجازت دی گئی ۔ الحمد للہ بہت سے طلباء ان سے مستفید ہو رہے ہیں " ۔[1]

کچھ عرصہ بعد آپ کے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز نے ، جو کبرسنی ، اشتداد وعوارض اور اضمحلال قویٰ کی بنا پر تعلیم وتدریس جیسی دماغی محنت کے متحمل نہ تھے ، اپنے مدرسہ کی صدارت کا بارگراں شاہ رفیع الدین کے کندھوں پر ڈال دیا ، جسے آپ نے بخوشی قبول کیا اور تقریباً پچاس برس تک آپ کی مقدس ذات گرامی مسند تدریس سے وابستہ رہی ۔ آپ ظاہر وباطن میں کامل ، شریعت وطریقت میں جامع اور عربی شاعری اور ادب میں بلند مقام پر فائز تھے ، گویا خصوصیت کے ساتھ ہر فن میں یکتائے روزگار تھے ۔ صاحب " نزهة الخواطر " آپ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں :

" الشیخ الامام ، العالم الکبیر ، العلامة الشهیر ، المحدث المتکلم ،

الاصولی البلیغ ، الحجة الرحلة ، فرید عصره ونادر دهره الشیخ

رفیع الدین بن ولی الله بن عبد الرحیم العمری الدهلوی " ۔[2]

۱۔ محمود احمد برکاتی ، شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان ۔ ص ، ۱۵۶

۲۔ سید عبدالحئی لکھنوی ، الـنزهة الخواطر ۔ ج ۔ ٦ ، ص ، ۱۸۲ ، ۱۸۳

یہی وجہ تھی کہ دیار و امصار سے آنے والے نامی گرامی اور جید علماء وفضلاء اور تشنگان علم آپ کے سامنے اپنے آپ کو طفل ابجد خان سمجھتے ، اپنی علمی پیاس بجھانے اور ظاہری وباطنی فیوض سے استفادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے اور اس چشمۂ علمی سے سیراب ہونے کے بعد بڑے بڑے عالم وفاضل بن کر اپنے اپنے وطن واپس لوٹتے - اس بارے میں صاحب " آثار الصنادید " رقمطراز ہیں :

" دیار ھندوستان کے جمیع فضلائے نامی انہیں حضرت فیض موہبت کے مستفیضوں میں سے ھیں - ہر فن کے ساتھ اس طرح کی مناسبت تھی کہ ایک وقت میں فنون متباینہ اور علوم مختلفہ درس فرماتے تھے - جب ایک کی تعلیم سے دوسرے کی تعلیم کی طرف متوجّہ ہوتے ، حضار خدمت کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا اسی فن میں جامہ یکتائی ان کے قامت استعداد پر قطع ہوا ہے ، باوجود ان کمالات کے افاضہ فیض باطن کا یہ حال تھا کہ جنید بغدادی اور حسن بصری کہ اگر ان کے وقت میں ہوتے توبے شک و ریب اس میں اپنے تئیں کمترین مستفیدان تصوّر کرتے " -[1]

گویا شاہ رفیع الدین کا علمی تبحر اور فضل وکمال ہر قدم پر قابل توصیف ہے - خداوند تعالیٰ نے آپ کو بلا کا حافظہ عطا کیا تھا جیسا کہ " علم وعمل " میں بیان کیا گیا ہے :

" مولوی رفیع الدین جامع الکمالات تھے لیکن فنون ریاضیہ کی تعلیم کی طرف زیادہ متوجّہ تھے - ان کا حافظہ ان کے ذہن تاباں سے بڑھا ہوا تھا - بخلاف مولانا شاہ عبدالعزیز کے ، کہ ان کے ذہن کی براقی ان کے عدیم النظیر حافظہ پر بدرجہا فوقیت رکھتی ہے " -[2]

علم وفضل کے مشہور شہسوار نہ صرف دینیات بلکہ علم ریاضی میں بھی بہت بلند مقام رکھتے تھے - ریاضیات میں آپ کے تبحر کے بارے میں شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں :

۱- سر سید احمد خان ، آثار الصنادید - ص ، ۹۲

۲- وقائع عبدالقادر خانی ، علم وعمل - جلد - ۱ ، ص ، ۲۲۸

"مولوی رفیع الدین در ریاضیات چندان ترقی کردہ کہ شاید موجدآں محمدطی هم بودہ باشد بازار ——— کہ درفن ریاضی مثل مولوی رفیع الدین درهندو ولایت نخواهد بود "۔[1]

تمام علوم میں یکتائے روزگار ہونے کے ساتھ ساتھ متین و سنجیدہ ، بے طمع ورحم دل انصاف پسند و راستباز ، حلیم وبردبار اور جود و سخا جیسی صفات سے متصف تھے گویا بشریت کے لباس میں فرشتہ خصلت تھے ۔ انہوں نے اپنے تمام اوقات دنیاوی کاروبار ، عبادت وریاضت اور درس وتدریس میں تقسیم کیے ہوئے تھے لیکن ان تمام مصروفیات کے علاوہ آپ نے تصنیف وتالیف کی طرف بھی مناسب توجّہ فرمائی ۔

تصانیف :

شاہ صاحب کی تصنیفات اگرچہ اتنی بسیط وطویل نہیں ، تقریباً مختصرات یا رسائل کی صورت میں ہیں لیکن پھر بھی یہ اپنے موضوعات کی ندرت ، خیالات کی لطافت اور اسلوب کی بلاغت کی بنا پر نہایت اہمیت کی حامل ہیں ۔ اگرچہ آپ درس وتدریس میں مصروف رہنے کے باعث

٣٦

تصنیف وتالیف کی طرف اپنی پوری توجّہ مبذول نہ کر سکے مگر پھر بھی آپ نے تقریباً چھتیس کتب تصنیف کیں ۔ اردو میں قرآن پاک کا ترجمہ کرکے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کو دین وایمان کی راہ پر لگا دیا اورعربی میں پرمعنی ، لطیف وبلیغ اور دلچسپ نثرونظم کے مضامین لکھنے کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی عمدہ اور مفید کتب تصنیف کیں ۔ شاہ صاحب کی بیش قیمت کتب میں سے بعض طبع ہو چکی ہیں ، کچھ زیر اشاعت ہیں ، بعض زمانے کی دست برد سے ضائع ہو گئیں اور کئی قلمی نسخوں کی صورت میں مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں ۔

(١) قرآن پاک کا ترجمہ : (اردو)

شاہ رفیع الدین کے والد گرامی قدر جناب شاہ ولی اللہ نے قرآن پاک کو بآسانی سمجھنے کے لیے اس کا فارسی ترجمہ کیا تھا اور شاہ رفیع الدین نے متن کی پابندی کا خاص خیال رکھتے ہوئے پہلی دفعہ

١۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ، ملفوظات ۔ ص ٢٠ ، ٦٢

اردو میں نہایت عمدہ لفظی ترجمہ (تحت اللفظ) کیا ہے۔ شاہ رفیع الدین کا یہ ترجمہ کئی دفعہ شائع ہوچکا ہے، جس سے خلائق عامہ مستفید ہورہی ہے۔

مجموعہ رسائل

یہ مجموعہ دس رسالوں پر مبنی ہے۔

(۲) رسالہ آذان نماز : (فارسی)

اس میں شاہ صاحب نے آذان کے کلمات کے تکرار کی حکمت بیان فرمائی ہے اور اس بے مختصر رسالہ میں کلمات آذان کی تشریح بھی واضح طور پر کردی ہے۔

(۳) رسالہ فوائد نماز (فارسی)

یہ مختصر رسالہ سالکان طریقت اور واصلان حقیقت کو باخبر کرنے کے لیے ہے۔ اس میں نماز کی حقیقت اور مخلوقات کے مختلف طبقات کی نمازوں کا الگ الگ ذکر کیا گیا ہے۔

(۴) جمسلۃ العرش : (فارسی)

شاہ عبدالعزیز نے رسالہ جمسلۃ العرش کا اہم حصہ تفسیر عزیزی میں نقل کیا ہے۔ یہ بہت مختصر ہے اور انسانی فکر میں بلندی پیدا کرتا ہے۔

(۵) رسالہ شرح رباعیات : (فارسی)

فارسی کی ان دو رباعیوں میں قرب اللہ جل شانہ کے ساتھ حقیقت اور انسان کا تعلق بیان کیا گیا ہے اور شاہ رفیع الدین نے ان کی نہایت غامض شرح لکھی ہے۔

(۶) رسالہ بیعت : (فارسی)

اس میں بیعت کی مشروعیت ، ضرورت ، فوائد اور اس کی چار قسمیں بیان کی گئی ہیں۔

(۷) شرح چھل کاف : (عربی)

مشہور دعا چھل کاف میں چالیس کاف آنے کی بنا پر اس نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس میں تین اشعار کی شرح اور اس کے فوائد بیان کیے گئے ہیں اور یہ اشعار غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی کی طرف منسوب ہیں۔

(۸) رسالہ معما شرح برہان العاشقین : (فارسی)

یہ رسالہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے رسالہ برہان العاشقین کی مختصر شرح ہے۔ حضرت گیسو دراز نے اس میں انسانی ترقی کے تمام امکانی مدارج ادنی درجہ سے اعلی مراتب تک رمز و اشارہ کی زبان میں بیان کئے ہیں۔

(۹) نذر بزرگان : (فارسی)

اس رسالے میں بزرگوں کے مزارات پر نذرانے لے جانے کے بارے میں مختلف احکام بیان کیے ہیں اور اس کے بارے میں حرام، جائز، مستحب اور غیر اولی صورتیں بیان کی ہیں۔

(۱۰) جوابات سوالات اثنا عشریہ : (فارسی)

یہ رسالہ بارہ مذہبی سوالات کے جوابات ہیں، جو فقہ اور علم الکلام سے متعلق، معتزلہ اور اہل سنت کے درمیان معرکۃ الاراء مسئلہ رویت باری تعالی کے بارے میں اور مسلمانوں کا کفار کی املاک پر قابض ہو کر متصرف ہونا اور کفار کا مسلمانوں کی املاک پر قابض و متصرف ہونے کے متعلق ہیں۔

(۱۱) رسالہ مجموعہ فتاوی شاہ رفیع الدین : (فارسی)

مختلف فقہی، اعتقادی اور چند اصولی وفروعی سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے۔ بہت عمدہ اور نفع بخش رسالہ ہے۔

دس رسائل کا یہ مجموعہ مولانا عبدالحمید سواتی نے مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ سے ۱۳۸۱ھ / ۱۹۶۲ء میں شائع کیا تھا۔ اس سے قبل سید ظہیر الدین ولی اللہی نے تسع رسائل کے نام سے یہ مجموعہ مطبع احمدی دہلی سے شائع کیا تھا لیکن عبدالحمید نے اس میں ایک رسالہ "مجموعہ فتاوی شاہ رفیع الدین" کا بھی اضافہ کر دیا۔

(۱۲) قیامت نامہ یا آثار القیامت : (فارسی)

اس مفید رسالے کا اردو ترجمہ کئی دفعہ طبع ہو چکا ہے۔ یہ رسالہ شاہ صاحب کے وعظ کی شکل میں پیش کئے گئے ارشادات پر مشتمل ہے۔ اس میں آخرت کی زندگی کا نہایت عبرت ناک

اور نصیحت آموز نقشہ پیش کیا گیا ہے - قرآن پاک کے اردو ترجمے کے بعد اس رسالے سے عام لوگ مستفید ہو سکتے ہیں -

(۱۳) اسرار المحبۃ مع قصائد شاہ رفیع الدین : (عربی)

یہ اپنے موضوع پر نہایت عجیب وغریب اور نادر کتاب ہے - یہ کتاب پہلی مرتبہ ادارہ نشر واشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ سے مع پانچ قصائد کے شائع ہوئی ہے ، جس میں ایک قصیدہ للشیخ ابی علی بن سینا اور دوسرا احمد شوقی کا قصیدہ ہے ، جو ابن سینا کے قصیدہ سے متاثر ہو کر اس کے ہم وزن لکھا ہے -

(۱۴) قصیدہ عینیہ فی رد قصیدۃ الشیخ ابن سینا : شاہ رفیع الدین کا دو سو اکاون اشعار پر مشتمل طویل اور عمدہ قصیدہ شیخ ابن سینا کے جواب اور رد میں لکھا گیا ہے -

(۱۵) تخمیس للشاہ رفیع الدین علی قصیدہ والدہ : (عربی)

یہ قصیدہ حضرت شاہ رفیع الدین کا ایک مخمّس ہے - چوتھی صدی کے مشہور فاضل اور فن طباعت کے موجد نے ایک قصیدہ لکھا تھا ، جس میں نفس اور اس کی حقیقت کے بارے میں سوال کیا تھا ، جس کا جواب جناب شاہ ولی اللہ نے ایک نظم کی صورت میں دیا تھا ، جسے مولانا شاہ رفیع الدین نے مخمّس کی ہیئت میں پیش کیا -

(۱۶) قصیدہ فی بیان معراج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم : (عربی)

شاہ رفیع الدین نے اپنے اس عمدہ قصیدہ میں رسول پاک کے خصائل وفضائل اور معراج کا ذکر کیا ہے - یہ دونوں قصائد حیات ولی میں بھی موجود ہیں -

(۱۷) دفع الباطل :

شاہ ولی اللہ کے مکتوب مدنی کے جواب میں مولوی غلام محسن بہالوی متوفی ۱۷۶۷ء نے رسالہ کلمۃ الحق تحریر کیا تھا - شاہ رفیع الدین نے کلمۃ الحق کے جواب میں دفع الباطل تحریر فرمایا - اس رسالہ کے مخطوطات رضا لائبریری رام پور ، سالار جنگ میوزیم دکن اور کتب خانہ شروانی علی گڑھ میں موجود ہیں -

شیخ محدث محسن ترہتی نے "الیانع الجنی" میں شاہ رفیع الدین کی تصانیف کی اور خاص طور پر "اسرار المحبۃ" اور "دفع الباطل" کی ان الفاظ میں تصریح کی ہے ۔

"لہ مختصر جامع بیّن فیہ سریان الحب فی الاشیاء کلھا و اوضح الناس اطوارہ سمی "اسرار المحبۃ" قلما اتفق مثلہ لنظیرہ ممن تکلم علیھا" ۔[1]

(۱۸) رسالہ آیت النور : (عربی)

سورۂ نور رکوع نمبر چار[2] کی مختصر اور بہترین تفسیر ہے ۔ یہ بے مثال رسالہ ایک مقدمہ ، ایک مقصد ، ایک تکملہ اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے ۔ اس کے مقدمہ میں محدثین عظام ، متکلمین ، صوفیاء کرام فلاسفہ اور اپنے والد گرامی شاہ ولی اللہ پر مشتمل پانچ گروہ ایسے بتائے ہیں ، جو معارت الہیہ (حقائق) پر بحث کرنے والے ہیں ۔

(۱۹) رسالہ مقدمۃ العلم : (عربی)

یہ رسالہ تکمیل الاذہان کے ساتھ طبع ہو چکا ہے اور "ابجد العلوم" میں موجود ہے ۔

(۲۰) رسالہ فی العروض ۔ یہ رسالہ بہت عرصہ پہلے شائع ہوا تھا ۔ اب دستیاب نہیں ہے ۔

(۲۱) رسالہ فی اثبات شق القمر و ابطال براھین الحکمۃ : لکھنؤ سے شائع ہونے کے بعد اب نایاب ہے ۔

(۲۲) تکمیل الاذہان : (عربی)

شاہ رفیع الدین کی یہ کتاب چار ابواب ، علم منطق ، فن تحصیل ، امور عامہ کے خاص مباحث اور تطبیق الاراء پر مشتمل ہے ۔ اگرچہ اس کے تین ابواب "ابجد العلوم" میں موجود ہیں لیکن اس کو مکمل طور پر عبدالحمید سواتی مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ نے شائع کیا ہے ۔

(۲۳) الدرار الدراری : اس کتاب کا ذکر شاہ صاحب نے تکمیل الاذہان کے باب تطبیق الاراء کے دیباچہ میں اور رسالہ جوابات اثنا عشریہ میں بھی کیا ہے ۔

---

۱ ۔ محمد محسن ترہتی ، الیانع الجنی ۔ ص ۷۵ ، ۷۶

(۲۴) رسالہ فی التاریخ (۲۵) رسالہ فی تحقیق الالوان (۲۶) رسالہ فی الحجاب (۲۷) رسالہ فی برہان التمانع (۲۸) رسالہ فی تفسیر سورۃ بقرۃ (تفسیر رفیعی) (۲۹) رسالہ سمت قبلہ (۳۰) تنبیہہ الغافلین (۳۱) رسالہ تعدیلات الخمسۃ المتحیّرہ (۳۲) رسالہ فی المنطق (۳۳) رسالہ فی امور عامہ (۳۴) راہ نجات اردو (۳۵) حاشیہ علی میرزاھد رسالہ فی بحث المثلم (۳۶) رسالہ فی عقد الانامل۔

مندرجہ بالا کتب کا ذکر صاحب الیانع الجنی ، صاحب حدائق الحنفیہ ، صاحب ابجد العلوم صاحب نزہۃ الخواطر اور مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ نے شاہ رفیع الدین کی طبع کردہ کتابوں کے مقدموں میں کیا ھے ۔

شاہ رفیع الدین صاحب کی تصنیفات ، فصاحت و بلاغت ، موضوع کی عظمت ، زبان کی پاکیزگی اور سلاست ، وسعت نظر ، دقت فکر اور علمی تبحّر پر پختہ دلیل ھیں ۔ شاہ صاحب نے دوسری مصروفیات کے علاوہ تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری رکھا لیکن خاندان ولی اللہی میں ان کا مقام مصنّف سے زیادہ مدرس اور واعظ کی حیثیت سے مسلّم ھے ۔

وفات :

=====

شاہ رفیع الدین آخری عمر تک دین کی خدمت میں مصروف ومنھمک رھے ۔ آخرکار یہ شمع ربّانی ۶ شوال ۱۲۳۳ھ / ۹ اگست ۱۸۱۸ء کو گل ھو گیا ۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) شاہ صاحب کے سن وفات میں مختلف مورخین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ھے ۔ صاحب تذکرہ علمائے ھند " نے آپ کا سن وفات ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۳ء لکھا ھے ، جب کہ اسکے برعکس صاحب دار الحکومت دھلی نے ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء صاحب نزھۃ الخواطر نے ۱۲۳۳ھ ، مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم نے ادسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۸ء ، صاحب تاریخ مسلمانان پاکستان وبھارت نے ۱۲۳۳ھ اور مولانا محمود احمد برکاتی نے اپنی تصنیف " شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان " میں ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۸ء ھی لکھا ھے " ۔ اسکے علاوہ مدرسہ نصرۃ العلوم

گوجرانوالہ سے شاہ رفیع الدین کی جتنی کتب طبع ہوئی ہیں ، ان سب میں آپ کا سن وفات ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۸ء ہی ہے ۔ لہٰذا اس بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاہ صاحب ۱۲۳۳ھ /۱۸۱۸ء میں ستر برس کی عمر میں فوت ہوئے ۔

شاہ صاحب کے انتقال پر شاہ عبدالعزیز کو بہت صدمہ پہنچا ۔ جب جنازہ آیا تو آپ نے آبدیدہ ہو کر جنازے کو کندھا دیا اور نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد جنازہ کو رخصت کیا ۔ شاہ صاحب کبر سنی اور ضعف صحت کے باوجود خود بھی قبرستان پہنچے ۔ انہیں اپنے والد کے پاس ہی دفن کر کے اپنے ہاتھوں سے قبر پر مٹی ڈالی ۔ واپس آ کر لوگوں کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا کہ :

" مرا چہار رشتہ بود یکی برادر حقیقی دوم قبلہ گاہی مرا بتفسیر دادند کہ فرزند تست سوم شہد داماد من شدہ چہارم شاگرد حاضران

پھر فرمایا ۔

کہ ترتیب منعکس در رحلت برادران واقع شد یعنی اول مولوی عبدالغنی کہ خورد ترین ہمہ ما بودند بعد ازان مولوی عبدالقادر از او شان بعدہ مولوی رفیع الدین کلان از اوشان حالانکہ کلان سال از اوشان ہستم باقی ماندم " [1]

تلامذہ :

شاہ رفیع الدین کے تلامذہ میں ان کے صاحبزادے شاہ مخصوص اللہ ، علاوہ ازیں شاہ ابو سعید صاحب عمری مجددی دہلوی ، مولوی آل حسن قنوجی ، مولوی حسین احمد ملیح آبادی اور مولانا رشید الدین خان دہلوی کا شمار ہوتا ہے ۔ [2]

---

(۱) شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ، ملفوظات ۔ ص ۸۸ ، ۸۹

(۲) رحمان علی ، تذکرہ علمائے ہند ۔ ص ۶۰ ، ۶۲ ، ۶۳

اخلاف :

شاہ رفیع الدین کے چھ سعادت مند صاحبزادے اور ایک ہونہار صاحبزادی امۃ اللہ تھیں ۔ "مولانا محمود احمد برکاتی نے آپ کے چھ صاحبزادوں (مولوی محمد علی ، مولوی مصطفی ، مولوی مخصوص اللہ ، مولوی محمد حسن ، مولوی محمد موسی اور مولوی محمد حسین) کا ذکر کیا ہے اور سید عبدالحئی نے اپنی تصنیف میں ان ہی چھ صاحبزادوں کا ذکر کرتے ہوئے ان میں سے تین (مولوی مخصوص اللہ ، مولوی محمد موسی اور مولوی مصطفی) کے نام تحریر کیے ہیں ، جب کہ اس کے برعکس "حیات ولی اور "ولی اللہ" کے مصنف نے آپ کے چار بیٹوں (مولوی محمد موسی ، مولوی مخصوص اللہ ، مولوی عیسی اور مولوی حسن جان) کا ذکر کیا ہے" ۔[1] مولانا محمود احمد برکاتی اور سید عبدالحئی کے قول کی تائید میں یہ شہادت کافی معلوم ہوتی ہے کہ شاہ رفیع الدین کے بیٹے محمد مصطفی کا عقد شاہ عبدالقادر کی صاحبزادی زینب سے ہوا تھا اور ان کی صاحبزادی کلثوم کی شادی شاہ اسمعیل شہید سے ہوئی تھی ۔

شاہ عبدالقادر دہلوی کے حالات زندگی

مولانا شاہ عبدالقادر ، شاہ ولی اللہ کے تیسرے فرزند ، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور شاہ رفیع الدین کے چھوٹے بھائی ۱۱۶۷ھ /۱۷۵۳ء میں پیدا ہوئے ۔ آپ نے ظاہری و باطنی علوم و تربیت کا آغاز اپنے والد بزرگوار شاہ ولی اللہ سے کیا ۔ تقریباً دس سال کی عمر میں والد گرامی کے سایہ عاطفت سے محروم ہوگئے ۔ والد صاحب سے تمام دینی و عقلی علوم کی تحصیل کے بعد آپ مزید علوم کے حصول کے لیے

۱۔ محمود احمد برکاتی ، شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان ، ص ۱۶۳ ، سید عبدالحئی لکھنوی ، دہلی اور اس کے اطراف ، ص ۶۵ ۔ عبدالرحیم بخش دہلوی ، حیات ولی ، ص ۲۶۹ ، ابوالحسن اسمعیل گودھروی ، شاہ ولی اللہ ، ص ۸۳ ۔

اپنے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز ، شاہ محمد عاشق ، دیگر اہل کمال اور اکابر دین کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ بیعت وارشاد شیخ عبدالعدل دھلوی سے کی ۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ نے دھلی میں اکبرآبادی مسجد میں درس وتدریس اور وعظ وتلقین کا سلسلہ شروع کیا ۔ جب درس قرآن ، وعظ ونصیحت اور تلقین فقہ سے فارغ ہوتے تو ذکر وفکر اور طاعت وریاضت میں مصروف ہوجاتے ۔ مذہبی تقدس کے علاوہ آپ کو دنیاوی اعزاز میں بھی بہت بلند مقام حاصل تھا ۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی وفات کے بعد اگرچہ گورنمنٹ قلعہ نے آپ کی بہت عزت افزائی کی لیکن مستغنی المزاج ہونے کے باعث دنیا اور اہل دنیا کی طرف قطعاً متوجہ نہ ہوئے ۔ دنیاوی ساز و سامان اور اس کی آرائش وزیبائش آپ کی نگاہوں میں ذرّہ بھر بھی اہمیت کے حامل نہ تھے ۔ اس کے علاوہ آپ کا زبردست رعب ، پرسطوت دبدبہ اور علمی و ادبی جاہ وجلال قدرتی طور پر لوگوں کے دلوں پر اس حد تک چھایا ہوا تھا کہ بڑے بڑے معزز امراء و روساء اور شہزادوں سے لے کر ادنی درجہ تک کے لوگ جب آپ کے علمی دربار میں حاضر ہوتے تو نہایت ادب ، تعظیم اور خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ جاتے اور آپ کی اجازت کے بغیر بات نہ کرتے ۔ اجازت ملنے پر مطلوبہ بات کرنے کے علاوہ مزید گفتگو کی ہمّت نہ ہوتی ۔ اس زمانے کے اہل کمال میں سے مکاشفے میں شاہ صاحب کا کوئی ثانی نہ تھا ۔ اگر کسی بات کے بارے میں آپ سے کچھ دریافت کیا جاتا اور اس کے جواب میں جوکچھ ارشاد فرماتے ، خدا کے فضل وکرم سے وہی ظہور پذیر ہوتا ۔ اس قول کی تائید میں صاحب "آثار الصنادید" یوں رقمطراز ہیں کہ :

> "بارہا ثقات کی زبان سے سنا گیا ہے کہ جس امر میں کچھ فرمایا ، ویسا ہی بے کم وکاست ظہور میں آیا ۔ باوجود اس کے ، کہ بسبب کثرت اخلاق کسے کسی کے حق میں کچھ ارشاد نہ کرتے اور کسی کو نہ فرماتے کہ ادھر بیٹھ یا ادھر لیکن بجناب اللہ لوگوں کے دل میں آپ کا ایسا رعب چھایا ہوا تھا کہ رؤسائے شہر جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے بسبب ادب کے دور دور خاموش بیٹھتے اور بدون آپ کی تحریک کے مجال سخن نہ پاتے اور ایک دو بات کے سوا یارا نہ دیکھتے کہ کچھ اور کلام کریں ۔ کرامت حضرت بحد تواتر پہنچ گئی ہیں ۔ اگران کا بیان کیا جائے ، کتاب میں گنجائش نہیں ۔

مردان خدا خدا نباشد ۔ لیکن ز خدا جدا نباشد "۔[۱]

گویا شاہ صاحب ایک فاضل اجل وعالم کامل ، محدث ومفسّر ، فقیہہ و واعظ ، متقی وپرہیزگار منکسر المزاج اور خلق و تواضع میں بے مثل تھے ۔ آپ کی کرامات اور روحانی جذبات کا چرچا زبان زد خاص وعام تھا جیسا کہ صاحب " الیانع الجنی " لکھتے ہیں کہ :

" ابا العلا فضل الحق العمری الخیرآبادی ۔۔ کما حدثنا هو بذلک وسمعته غیر مدة یثنی علیه ویحکی لنا من کراماته " ۔[۲]

مندرجہ بالا قول کی تائید " ارواح ثلاثہ " میں مولوی فیض الحسن صاحب کے اس قول سے بھی ہوتی ہے ۔ فرماتے ہیں کہ " شاہ عبدالقادر سے کرامات کا اس زور شور سے صدور ہوتا تھا جیسے خزان کے زمانہ میں پت جھڑ ہویا بارش کے وقت بوندیں گرتی ہیں " ۔[۳]

شاہ صاحب کے دربار میں امیر وغریب سب یکساں مقام رکھتے تھے ۔ آپ اپنے علمی دربار میں حاضر ہونے والوں کی علمی واخلاقی تربیت کرتے ۔ عربی ادب کے مشہور شاعر وادیب اور علم معقول کے امام مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدر الدین آپ کے شاگردوں میں سرفہرست ہیں ۔ جس دن یہ دونوں حضرات درس کے لیے خود کتاب لے کر حاضر خدمت ہوتے ، اس روز شاہ صاحب سبق پڑھاتے تھے اور جس دن کتاب خدمت گار کے ہاتھ لاتے اور شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچنے سے پہلے خود لے لیتے ، اس دن آپ سبق نہ پڑھاتے کیونکہ آپ کشف کے ذریعہ اس بات سے آگاہ ہوجاتے تھے ۔ گویا یہ واقعہ آپ کے کمال کشف اور اپنے شاگردوں کی اعلی اخلاقی تعمیر پر دلالت کرتا ہے ۔

صاحب کشف بزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ علم منقول ومعقول کے امام ، دنیا سے نفرت کرنے والے ، گوشہ نشینی کے عادی ، زاہد وعابد ، متوکل اور متبحّر عالم تھے ۔ آپ نے اپنی تمام عمر دھلی کی اکبرآبادی مسجد میں درس وتدریس ، وعظ وفتاوی اور ریاضت وعبادت میں گزاری ۔

۱۔ سرسید احمد خان ، آثار الصنادید ۔ ص، ۹۵ ، ۹۶

۲۔ محمد محسن ترهتی ، الیانع الجنی ، ص ، ۷۵

۳۔ امیر شاہ خان ، ارواح ثلاثہ ۔ ص ، ۵۰

دنیاوی مال و متاع میں بالکل دلچسپی نہ تھی - یہی وجہ تھی کہ آپ نے اپنی حیات میں اپنی تمام جائیداد حصص شرعیہ کے مطابق اپنی صاحبزادی اور اپنے بھائیوں کے نام منتقل کر دی چونکہ شاہ اسمٰعیل بن شاہ عبدالغنی کے ساتھ آپ کو بہت محبّت تھی اور آپ نے ان کو اپنا متبنی بھی بنایا ہوا تھا ، اس لیے اپنی بیٹی اور بھائیوں سے اجازت حاصل کرنے کے بعد کچھ حصّہ ان کے نام بھی منتقل کر دیا تھا اور خود اللہ کی بلند و برتر ذات پر بھروسہ کیے بیٹھے رہے -

شاہ عبدالعزیز اپنے بھائی سے بہت محبت کرتے تھے ، اس لیے آپ کے لیے دو وقت کا کھانا اور کپڑے کا اہتمام بھی آپ ہی کرتے تھے - شاہ عبدالقادر دنیا و مافیہا سے بے خبر تدریس علوم میں مصروف عوام و خواص کو اپنے چشمۂ فیض سے سیراب کر رہے تھے اور ہفتہ میں ایک دن (چہار شنبے کو) شاہ عبدالعزیز اور دوسرے اعزّہ و اقارب سے ملاقات کے لیے مسجد سے مکان میں تشریف لے جاتے تھے -

شاہ صاحب کے والد گرامی شاہ ولی اللہ نے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے قرآن پاک کے مفہوم کو بآسانی سمجھنے کے لیے " تفسیر فتح الرحمٰن " کے نام سے فارسی ترجمہ کیا تھا لیکن شاہ عبدالقادر نے اہل ہند کی زبان میں قرآن پاک کا بامحاورہ اور سلیس ترجمہ اور تفسیر " موضح القرآن " کے نام سے لکھی - شاہ عبدالقادر صاحب کا مندرجہ ذیل خواب اس ترجمہ کے تحریر کرنے کا باعث ہوا ، جیسا کہ " نزہۃ الخواطر " میں ہے کہ " شاہ عبدالقادر نے خواب میں دیکھا کہ ان پر قرآن پاک نازل ہوا ہے - انہوں نے یہ خواب شاہ عبدالعزیز کو سنایا تو آپ نے فرمایا کہ بے شک یہ حق خواب ہے لیکن وحی تو رسول پاک کے عہد سے منقطع ہو چکی ہے اور اس کی تاویل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے قرآن پاک کی خدمت لینا چاہتے ہیں ، جس کی طرف اس سے قبل کوئی بھی سبقت نہیں لے گیا لہذا میں نے اس خوشخبری کو " موضح القرآن " کی صورت میں پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا " -[1]

شاہ صاحب نے قرآن پاک کا سلیس اردو اور بامحاورہ ترجمہ اس حسن و خوبی سے کیا ہے کہ عربی اور اردو زبان کے محاورات پر حاوی لوگ بھی اس ترجمے کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے -

---

۱- سید عبدالحئی لکھنوی ، نزہۃ الخواطر - جلد - ۷ ، ص، ۲۹۵ -

یہ مختصر اور آسان ترجمہ حقیقت میں بے انتہا دلکش خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ ہے - یہ ترجمہ دقیق و باریک مطالب سے لبریز ؛ تلفظ میں نہایت آسان مگر عمیق مضامین سے پر اور چھوٹے چھوٹے مگر فصیح و بلیغ جملوں سے مزین ہے - اس ترجمے کی تائید میں " حیات ولی " کے مصنف نے کسی فاضل کا یہ قول نقل کیا ہے کہ " اگر اردو زبان میں قرآن مجید نازل ہوتا تو ان ہی محاورات کے لباس سے آراستہ ہوتا ، جن کی رعایت جناب مولانا شاہ عبدالقادر صاحب نے اس ترجمے میں پیش نظر رکھی ہے " -[1]

شاہ صاحب کے قرآن پاک کے اردو ترجمے کے بارے میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں لیکن " انفاس العارفین " کے اختتام پر سید ظہیر الدین احمد ولی اللہی نے " تفسیر مولانا شاہ عبدالقادر المعروف " موضح القرآن " کو اس خاندان سے منسوب جعلی تفسیر قرار دیا ہے اور مولوی عبدالحئی لکھنوی نے شاہ صاحب کے ایک اور رسالہ " تقریر الصلوۃ " کا بھی ذکر کیا ہے " -[2] ان دو یا تین تصانیف کے علاوہ شاہ صاحب کی کسی اور تصنیف کا کہیں بھی ذکر نہیں آیا - شاہ صاحب تمام عمر مسجد اکبر آبادی میں درس و تدریس اور ذکر و فکر میں مصروف رہنے کے باعث تصانیف کی طرف مناسب توجہ نہ دے سکے -

تلامذہ :
======

صاحب " نزہۃ الخواطر " نے شاہ صاحب کے تلامذہ میں عبدالحئی بن ہبۃ اللہ بڑھانوی ، شیخ اسمٰعیل بن عبدالغنی ، شیخ فضل حق بن فضل امام خیر آبادی ، مرزا حسن علی شافعی لکھنوی ، شیخ اسحاق بن افضل العمری الدهلوی ، سید محبوب علی جعفری اور سید اسحاق بن عرفان بہلوی "[3] کا ذکر کیا ہے - ان کے علاوہ مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی ، شاہ محمد یعقوب دہلوی مہاجر مکّی اور شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی جیسے علمائے عصر نے بھی آپ سے علوم نقلیہ میں استفادہ کی سعادت حاصل کی تھی -

---

١ - عبدالرحیم بخش دہلوی ، حیات ولی - ص ، ٦٣٨
٢ - سید عبدالحئی لکھنوی ، الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند - ص ، ١١٨
٣ - سید عبدالحئی لکھنوی ، نزہۃ الخواطر - جلد ، ٧ ، ص ، ٢٩٥

وفات :

=====

شاہ صاحب بروز بدھ ۱۹ رجب ۱۲۳۰ھ /۱۸۱۵ء میں معمولی سی علالت کے بعد وفات پاگئے ۔(اناللہ وانا الیہ راجعون) آپ کی وفات کے وقت شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالعزیز بقید حیات تھے ۔ جب آپ دونوں شاہ صاحب کو دفن کرکے آپ کی قبر پر مٹی ڈال رہے تھے توفرماتے تھے :

" انا لا ندفن الانسان بل ندفن العلم والعرفان "

شاہ صاحب نے کوئی اولاد نرینہ نہ چھوڑی آپ کی صرف ایک صاحبزادی تھی ، جن کی شادی رفیع الدین کے فرزند شاہ محمد مصطفی سے ہوئی تھی ۔

شاہ عبدالغنی محدث دہلوی

===================

مولانا شاہ عبدالغنی دہلوی شاہ ولی اللہ کے چوتھے اور سب سے چھوٹے فرزند ۱۱۷۰ھ /۱۷۵٦ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے ۔ آپ نے اپنی تعلیم کا آغاز اپنے والد بزرگوار شاہ ولی اللہ جیسی بلند پایہ ذات گرامی سے کیا ۔ تقریبا" چھ سات برس کی عمر میں اپنے والد صاحب کے سایۂ رحمت سے محروم ہوگئے ۔ والد صاحب کی وفات کے بعد آپ نے شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین جیسی قابل قدر ہستیوں سے حدیث ، فقہ اور تفسیر میں مہارت تامہ حاصل کرلی ۔ حدیث و تفسیر جیسے علوم میں یکتائے روزگار ہونے کے بعد درویشانہ زندگی کو اپنا شعار بنا لیا اور درس و تدریس میں مصروف ہوگئے ۔ ظاہری و باطنی فیوض میں شہرت عام رکھتے تھے ۔ کتاب و سنت کی تعلیم میں بہت دلچسپی لیتے اور اکثر اوقات تدریس طلباء میں منہمک ہوتے تاکہ طلباء ہرممکن استفادہ کرسکیں ۔ کمال علمی کے علاوہ استغناء ، توکل اور قناعت میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا ۔ دین سے وابستگی

کی بنا پر جن بڑے امراء و روسا بھی نہایت ادب سے پیش آتے تھے۔ ان کی قناعت پسندی کسی تاحد میں صاحب "ارواح ثلاثہ" یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ مولانا گنگوہی فرماتے ہیں "ایک مرتبہ شاہ عبدالغنی صاحب کے یہاں کئی وقت کا فاقہ ہوا۔ اس کا تذکرہ ان کی ماما نے کہیں کردیا۔ اس کی خبر کسی ذریعہ سے مفتی صدرالدین خاں صاحب کو بھی ہوگئی۔ مفتی صاحب نے تین سو روپے شاہ صاحب کی خدمت میں بھجوا دیے۔ شاہ صاحب نے واپس کردیے۔ اس پر مفتی صاحب وہ روپے لے کر خود حاضر ہوئے، تخلیہ میں روپے پیش کیے اور فرمایا کہ شاید حضور کو خیال ہوا ہو کہ یہ صدرالصدور ہے، رشوت لیتا ہوگا، اسی لیے میں یہ عرض کرتا ہوں کہ میں رشوت نہیں لیتا بلکہ یہ روپے میری تنخواہ کے ہیں۔ آپ ان کو قبول فرما لیجئے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ مجھے تو یہ وسوسہ بھی نہیں گذرا کہ تم رشوت لیتے ہوگے۔ میں تمہاری نوکری کو بھی اچھا نہیں سمجھتا اور اسی لیے میں ان کے لینے سے معذور ہوں"۔[1]

وضع ولباس، اخلاق وعادات اور حلیہ میں اپنے والد بزرگوار سے بہت مشابہت رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ شاہ صاحب کو دیکھتے ہی شاہ ولی اللہ کا گمان ہوتا تھا۔ اہل وعیال کے باوجود آپ دنیا اور اہل دنیا کی زیب و زینت سے دور رہے۔ زندگی کے آخری وقت تک کتاب و سنت کی تعلیم دیتے رہے۔ ستاون (۵۷) برس کی عمر میں ۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء میں اس جہان فانی کو داغ مفارقت دے گئے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔

اخلاف:

شاہ صاحب کے ایک صاحبزادے شاہ اسمٰعیل تھے، جو اپنے دادا شاہ ولی اللہ کے علوم پر حاوی ہوکر تمام عمر مسلمان قوم کی رشد وہدایت میں مصروف رہے اور آخرکار اپنے جوش عمل اور جذبۂ ایمانی سے سرشار ہوکر "تحریک جہاد" کا علم بلند کیا۔ اس روحانی پیشوا اور محسن ملت کے ایک فرزند محمد عمر تھے، جو ۲۲ جمادی الثانی ۱۲۶۸ھ کو لاولد ہی فوت ہوئے۔

۱۔ امیر شاہ خان، ارواح ثلاثہ۔ ص، ۱۳۵

حضرت شاہ محمد اسحاق دھلوی کے حالات زندگی

یگانہء آفاق شاہ محمد اسحاق ، مولانا شیخ محمد افضل فاروقی محدث لاھوری کے قابل فخرفرزند اکبر ، امام شاہ عبدالعزیز کے بڑے نواسے ، خلیفہ ،جانشین اور خاندان ولی اللٰھی کے چشم و چراغ اور آخری عظیم و جلیل رکن تقریبا" ۱۱۹۲ھ / ۱۷۷۹ء میں بمقام دھلی پیدا ھوئے ۔ آپ کا سلسلہ نسب والدین کی طرف سے حضرت عمر فاروق تک جا پہنچتا ھے ۔ والد کی طرف سے آپ کا سلسلہ نسب یوں ھے ۔

" حضرت شاہ محمد اسحاق بن محمد افضل بن احمد بن اسمٰعیل بن منصور بن احمد بن محمود بن قوام الدین عرف قاضی قوازن " الخ ۔[1]

لیکن اس کے برعکس آپ کی والدہ کا سلسلہ نسب آپ کے والد کے سلسلہ میں منصور بن احمد سے جا ملتا ھے لہذا آپ نجیب الطرفین فاروقی ھیں ۔

ابو سلیمان شاہ محمد اسحاق نے علم و حکمت ، زھد و تقوی اور معرفت الٰہی کے ایک ایسے گہوارے میں آنکھیں کھولیں ،جس کی تعمیر سید العارفین شیخ احمد فاروقی سرھندی کے جزبہء اتباع شریعت ، شاہ عبدالرحیم کے زھد و تقوی ،امام الھند شاہ ولی اللہ کی حکمت عملی ،شمس الھند شاہ عبدالعزیز کے علم کامل ، امام اھل العقل مولانا شاہ رفیع الدین کے فیض باطن اور امام اھل النقل شاہ عبدالقادر کے تقوی اور توکل سے مکمل ھو چکی تھی ۔

ابتدائی تعلیم :

ابتدائی تعلیم اپنے دانا امام المحدثین شاہ عبدالعزیز ،مولانا شاہ رفیع الدین اور مولانا شاہ عبدالقادر سے حاصل کی ۔ تمام ظاھری و باطنی علوم وفنون میں عموما" اورعلم تفسیر، حدیث اور فقہ میں خصوصا" مہارت تامہ حاصل کرلی تھی ۔ علاوہ ازیں شاہ عبدالعزیز سے سلسلہ قادریہ میں بیعت بھی کی تھی ۔ تحصیل علم سے فراغت کے بعد مدرسہ رحیمیہ میں مسند تدریس پر رونق افروز ھوئے

۱۔ سید ابو احمد سجاد ، مقدمہ مسائل اربعین ۔ ص ۳۰

اور مسلسل بیس برس تک شاہ عبدالعزیز کے زیر سایہ اس مدرسہ کی خدمت سرانجام دیتے رہے۔ شاہ عبدالعزیز کے وصال (۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۳ء) کے بعد مدرسے کے تیسرے اور آخری دور میں اس کے تمام شعبوں کے جانشین اور صدر شاہ محمد اسحاق ہی رہے۔ ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء میں آپ فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے حرمین شریفین تشریف لے گئے۔ ۱۲۴۱ھ / ۱۸۲۵ء میں شیخ عمر بن عبدالکریم مکی (متوفی ۱۲۴۷ھ) نے آپ کو اپنے طریقہ پر روایت حدیث کی اجازت دی۔ دو سال بعد ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء میں آپ واپس ھندوستان تشریف لائے اور مدرسہ رحیمیہ میں مسند درس وارشاد پر متمکن ہوئے۔ یہاں پر آپ وعظ ونصائح سے خلق خدا کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرتے رہے لیکن جب شعائر اسلام میں ضعف اور کمزوری کے علاوہ رسوم اسلامی میں بدعات کی قوت وطاقت میں اضافہ ہوتا دیکھا تو شوال ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء میں سولہ سال تک حلقۂ درس سے منسلک رہنے کے بعد سب کچھ چھوڑ کر ہجرت کا پختہ ارادہ کرتے ہوئے تمام قبائل کو ہمراہ لے کر مکہ معظمہ روانہ ہوگئے۔ وہاں بھی آپ نے عبادت وریاضت کے علاوہ درس وتدریس کو اپنا مشغلہ بنائے رکھا۔ جوار حرم میں چار سال اور چند ماہ کی طاعت وعبادت اور علم وعمل میں مصروف رہنے کے بعد ماہ رجب ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۶ء میں مکۂ معظمہ میں راہی ملک عدم ہوئے اور معلّی میں امّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے مزار کے قریب دفن ہوئے۔

فضل وکمال :
========

امام الہند شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا حلقۂ درس نہ صرف ھندوستان بلکہ عرب تک پھیلا ہوا تھا۔ شمس الہند شاہ عبدالعزیز کے تینوں بھائی (شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، شاہ عبدالغنی) ترتیب معکوس میں وفات پا چکے تھے یعنی سب سے پہلے چھوٹے بھائی شاہ عبدالغنی، پھر شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین فوت ہوئے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کی وفات کے بعد آپ کے نواسے مولانا اسحاق آپ کے جانشین، خاندان ولی اللّٰہی کی مسند علم وارشاد کے وارث، مسلمانان پاک وھند کی مذہبی اور روحانی قیادت کے مالک اور پورے ملک میں علوم دینیہ کے مرجع علماء وفضلاء تھے۔ آپ انیسویں صدی کے بیشتر خدام

حدیث نبوی کے شیخ بھی تھے۔ حجۃ اللہ شاہ ولی اللہ نے ۔۔ برسوں پہلے اپنے احفاد کے دائرہ فیض کی جو نوید سنائی تھی ، اس پیش گوئی کو صاحب "اتحاف النبلاء" نے بحوالہ "قول جلی" حضرت شاہ ولی اللہ دھلوی سے نقل کیا ہے۔

"آگاھی آمد این فرزندان کہ لطف الٰہی ایشان را بما عطا کردہ است ھمہ سعدا اند نوعی از ملکیت در ایشان ظہور خواھد کرد لیکن تدبیر غیب تقاضا میکند کہ دو شخص دیگر پیدا شوند کہ در مکہ و مدینہ سالہا احیای علوم دین نمایند و ھمان جا وطن اختیار کنند از طرف مادر دسب ایشان بما متکی باشد زیرا کہ آدمی زادہ بوطن مادر میلان طبعی وارد انتقال جماعہ کہ وطن والدہ ایشان متکی باشد بسر زمینی بالطبع مستحیل است مگر بقسر قاسر"۔[1]

اس پیش گوئی کا مصداق حضرت شاہ عبدالعزیز کے دونوں نواسے حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق اور مولانا شاہ محمد یعقوب ھیں کیونکہ یہ دونوں بزرگ دھلی سے ھجرت کرکے مکہ مکرمہ میں اقامت گزیں ھوگئے تھے اور وھیں عرصہ تک احیائے علوم میں مصروف ھوکر عرب و عجم کو مستفید فرماتے رھے۔ یہ خیال کرنا بالکل غلط ھے کہ شاہ محمد اسحاق مکہ معظمہ ھجرت کرنے کے بعد ھندوستان میں اسلام اور اھل اسلام سے بالکل منقطع ھوگئے بلکہ آپ نے حرمین شریفین میں مقیم ھوکر مشرب ولی اللٰھی کی ترویج اور اصلاح امت کے کام کو جاری رکھا نتیجتاً کمپنی بہادر نے آپ کی جاگیر کو ضبط کر لیا اور صرف اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ بمبئی سے چند ھندوستانیوں کو شیخ الحرام کے پاس بھیجا ، جنھوں نے آپ کو وھابی ثابت کرکے وھاں سے نکلوا دینے کی ناکام کوشش کی۔ شاہ محمد اسحاق کو حدیث میں بہت بلند مقام حاصل تھا۔ آپ کے غسل جنازہ کے موقع پر شیخ عبداللہ سراج مکّی نے فرمایا تھا :

"واللہ انہ لو عاش وقرأت علیہ الحدیث طول عمری
ماقلت ماقالہ"۔[2]

1- نواب صدیق حسن خان ، اتحاف النبلاء - ص ۲۲۰ ، ۲۲۱

2- فضل حسین ترھتی ، الحیاۃ بعد المماۃ - ص ۳۸

شاہ محمد اسحاق حدیث کے علاوہ علم رجال میں بھی بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ متقی اور پرہیزگار ہونے کے باعث اپنا اکثر وقت عبادت و ریاضت میں محویت و استغراق کے ساتھ گزارتے تھے۔

"شاہ عبدالعزیز صاحب جب مدرسے میں تشریف لے جا کر دریافت کرتے کہ اس وقت مدرسہ میں کون ہے؟ اگر خدام کہتے کہ حضور فلاں ہے، تو فرماتے خیر۔ اگر اور (لوگ) کہہ دیتے کہ میاں اسحاق ہیں تو فرماتے کہ مدرسہ کی حفاظت کا انتظام کر دو۔ اسحاق کے بھروسہ نہ رہو، اسباب تو اسباب اگر کوئی مدرسہ کی دیواریں اٹھا کر لے جائے گا، تب بھی اسے خبر نہ ہوگی"۔[1]

گویا محویت اور استغراق کے عالم میں آپ ارد گرد کے ماحول سے بالکل بیگانہ ہو جاتے تھے۔

شاہ عبدالعزیز اپنے اس لائق اور قابل فخر نواسے کو دیکھتے تو فرماتے:

"الحمدللہ الذی وھب لی علی الکبر اسمٰعیل واسحاق"۔[2]

اسی طرح آپ کے زہد کے بارے میں ارشاد فرماتے:

"میری تقریر اسمٰعیل (شہید) نے، تحریر رشیدالدین نے اور تقوی اسحاق نے لیا"۔[3]

شاہ محمد اسحاق جب پہلی مرتبہ حرمین شریفین تشریف لے گئے تو عمر بن عبدالکریم مکی سے سند و اجازت حدیث حاصل ہوئی۔ شیخ عمر آپ کے متعلق فرمایا کرتے تھے:

"قد حلت فیہ برکۃ جدہ الشیخ عبدالعزیز الدھلوی"۔[4]

شاہ عبدالعزیز نے اپنی حیات مبارک میں ہی آپ کو اپنا پیش امام مقرر کرلیا تھا۔ اتباع سنت کے شوق و ترویج میں بطور عامہ نماز پڑھا دیتے، جس کی شکایت ایک ولایتی ملا نے جو شریک نماز ہوتا، کئی دفعہ حضرت شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں کی۔ آخر ایک روز آپ نے جلال میں آکر فرمایا:

۱۔ رئیس احمد جعفری، بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد۔ ص، ۲۸۱

۲۔ فضل حسین ترھتی، الحیاۃ بعد المماۃ۔ ص، ۱۰۸

۳۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری، تواریخ عجیبہ۔ ص، ۱۲۲

۴۔ فضل حسین ترھتی، الحیاۃ بعد المماۃ۔ ص، ۳۸

"ابھی تو اسحاق ٹوپی سر پر رکھ کر امامت کرتا ہے ۔ آئندہ میں اس سے کہہ دونگا کہ ننگے سر نماز پڑھائے اور ساری دنیا کو اقتداء کرنی ہوگی "۔[1]

گویا شاہ عبدالعزیز اپنے نواسے شاہ محمد اسحاق کے زہد وتقوی کی بنا پر ننگے سر اقتداء کرنے کو بھی جائز قرار دیتے ہیں ۔

شاہ محمد اسحاق تقریبا" چالیس برس تک علم حدیث کی تدریس اور فتاوی نگاری میں مصروف رہے ۔ اس دوران میں جو لوگ کچھ مسائل لے کر آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتے ،آپ استفتاء کا جواب شیخ السید محمد نذیر حسین محدث دہلوی سے لکھوایا کرتے تھے ۔ سرسید احمد خان آپ کی عزت وعظمت ،علم حدیث اور فضل وکمال کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں کہ "آپ نے حدیث اور علم حدیث کا درس بیس برس تک جناب شاہ عبدالعزیز صاحب کے سامنے بیٹھ کر طلبہ کو دیا ۔ امتناع سنت سے کوئی کام آپ سے سرزد نہ ہوتا چونکہ حق جلّ وعلا نے صورت اور سیرت دونوں عطا کی تھیں ۔ آپ کی صورت سے آثار صحابیت ظاہر ہوتے تھے اور یقین ہوتا تھا کہ سیدالثقلین صلوۃ اللہ وسلامہ علیہ وآلہ کی صحبت کا فیض جنہوں نے پایا ہوگا ، ان کی یہی صورت و سیرت ہوگی "۔[2]

چالیس سال تک درس وتدریس اور فتاوی نگاری میں مصروف رہنے کے باعث آپ "الصدر الحمید" کے لقب سے مشہور ہوئے جیسا کہ المسوّی میں منقول ہے ۔

"اخبرنا بکتاب المسوّی من احادیث الموطا : الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق بن محمد افضل العمری الدهلوی عن جدّه لامة قیّم الطریقة (لولی اللهیّة) الامام عبدالعزیز بن ولی الله الدهلوی عن ابیه "۔[3]

---

۱ ۔ فضل حسین ترہتی ، الحیاۃ بعد المماۃ ۔ ص ، ۳۸

۲ ۔ سرسید احمد خان ، آثار الصنادید ۔ ص ، ۸۱

۳ ۔ شاہ ولی اللہ ، المسوی من احادیث الموطا ۔ جلد ۱ ، ص ۳۰

تصانیف :
=====

شاہ محمد اسحاق آبائی خدمت کو سنبھالتے ہی علم الہی اور ترویج دین میں ہمہ تن مصروف ہوگئے ۔ آپ حدیث نبوی سے فرصت نہ پانے کے باعث نظم و نثر کی طرف توجہ نہ دے سکے ۔ اس لیے "مسائل اربعین" ، مائۃ مسائل ، اور "تذکرۃ الصیام" کے سوا کوئی کتاب آپ کی یادگار نہیں مولوی رحمان علی نے اپنی تصنیف میں آپ کی کتاب "فتاوی ہندی" [1] کا اور مولوی محمد محسن نے اپنی تصنیف میں آپ کی ایک کتاب "ترجمہ مشکوۃ شریف" [2] کا بھی ذکر کیا ہے ۔

"مسائل اربعین اور" مائۃ مسائل" مسلمانوں میں شادی وغمی کی غیر شرعی رسوں اور دیگر بدعات کی اصلاح کے لیے جامع کتب ہیں ۔ ان دونوں کتابوں کے رد میں مولوی فضل رسول بدایونی نے "تصحیح المسائل" کے نام سے ایک کتاب لکھی ۔ جس کے رد میں مولانا بشیر الدین قنوجی نے "تفہیم المسائل" تحریر کی ، پھر مولوی فیض احمد بدایونی نے "تعلیم الجاہل" کے نام سے اس کا جواب لکھا ۔

تلامذہ :
========

جناب شاہ محمد اسحاق کے خرمن فیض سے خوشہ چیں ہونے والوں کی تعداد سینکڑوں تک جا پہنچتی ہے ۔ اس کے علاوہ بہت سے اہل علم نے آپ سے علو اسناد کے لیے روایت حدیث کی اجازت بھی لی ۔ آپ کے فیض صحبت ، علم و تقوی اور اصلاح عمل سے بڑے بڑے نامور اور مشہور محدثین اور متقی پیدا ہوئے ۔ آپ نے اپنے نانا کے مدرسہ میں سالہاسال دراز تک دینی وعلمی خدمات سرانجام دینے کے علاوہ حرمین شریفین میں بے شمار لوگوں کو اپنے چشمۂ علمی سے سیراب کیا ۔ آپ کے مشہور تلامذہ کی فہرست "حیاۃ بعد المماۃ" میں درج ہے ۔

۱۔ مولوی رحمان علی ، تذکرۃ علمائے ہند ۔ ص۱۷۸

۲۔ محمد محسن ترہتی ، الیانع الجنی ۔ ص۷۷

شاہ محمد یعقوب دھلوی مہاجر مکی

شاہ محمد یعقوب دھلوی عرف چھوٹے میاں ، شاہ عبدالعزیز دھلوی کے نواسے اور شاہ محمد اسحاق مہاجر مکی کے چھوٹے بھائی اور ہم مسلک ۲۸ ذی الحج ۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۶ء میں بمقام دھلی پیدا ہوئے۔ حصول علم کا آغاز اپنے فخر روزگار نانا شاہ عبدالعزیز سے کیا اور "شرح ملّا" کے تین اسباق ان سے پڑھے۔ علاوہ ازیں "تفسیر جلالین" شاہ عبدالعزیز سے ان کی چہل قدمی کے دوران میں پڑھ کر سند حاصل کی۔ شاہ رفیع الدین سے بھی اکثر علوم میں استفادہ کیا۔ تحصیل علوم سے فراغت کے بعد اپنے جلیل القدر نانا کے مدرسہ میں ہی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور تمام امور میں اپنے بڑے بھائی الصدر الحمید مولانا شاہ محمد اسحاق کے معاون بن کر کام کرتے رہے۔

شاہ محمد اسمٰعیل نے ادائیگی حج کے لیے روانہ ہونے سے قبل "تقویۃ الایمان" کے انداز بیان کے سلسلے میں مشورہ کے لیے جن خاص خاص علماء کی مجلس طلب کی تھی ، ان میں شاہ محمد یعقوب بھی شامل تھے۔ شاہ محمد یعقوب نے شاہ محمد اسمٰعیل سے اختلاف مسلک اور طرز فکر کے باوجود بھی تحریک جہاد میں آپ سے ہر ممکن تعاون کیا تھا۔ مجاھدین کے ھندوستان سے ہجرت کرنے کے بعد دوسرے شہروں سے آئے ہوئے قافلوں کو ھدایات دے کر آگے بھیجتے ، مسلمانوں کو جہاد کے لیے آمادہ کرنے اور مجاھدین کو رقوم کے فراہم کرنے میں بھی دونوں بھائی پیش پیش تھے جو ھندوستان میں بیٹھ کر اس ذمہ داری کو بطریق احسن نبھا رہے تھے اور پھر محاذ جنگ سے سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کی طرف سے تمام خطوط ان ہی دونوں بھائیوں کے نام آتے۔
مجاھدین و مہاجرین کا ایک پورا گروہ سید محبوب علی کی قیادت میں سید احمد شہید سے بغاوت کرکے سرحد میں ھندوستان واپس آکر تحریک جہاد کے خلاف اپنی سرگرم کوششوں میں مصروف تھا۔ ان حالات میں تحریک جہاد اور مجاھدین کے قافلوں کا متاثر ہونا اور زر و اسلحہ کی فراہمی کا بند ہونا ایک فطری امر تھا چنانچہ انہوں نے ان ناگزیر حالات میں اپنی کوششوں کو جاری رکھتے ہوئے اس فتنہ کو فرو کیا اور تحریک جہاد کے لئے تمام امور کی بحالی میں کامیاب ہوگئے۔ آپ تحریک جہاد

کے دوران میں ہی ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء میں اپنے بڑے بھائی الصدر العمید مولانا شاہ محمد اسحاق کے ساتھ فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے حرمین شریفین تشریف لے گئے ۔ دو سال بعد ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء میں وطن واپس پہنچ کر آپ نے سلسلہ تعلیم و تدریس جاری رکھا ۔ بعد ازاں ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء میں آپ اپنے بھائی اور پورے خاندان کے ہمراہ دار الحرب سے سرزمین حجاز کی طرف ہجرت کر گئے ۔ وہاں بھی آپ علم حدیث و تفسیر ، فقہ واصول حدیث اور تصوف کی تعلیمات میں مصروف و منہمک رہے اور باشندگان عرب آپ سے اذکار واشغال واعمال کی اجازت حاصل کرتے رہے ۔ شاہ محمد اسحاق کی وفات کے بعد آپ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی امانت کے محافظ بنے رہے ۔ بالآخر اپنے فرائض تدریس سے سرانجام دیتے ہوئے ۲۸ ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۷ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے ۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) آپ کو حسب وصیت جنت المعلیٰ میں مولانا اسحاق دہلوی کے مزار کے قریب دفن کیا گیا ۔

فضل وکمال :
=========

شاہ محمد یعقوب اپنے زمانے کے عالم کامل ، فاضل اجل ، صادق وامین ، قانع و منتشی اور عابد وزاہد محدث وفقیہہ ومفسر تھے ۔ شاہ صاحب ہر روز رات کو ایک سپارہ دو دفعہ پڑھتے تھے ۔ اس طرح ایک ماہ میں دو دفعہ بیک وقت قرآن پاک ختم کرتے تھے ۔ استعداد ظاہری کا یہ حال تھا کہ اگر کسی آیت کے معنی بیان فرماتے تو اس قدر تفصیل اور خوبی سے کہ سامعین حیران وششدر رہ جاتے ۔ لوگوں کو ان کے خوابوں کی جو تعبیر فرماتے ہمیشہ وہی نکلتی تھی ۔ اسی بناء پر "ارواح ثلاثہ" میں خان صاحب فرماتے ہیں کہ "ایک مرتبہ مولانا نانوتوی نے فرمایا کہ مولوی محمد یعقوب صاحب دہلوی قلب کے اندر جو باریک چور ہوتے ہیں ، ان سے خوب واقف تھے" ۔[1]

سرسید احمد خان آپ کے علم و فضل کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ :

"علم و فضل میں اقران روزگار سے پایہ کم نہیں رکھتے ۔ اکثر دیکھا گیا کہ جب کوئی بطریق پیش کش وہدیہ کے کچھ دیتا ، کبھی قبول نہ کیا ۔ جو سرمایہ اپنے پاس رکھتے ہیں ، اس میں اوقات بسر

۱۔ امیر شاہ خان ، ارواح ثلاثہ ۔ ص ، ۱۲۱

کرتے ہیں ، خواہ یہ تنگی اور حسب استمداد اپنے مال کی زکوۃ نکالتے رہتے ہیں ۔ اس کم استمدادی میں توفیق ایسی امور خیر کی ایسے ہی مردان خدا کا کام ہے"۔[1]

شاہ ولی اللہ نے کئی سال پہلے اپنے احفاد کے دائرہ فیض کی خوشخبری دی تھی جیسا کہ "اتحاف النبلاء" میں نواب صدیق حسن خان فرماتے ہیں :

" آگاھی آمد این فرزندان کہ لطف الہی ایشان را بما عطا کردہ است ھمہ سعادادند نوعے از ملکیت در ایشان ظہور خواھد کرد لیکن تدبیر غیب تقاضا می کند کہ دو شخص دیگر پیدا شوند کہ در مکہ و مدینہ سالہا احیائے علوم دین نمایند ، وھمان جا وطن اختیار کنند از طرف مادر نسب ایشان بھما متکن باشد زیرا کہ آدمی زادہ بوطن مادر میلان طبع دارد ، انتقال جماعۃ کہ وطن والدہ ایشان متکن باشد بھر زمینے مستجہل است مگر بقسر قاسر"۔[2]

اس پیش گوئی کا مصداق حضرت شاہ عبدالعزیز کے دونوں نواسے حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق اور مولانا شاہ محمد یعقوب ھیں کیونکہ یہ دونوں بزرگ دھلی سے ہجرت کرکے مکہ مکرمہ میں اقامت گزین ھوگئے تھے اور وھیں پر طویل عرصے تک احیائے علوم دین میں مشغول ھوکر عرب وعجم کو مستفید فرماتے رہے۔

ان تمام صفات کے ساتھ ساتھ آپ امانت داری میں بھی یکتائے زمانہ تھے ۔ حکیم محمود احمد برکاتی لکھتے ھیں ۔ سکندر شاہ دھلوی فرماتے ھیں کہ "ایک شخص آپ کے پاس دو سو قرش مٹی امانت لایا اور کہا یہ رکھئے ، آپ نے فرمایا ، الماری میں رکھ دو ۔ اس نے نام نشان اپنا کردیا ۔ آپ نے نام لکھ کر دھر دیا ، ایک مدت کے بعد آکر اس نے طلب کیا ۔ آپ نے دیے (آپ نے کنجی دے دیا) کہا کہ کھول کر بتاتے ہے فرمایا کہ تم نے بھی تو کھول کر نہیں بتلایا تھا ، جس طرح رکھا تھا ، اسی طرح رکھا ھوا ہے ۔ وہ تکرار کرنے لگا اور کہا کہ یہ تو

١۔ سرسید احمد خان ، آثار الصنادید ۔ ص، ٨٢

٢۔ نواب صدیق حسن خان ، اتحاف النبلاء ۔ ص ، ٢٣٠ ، ٢٣١

قرض نہیں ، میں نے تو ریال رکھا تھا (رکھے تھے) آپ نے فرمایا ، جو آپ نے رکھا تھا وہی ہے ، خیال نہ رہا ہوگا ۔ خواب یاد کیجئے ۔ پھر اس نے (وہ) اسی طرح تکرار کرنے لگا ۔ آپ نے اس کو ایسا ہی آہستگی اور نرمی سے تین بار سمجھایا ۔ جب دیکھا ، وہ نہیں مانتا تو مکان سے جا کر دو سو ریال لا کر دیا (دیے) اور فرمایا کہ یہ بھی لے جاؤ ۔ خیر مجھ کو سہو ہوا ہوگا مگر کسی وجہ سے چین نہیں نہ ہوئے " ۔ [1]

ان تمام حالات کے علاوہ شاہ صاحب کی تصانیف ، اولاد اور مکمل تلامذہ کا کہیں بھی ذکر نہیں ملتا البتہ شاہ صاحب کے چند ایک تلامذہ کا ذکر " مقالات طریقت " میں اس طرح ہے کہ " آپ سے علوم دینیہ اور فیض باطن حاصل کرنے والوں میں سے نواب صدیق حسن خان ، مولانا مظفر حسین کاندھلوی ، مولوی عبدالعزیز جعفری ، ملا عبدالقیوم بڈھانوی ، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ، مولانا محمد قاسم نانوتوی ، مولانا محمد زمان ، شیخ محمد محدث ، حاجی منیر خان رئیس خان پور ، سکندر شاہ ، عبدالرحیم نگینہ ساز ، نعمت خلی [2] (خادم خاص) اس کے علاوہ " تراجم علمائے حدیث ہند " میں حکیم عبدالمجید خان رام پوری [3] کا ذکر بھی آپ کے شاگردوں کے ضمن میں کیا گیا ہے ۔

شاہ اسمعیل شہید کے حالات زندگی

حضرت مولانا شاہ اسمعیل شہید بن شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی اللہ کا شمار آشوب دین فقہائے مستقلین اور بلند پایہ محدثین میں ہوتا ہے ۔ آپ اپنے عظیم المرتبت حقیقی دادا حضرت

---

۱ ۔ محمود احمد برکاتی ، شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان ۔ ص ، ۱۷۵

۲ ۔ عبدالرحیم ضیاء ، مقالات طریقت ۔ ص ، ۲۲۲

۳ ۔ امام یحیی نوشہروی ، تراجم علمائے حدیث ہند ۔ ۔ ص ، ۱۲۱

شاہ ولی اللہ محدث دھلوی اور جلیل القدر بڑے دادا حضرت عمر فاروق رحمۃ اللہ علیہ کی صفات سے متصف تھے ۔ شاہ ولی اللہ نے ھندوستان میں خدائے بزرگ و برتر کی توحید کو پھیلانے اور شرک و بدعت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا جوکام شروع کیا تھا یعنی جن اصلاحات کے آپ بانی ، جانشین ، مفسر اور داشر تھے ، ان سے اسلحہ و میدان کا کام لینے والی مولانا شاہ اسمٰعیل شہید کی بلند پایہ ذات گرامی تھی ۔

نام ۔ پیدائش ۔ تعلیم :

اسمٰعیل نام ، شاہ صاحب لقب ، شہید خطاب اور قاطع بدعت کنیت تھی ۔ مولانا شاہ اسمٰعیل شہید دھلی کے نواحی علاقے پھلت میں ۱۲ ربیع الثانی ۱۱۹۳ھ / ۱۲ اپریل ۱۷۷۹ء میں پیدا ھوئے ۔ مولانا حافظ محمد ابراھیم میر سیالکوٹی نے تاریخ اھل حدیث میں آپ کا سن پیدائش ۱۲۰۳ھ لکھا ھے لیکن بیشتر متعدد کتب[۲] کے مطابق آپ کا سن پیدائش ۱۱۹۳ھ ھے اور یہی صحیح ھے ۔

آپ کے والد بزرگوار شاہ عبدالغنی نے آپ کو چھ سال کی عمر میں ایک بزرگ معلم کے پاس قرآن مجید پڑھنے کے لیے بٹھا دیا تھا ۔ آٹھ سال کی عمر میں آپ نے قرآن مجید حفظ کرلیا ۔ دو تین برس بعد آپ نے صرف ونحو اور فقہ و معقول کی تمام کتابیں اپنے والد گرامی سے پڑھ لیں ۔ شہرہ آفاق محدث شاہ عبدالغنی کی وفات کے بعد آپ کے چچا شاہ عبدالقادر نے علم وفضل کے اس آفتاب کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا ۔ علم صرف ونحو اور فقہ ومعقول کی تحصیل کے بعد آپ نے اپنے تایا شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی سے حدیث پڑھنی شروع کی ۔ علم حدیث پر دسترس حاصل کرنے کے بعد آپ نے فقہ کی تعلیم مکمل کی ۔ ھندوستان میں صرف شاہ ولی اللہ کے اس منفرد ، ممتاز اور جلیل القدر خاندان میں قرآن وحدیث ، تفسیر وفقہ کے ساتھ ساتھ علم ریاضی ، جغرافیہ اور تاریخ کی

---

۱ ۔ آپ کا سلسلہ نسب خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رحمۃ اللہ پر منتہی ھوتا ھے ۔ اس لیے آپ شاہ اسمعیل کے بڑے دادا کہلاتے ھیں ۔

۲ ۔ حیات ولی ، تراجم علمائے حدیث ھند ۔ تاریخ ادبیات عربی وغیرہ ۔

تحصیل بھی لازمی تھی چنانچہ شمس الہند شاہ عبدالعزیز کی شاگردی میں مولانا اسمٰعیل شہید نے ایک ماہ میں اقلیدس کے چار مقالے ازبر کرلئے تھے، حتّیٰ کہ کھیل کے اوقات میں بھی زمین پر اقلیدس کی اشکال بنا کر انہیں حل کرتے رہتے تھے۔ شاہ صاحب نے حساب کے مزید قواعد پورے پندرہ دن میں یاد کرلیے تھے۔ اس طرح دو ڈھائی ماہ میں ریاضی کی تمام شاخوں پر عبور حاصل ہوگیا۔ بعدازاں آپ نے تاریخ اور جغرافیے میں غیر معمولی شغف رکھنے کے باعث بہت جلد مہارت حاصل کرلی۔ مختصر یہ کہ سولہ سال کی عمر میں شاہ اسمٰعیل صاحب نے قرآن، حدیث، تفسیر منطق، کلام، فقہ، ریاضی، تاریخ اور جغرافیہ کے علوم پر حاوی ہوگئے۔ چنانچہ آپ اپنی ظاہری و باطنی تربیت، علمی و عملی کمالات اور خاندانی فضائل کی تحصیل کے لیے اپنے بڑے تایا شاہ عبدالعزیز اور چھوٹے تایا شاہ رفیع الدین کی خدمت میں بھی زانوئے ادب طے کرکے علم و فضل کے بہت بلند مقام پر پہنچ گئے۔ شاہ عبدالعزیز کے علاوہ آپ نے اس عہد کے فاضل جلیل مولانا عبدالحئی سے بھی تعلیم حاصل کی۔

ذہانت و ذکاوت:-

============

ذہانت و ذکاوت عطیہ خداوندی ہیں اور فطرت اس عطیے سے بعض بعض نفوس کو نوازتی ہے۔ شاہ اسمٰعیل کو بھی ذہانت و حافظہ کا یہ عطیہ بخشا گیا۔ شاہ صاحب فطرتاً نہایت ذکی الطبع تھے۔ شاہ عبدالعزیز کے چہیتے بھتیجے شاہ اسمٰعیل کا لڑکپن میں ذہانت اور مطالعے میں دلچسپی اور شغف، ان کے روشن مستقبل کی غمازی کرتا تھا۔ آپ کے طالب علمی کے زمانے کی ذہانت و فطانت کے قصّے زبان زد خاص و عام ہیں۔ مشکل سے مشکل امور و علوم کو نہایت جلد سمجھ کر بات کی تہ تک پہنچ جاتے۔ حیات طیبہ میں آپ کی ذہانت و ذکاوت کا ایک واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ "شاہ اسمٰعیل صاحب آٹھ آٹھ دس دس صفحے صاف پڑھ جایا کرتے لیکن کبھی کسی مقام پر نہ رکتے تھے، نہ کوئی بات دریافت کرتے تھے، نہ آپ مطالعہ کرتے تھے، نہ گھر میں جا کر سبق یاد کرتے تھے۔ اکثر اس طرح ہوتا تھا کہ جب آپ دوسرے دن

سبق پڑھنے کے لیے کتاب کھولتے تھے تو یہ بھول جایا کرتے کہ کل سبق کہاں تک پڑھا تھا۔ ایک سن رسیدہ شخص عبدالکریم بخاری آپ کا ہم سبق تھا۔ وہ شاہ صاحب کے لگاتار بغیر پوچھے گچھے پڑھنے سے بہت جلتا تھا اور بہت سے مقامات بغیر سمجھے رہ جاتے تھے۔ ایک دن شاہ صاحب ورق گردانی کرنے لگے اور انہیں اپنے کل کے سبق کا پتہ نہ چلا، اس پر بخاری ہنس کر کہنے لگا، میاں صاحبزادے مکھی مار کے رکھ لیا کرو تاکہ کتاب کھولتے ہی تمہیں معلوم ہو جائے کہ میں نے کل یہاں تک سبق پڑھا تھا۔ یہ سن کر شاہ اسمٰعیل صاحب ہنسے اور کچھ جواب نہ دیا۔ جتنے طلباء شاہ صاحب کے ساتھ پڑھتے تھے خوش ایک بھی نہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ہر طالب علم صدرہ کے ہر ہر مقام پر بحث کرنا اور اسے سمجھنا چاہتا تھا اور آپ سوائے رواں عبارت پڑھنے کے نہ کہیں رکتے تھے اور نہ کسی مشکل مقام کو دریافت کرتے تھے۔ جب آپ ایک روز صدرہ کے مشکل مقام کو پڑھ رہے تھے تو بخاری کو یقین تھا کہ یہاں یہ لڑکا ضرور ٹھہرے گا اور اس مقام پر ضرور رد و قدح ہوگی لیکن جب اس نے دیکھا کہ صاحبزادے صاحب کی یہاں بھی وہی کیفیت ہوئی جو اور مقامات میں ہوئی تھی تو وہ جھنجھلا گیا، اس نے جل کر یہ سوال کیا "صاحبزادہ تم کچھ سمجھے بھی یا یونہی گھاس کاٹتے چلے جاتے ہو" شاہ صاحب نے نہایت حلیمی اور انکساری سے جواب دیا، آپ کی سمجھ میں اگر کوئی بات نہ آئی ہو تو آپ دریافت فرما لیں۔ اس نے فوراً یہ سوال کیا کہ اسی مقام کو سمجھا دیجئے جس کو بلا دریافت کیے آگے پڑھ گئے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب اور کل طلباء کی نظریں آپ کی طرف گڑ رہی تھیں اور ہر متنفس یہ دیکھتا تھا کہ دیکھیں اسمٰعیل بغیر استاد کے سمجھے اس مشکل مقام کو کیونکر حل کرتا ہے گویا یہی دن آپ کی علمی قابلیت کے امتحان کا تھا۔ اس ہوشیار بچہ نے اس عمدگی اور صفائی سے اس مقام کو چٹکیوں میں سلجھا دیا اور وہ وہ معنی بتائے کہ سب دنگ رہ گئے، پھر صدرہ کے حاشیہ پر اعتراض کیا اور کہا کہ اس نے جو کچھ معنے لکھے ہیں، وہ غلط ہیں"۔[1]

گویا شاہ اسمٰعیل شہید ذکاوت طبع، جودت خاطر اور علمی تبحّر کے باعث فرید عصر

۱- مرزا حیرت دہلوی، حیات طیبہ - ص ۲۷، ۲۸

شمار ہوتے تھے ۔ صاحب اتحاف النبلاء نواب صدیق حسن خان ، شاہ اسمٰعیل صاحب کی علمی قابلیت اور زہادت کے بارے میں رقمطراز ہیں ۔

" درعلوم معقول ومنقول یاد پشینیان از خاطر می برد ودر علم فروع واصول آئمہ آنرا دور تر می نشاند ----- اصول فقہ برنوک زبان داشت وعلم حساب درانگشتان قرآن وحدیث خود محفوظ سینہ او بود وفقہ ومعقول مشق دیرینہ " ۔[1]

اگرچہ دوسرے علماء کی طرح آپ تدریس وتعلیم میں مشغول نہ ہوئے اور نہ ہی ان کو حاصل کرنے کے لیے عمر عزیز کا کوئی حصّہ گزارا ، اسکے باوجود اپنی خدا داد ذکاوت اور طبع نقاد کسی عمدگی کی وجہ سے ہر امتحان کے موقع پر ممتحنین اور اکابر وعلماء پر سبقت لے جاتے تھے ۔ شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی کی شاگردی کے دوران کا ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو ۔

" مولوی کرامت علی صاحب حیدرآبادی فرمایا کرتے تھے ۔ میں مولانا شہید کا حدیث میں ہم سبق تھا ۔ مجھے خوب معلوم ہے ، انہوں نے کبھی مطالعہ نہیں کیا ۔ نہ پڑھے ہوئے کو کبھی پھیرا ، عام طلبہ جو آپ کے ساتھی تھے ، مولانا شہید کو بے پروا کہتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ پڑھنے کی طرف مولانا کی توجّہ نہیں ہے ۔ شب و روز تیراندازی ، گولی چلانا اور گھوڑے پر چڑھنے کے سوا وہ کبھی کتاب کو کھول کر بھی نہیں دیکھتے ۔ روز مرّہ اس قسم کی باتیں سن سن کے شاہ عبدالعزیز صاحب نے طلبہ کے مجمع میں مولانا شہید سے یہ شکایت کی کہ تم کھیل کود میں زیادہ وقت صرف کرتے ہو لیکن مطالعہ کتب نہیں کرتے ، شاہ صاحب نے عرض کیا ، آپ مجھ سے پڑھا ہوا کچھ دریافت فرمائیں ۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے طلبہ کے سامنے مولانا شہید سے دریافت کیا ، آپ نے فرفر بتا دیا اور اس عمدگی سے بیان کیا کہ طلبہ کا کل مجمع دنگ رہ گیا " ۔[2]

---

۱ ۔ نواب صدیق حسن خان ، اتحاف النبلاء ۔ ص ، ۲۱۷

۲ ۔ مرزا حیرت دھلوی ، حیات طیبہ ۔ ص ، ۲۸ ، ۲۹

اہل زمانہ کے حسد اور مبتدعین کی عداوت کا باعث بھی آپ کی ذہانت و ذکاوت اور شرع مبین کے آداب میں کمال ودین داری تھی ۔ کبھی آپ پر مذہب حنفی کے ترک کرنے کی تہمت لگائی جاتی ، کبھی وہابیت کا الزام لگایا جاتا اور کبھی معتزلہ اور خارجی فرقے سے منسوب کر دیا گیا ۔ اس دروغ بیانی سے ان دنیا طلب لوگوں کا مقصد صرف معبود حقیقی کی خالص عبادت سے لوگوں کو ہٹا کر بدعت کی طرف مائل کرنا تھا ۔

سرسید احمد خاں نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "آثار الصنادید" میں شاہ اسمٰعیل کے غیر معمولی علم وفضل اور ان کی بے مثال قابلیت کا اعتراف کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں :

"آپ کی ذہانت کی دھوم دھام شہر میں تھی ۔ اکثر فضلائے کمل کہ دعوی کتاب دانی و دقیقہ شناسی کا رکھتے تھے ۔ وہ مقامات باریک کہ جن کے صاف کرنے میں روزگار دراز فکر کرنا چاہیے ، آپ سے سرراہ ملاقی ہوکر باعتبار ظاہر کے بطور مناظرہ کے اس کا استفسار کرتے" ۔[1]

مولانا اسمٰعیل کی خدا داد ذہانت ، اعلیٰ درجے کے حافظے اور جلیل القدر اساتذہ شاہ عبدالعزیز اور مولانا عبدالحئی کی توجّہ نے ان میں غیر معمولی قابلیت پیدا کر دی تھی چنانچہ بعض تذکرہ نویسوں کا بیان ہے کہ "ایک روز مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کسی بڑے اہم مسئلے کا فتوی لکھ کر اور اس کو اپنی نشست گاہ میں چھوڑ کر اندر مکان میں تشریف لے گئے ۔ اس عرصے میں مولانا محمد اسمٰعیل صاحب بھی تشریف لے آئے اور اس فتوے کو ملاحظہ کرکے بعض فروگزاشتوں کی اپنے قلم سے تصحیح کرکے فتوے کو وہیں رکھ کر چلے گئے ۔ جب شاہ صاحب واپس تشریف لائے اور ان ترمیموں کو دیکھا تو نہایت خوش ہوئے اور فرمایا کہ "اللّٰہ تعالی کا شکر ہے کہ علم ابھی ہمارے خاندان میں باقی ہے" ۔[2]

---

۱ ۔ سرسید احمد خاں ، آثار الصنادید ۔ ص، ۹۹

۲ ۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری ، تواریخ عجیبہ ۔ ص، ۱۲۳ ۔

شاہ صاحب کے والد گرامی شاہ عبدالغنی محدث دھلوی دینیات کے فاضل استاد تھے - اور ان کی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز دلّی کی جامع مسجد تھی - شاہ اسمٰعیل کے بارے میں شاہ عبدالعزیز کے ایک شاگرد رشید الدین خان صاحب کا یہ خیال تھا کہ آپ دینیات میں تو مہارت تامہ رکھتے ہیں لیکن علم منطق میں کچھ زیادہ دستگاہ نہیں رکھتے - اچانک ایک روز شاہ اسمٰعیل کی طبیعت بوجھل ہوئی اور بخار نے آلیا - مولانا رشید الدین خان صاحب عیادت کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ آج بخار سے دماغ پریشان تھا - اس پریشانی اور انتشار کی حالت میں فلسفہ کے کچھ مسائل کی طرف ذہن منتقل ہوگیا ہے اور ان مسائل پر میرے [illegible] فلاں فلاں اعتراضات پیدا ہوئے - مولانا رشید الدین خان بالکل خاموش رہے - جب [illegible] کے تلامذہ نے، جو شاہ صاحب کی عیادت کے لیے ساتھ گئے ہوئے تھے [illegible] کہ مولانا اسمٰعیل معقولات کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے [illegible]

"بے شک میں نے یہ کہا تھا [illegible] ارسطو اور افلاطون بھی قبر سے نکل [illegible] اعتراضات کا کوئی جواب نہیں دے سکتے"۔[1]

شاہ صاحب کی غیر معمولی قابلیت کی دھوم پورے ہندوستان میں مچی [illegible] - اگر آپ کسی دور دراز مقام پر تشریف لے جاتے تو اس مقام پر آپ کے پہنچنے سے پہلے ہی آپ سے ملاقات کے خواہش مند لوگوں کا جم غفیر لگ جاتا - چنانچہ زمانہ جہاد کا واقعہ ہے کہ دوران سفر میں آپ ایک سرائے میں ٹھہرے ہوئے تھے - اس بستی کے بہت عالم فاضل آپ کی تشریف آوری کی خبر سن کر آپ کی زیارت کے لئے سرائے میں حاضر ہوئے - وہاں پہنچ کر ان لوگوں نے بجائے مولانا کے ایک سپاہی کو دیکھا کہ گلے میں تلوار لٹکائے ہوئے اپنے گھوڑے کی خدمت کررہا ہے - انہوں نے اس سپاہی سے پوچھا کہ میاں سپاہی مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کہاں ہیں - سپاہی نے جواب دیا کہ ان سے آپ کو کیا کام ہے ؟ انہوں

۱- امیر شاہ خان ، ارواح ثلاثہ - ص ۹۰

نے کہا کہ زیارت سے مشرف ہوکر کچھ مسائل کی تحقیق کریں گے - آپ نے فرمایا کہ کیا مسائل ہیں - انہوں نے بڑے بڑے ادق مسائل جو سوچ کر لائے تھے ، بیان کیے- آپ نے گھوڑے پر کھڑے کھڑے ان کے ایسے جواب باصواب دیے کہ جو کسی مولوی سے مہینوں میں بھی نہ بن آتے - تب وہ لوگ سمجھ گئے کہ غالباً یہی شخص مولانا محمد اسمٰعیل ہے - انہوں نے بڑے ادب سے عرض کیا کہ حضرت آپ کے ساتھ کچھ کتابیں نہیں ہیں - آپ نے فرمایا کہ "کتاب اللہ میرے سینے میں ہے - اول اس سے سمجھاتا ہوں ، جب کوئی اس سے نہیں مانتا تو یہ تلوار جو میرے گلے میں پڑی ہے ، اس کا علاج ہے - ان دونوں کے ہوتے ہوئے اور کتابوں کی کیا ضرورت ہے"۔[1]

سپاہیانہ ورزشیں :

شاہ اسمٰعیل علوم دینیہ سے فراغت ذہنیہ کر جلا دینے کے ساتھ ساتھ جسمانی تربیت کی طرف بھی متوجہ ہوئے - شاہ صاحب کا جس عہد میں ظہور ہوا تھا - اس دور کے سیاسی ، معاشی و معاشرتی اور اخلاقی و تہذیبی بی حالات کا پہلے باب میں ذکر کر دیا گیا ہے - اس جلیل القدر خاندان نے شیخ محمود ، شیخ منصور ، شیخ معظم اور شیخ وجیہ الدین جیسے ممتاز افراد اور بہادر جرنیل پیدا کیے گویا سپہ گری شاہ اسمٰعیل کا آبائی ورثہ تھا - فنون سپہ گری کے لیے جسمانی ورزشیں نہایت اہمیت رکھتی ہیں اور انہی ورزشوں کے لیے آپ نے چٹلی قبر کے پاس ایک اکھاڑے میں جانا شروع کر دیا - رفتہ رفتہ انہوں نے فن شہ زوری میں کمال حاصل کر لیا - شہ زوری کے ساتھ ساتھ شہ سواری کا فن دہلی کے مشہور چابک سوار میاں رحیم بخش سے اور بنوٹ اور بندوق زنی دہلی کے نامور پٹہ باز اور بنوٹ کے ماہر استاد سے سیکھا - فنون جنگ میں کمال حاصل کرنے کے بعد شاہ صاحب نے تیراکی میں بھی مکمل مہارت حاصل کر لی - تیراکی میں اس قدر کمال حاصل کر لیا تھا کہ دریائے جمنا کی راہ سے تیرتے ہوئے کئی دفعہ دہلی سے آگرہ اور آگرہ سے دہلی آئے - پانی میں بکثرت رہنے کے باعث دلّی والوں میں آپ "جل مانس"

۱- مولانا محمد جعفر تھانیسری ، تواریخ عجیبہ - ص ، ۱۲۷

کے لقب سے مشہور ہوگئے تھے - تیراکی کے بعد آپ نے جسمانی ریاضتوں کا سلسلہ شروع کیا - کئی کئی دن بھوکا پیاسا رہنا ، تپتی ہوئی زمین پر گھٹنوں چلنا ، کئی کئی رات مسلسل جاگنا ، میلوں کا پیادہ دوڑنا اور شدید سردی کے موسم میں راتوں کو ننگے سر گرم لباس کے گھنٹوں ٹہلتے رہنا ، یہ چند ایسی مشقتیں تھیں ، جس سے شاہ صاحب کی حیرت انگیز پوشیدہ صلاحیتیں ظاہر ہوتی ہیں - لشکر کفار کے مقابلہ میں بذات خود ہی نہیں بلکہ فوجوں کو ترتیب دے کر لڑانے میں بھی ماہر تھے - آپ صرف سپاہی ہی نہ تھے بلکہ قابل جرنیل بھی تھے - ہندوستان کے اس اخلاقی و مذہبی انحطاط کے دور میں سید احمد شہید دہلی تشریف لائے - سیّد صاحب شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگرد اور مرید تھے - آپ نے دہلی میں اپنی تعلیم کے دوران میں شاہ اسمعیل سے عربی کی ایک کتاب بھی پڑھی تھی - اگرچہ شاہ اسمعیل طبعاً پیری مریدی میں دلچسپی نہیں لیتے تھے اور اہل باطن کی طرف ملتفت نہ ہوتے تھے لیکن جب آپ نے مولانا عبدالحئی جیسے جیّد عالم کو سید صاحب کا معتقد ہوتے دیکھا تو آپ بھی ان کے ہاتھ پر بیعت کرکے ان کے خدام میں شامل ہوگئے -

شاہ اسمعیل شہید کا پہلا وعظ اور عوام الناس کی مخالفت :

مولانا شاہ اسمعیل فنون سپہ گری اور علوم وفنون میں دسترس حاصل کرنے کے بعد اب اپنی جسمانی شان وشوکت اور جلالت علمی کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے بے نقاب ہوئے - آپ نے جامع مسجد دہلی میں جمعة الوداع کی نماز کے بعد ہر طبقہ اور درجہ کے لوگوں کے درمیان بڑی بہادری اور دلیری سے وحدت پرستی پر زور دیتے ہوئے اور شرک وبدعت سے نفرت دلاتے ہوئے پہلا دل پذیر اور پرتاثیر وعظ کیا - اس وعظ کا آغاز آیات قرآن پاک اور احادیث نبی سے کرتے ہوئے بنی نوع انسان کو بداعمالیوں ، لغویتوں ، بداعتقادیوں اور بیہودگیوں سے دور رہنے کی تلقین واشگاف الفاظ میں کی ، جو مسلم معاشرے کا ایک جزولاینفک بن چکی تھیں - اس پرجوش وعظ میں ، اپنے اتباع وانصار کے ساتھ صف بستہ مولوی فضل حق خیرآبادی ، صوفی

درویش، رئیس، علماء اور طلباء میں سے کسی کو بھی آپ کی تقریر پر ذرّہ بھر بھی اعتراض کرنے کی جراءت نہ ہوتی۔ اس پر کشش اور خوش لہجہ وعظ کو سننے کے بعد آپ کے موافق ومخالف آپ کی حقیقی جلالت وعظمت کا لوہا مان گئے۔ اب شاہ صاحب نے مسجدوں، مجلسوں، عرسوں، گلی کوچوں، شاہراہوں اور مسترشدین کے گھروں میں باقاعدہ وعظ گوئی کا سلسلہ شروع کیا۔ مولانا صاحب جیسے جیّد عالم نے اب یہ معمول بنا لیا تھا کہ جمعہ اور سہ شنبہ کو جامع مسجد دھلی میں مجلس وعظ منعقد کرتے اور لوگوں کو کج روی سے باز رہنے اور توحید وتقوی کے سیدھے راستے پر گامزن ہونے کی نصیحت کرتے۔ فصاحت وبلاغت اور تاثیر بیان کا یہ عالم تھا کہ بڑے حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز فرمایا کرتے۔

"میری تقریر تو اسمٰعیل نے لے لی، تحریر رشید الدین نے اور تقوی اسحاق نے"۔[1]

دنیاوی فلاکت وزوال کے زمانے میں رنگے ہوئے صوفی اور بنے ہوئے درویش، ضعیف الاعتقاد مخلوق کو باطنی قوت کے عجیب عجیب کرشمے دکھاتے اور خوارق وکرامات کے قصّے سناتے اور مسلمانوں کی رگ وپے میں سرایت ہوکر انہیں دین ودنیا سے غافل کر دیتے۔ شاہ صاحب نے مسلمانوں کو انہی بداعتقاد بہروپیوں سے دور رہنے کی نصیحت کی، جس پر یہ نام نہاد علماء، صوفیاء اور فقراء نے نہ صرف آپ کی اہانت کی بلکہ آپ کے خون کے پیاسے ہوگئے کہ "ایک روز ایک جلسہ وعظ میں ایک رو سیاہ بدعتی نے مولانا صاحب کو چھری سے شہید کرنا چاہا تھا مگر خیر گزری کہ وہ وار کرنے نہ پایا اور پکڑا گیا"۔[2]

ان ھی حالات میں شاہ عبدالعزیز کے شیعہ وسنّی معتقدین آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر درخواست گزار ہوئے کہ آپ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو اس قسم کے وعظ کرنے سے منع کریں مگر آپ نے سب کو ایک ھی جواب دیا "جب تک اسمٰعیل سے خلاف شریعت امر سرزد نہ ھو میں کیونکر اسے روک سکتا ھوں، وہ کوئی فساد انگیز تقریر نہیں کرتا کہ اس پر میں معترض ھوں۔ آخر کوئی معقول

۱۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری، تواریخ عجیبہ۔ ص، ۱۲۲
۲۔ ایضاً۔ ص، ۱۲۲

وجہ بھی تو ہونی چاہیئے ، جس سے میں اس کی کارروائی میں دست اندازی کر سکوں "۔[1]

اعیان شہر اور علمائے سو نے اپنی شورش پسند تحریک کو جاری رکھا۔ انہوں نے ڈیڑھ ہزار اہل شہر کے دستخط کروا کر دہلی کے انگریز ریذیڈنٹ کے نام پر ایک درخواست دے دی ، جس میں شاہ صاحب کی تقریروں سے فساد کا اندیشہ ظاہر کیا گیا۔ ان ہی دشمن شاہ صاحب کے مخالفین میں سے ایک جیّد عالم مولانا فضل الحق خیرآبادی ریذیڈنسی میں سررشتہ دار کے منصب پر فائز تھے۔ انہوں نے انگریز ریذیڈنٹ پر یہ اثر ڈالا کہ اگر شاہ اسمٰعیل کا وعظ بند نہ کیا گیا تو شہر میں خون خرابہ ہوگا۔ ریذیڈنٹ درخواست کو بار بار دیکھتا اور کہتا تھا کہ " تعجب ہے شاہ عبدالعزیز کا بھتیجا ایسا فسادی ہو" لیکن مولانا فضل حق کے اصرار پر ریذیڈنٹ کے حکم سے شاہ صاحب کو جامع مسجد میں وعظ کہنے سے روک دیا گیا "۔[2] چنانچہ چالیس[٤٠] دن تک شاہ صاحب کا وعظ بند رکھا گیا۔ بالآخر شاہ صاحب نے ریذیڈنٹ کے نام اسی[٨٠] معقول وجوہات پر مبنی ایک درخواست پیش کر کے دوبارہ وعظ کا تحریری اجازت نامہ حاصل کر لیا۔ آپ کے مسلسل اور پر اثر وعظ سے کامیابیاں متواتر آپ کے قدم چومتی رہیں۔ آپ نے صریح خلاف شرع امور میں اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ بی بی کی صحنک[3] کے لیے شہزادی (اکبر شاہ ثانی کی بہن) کو اور دو دفعہ کسبیوں کے مجمع میں بھی پرتاثیر اور حکیمانہ وعظ کیا۔ پہلی بار تیس رنڈیوں میں سے انتیس نے توبہ کر کے نکاح کر لیے اور دوسری مرتبہ ایک بہت بڑے گروہ کی کل طوائفوں نے ناپاک زندگی کو خیرآباد کہہ دیا ، جن

١- مرزا حیرت دہلوی ، حیات طیبہ - ص ٩٢،

٢- مولانا محمد جعفر تھانیسری ، تواریخ عجیبہ - ص ١٢٢،

٣- بی بی کی صحنک کی تقریب سیدۃ النساء حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا سے منسوب تھی - یہ تقریب خالص عورتوں کی تھی - اس میں میدے کی ٹکیاں گھی میں تلی جاتی تھیں اور کونڈوں میں بھر کر ایک پاک صاف جگہ پر رکھ دی جاتی تھیں - یہ ٹکیاں صرف عورتیں ہی کھا سکتی تھیں - مردوں کا کھانا یا ان کے قریب جانا بھی گناہ عظیم سمجھا جاتا تھا چونکہ اس تقریب کا اسلامی تعلیمات میں کوئی جواز نہ تھا ، اس لیے شاہ صاحب نے اسے بدعت قرار دیا -

میں سے جوان عورتیں نے تو نکاح کرلیے لیکن سن رسیدہ نے محنت و مشقت سے گذر اوقات کرنا پسند کیا - پھر تبرکات کی تعظیم ، ستیلا کی پرستش ، تعزیہ داری اور ماتم کرنا ، قبر پر چلّے باندھنا اور عورتوں کا مرید کرنا اور مرید ہونا ، چند ایسی بدعتیں اور مشرکانہ رسوم تھیں ، جن سے شاہ صاحب نے معاشرہ کی تطہیر کی -

دلّی میں توحید کی تبلیغ کے سلسلے کے دوران میں ہی پنجاب سے مسلمانوں پر سکھّوں کے ظلم و ستم کی خبریں آنا شروع ہوئیں ، جس پر شاہ عبدالعزیز نے تو ہندوستان کے متعلق دارالحرب کا فتوی دیا لیکن اس دارالحرب کو دارالاسلام بنانے کی کوشش کرنے والے حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ محمد اسمٰعیل تھے - اس سلسلے میں جو تحریک چلی - اس کا ذکر تحریک کے باب کے تحت ہوگا -

شاہ صاحب پنجاب اور لکھنؤ کے تبلیغی دورے کرنے کے بعد حج بیت اللّٰہ کے ارادے سے شوال ۱۲۳۶ھ / ۲۰ جولائی ۱۸۲۱ء کو سید احمد اور عازمین حج کے ساتھ رائے بریلی سے کلکتہ روانہ ہوئے - ربیع الثانی ۱۲۳۷ھ میں کلکتہ سے حرمین شریفین کا رخ کیا - ۸ ذی الحج کو سید صاحب اور اہل قافلہ کے ہمراہ مناسک حج ادا کرنے کے بعد مدینہ منورہ کی زیارت سے شرف یاب ہوکر آٹھ ماہ تک مکہ معظمہ میں قیام پذیر رہے ، پھر شوال ۱۲۳۸ھ کے نصف میں وطن کے لیے روانہ ہوگئے -

شاہ صاحب کی شخصیت اور ان کی عظمت کا اعتراف :

شاہ صاحب ایک جید عالم ، دینی مفکر ، قاطع بدعت ، بلند پایہ مبلغ اور ایک عظیم مجتہد تھے - اپنی غیر معمولی علمی وسعت ، ذہانت و فراست ، دین سے انتہائی عشق ، تقوی و پرہیزگاری اسلام کے لیے حیرت انگیز شجاعت ، اخلاقی بلندی اور مجتہدانہ بصیرت کے باعث غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے - صاحب تذکرہ علمائے ہند ان کی علمی بلندی کے بارے میں رقمطراز ہیں :

" ابن مولوی عبدالغنی بن مولانا شاہ ولی اللّٰہ در ذہانت و رسائی فکر یگانہ روزگار و مشارالیہ علمای کبار بود " -[1]

۱- مولوی رحمان علی ، تذکرہ علمائے ہند - ص ، ۱۷۹

مولوی فضل حق خیرآبادی اختلاف مسلک کے باوجود بھی مولانا شاہ اسمٰعیل کے خلوص اور بلندی اخلاق کے قائل تھے۔ "مولوی فضل عبدالرشید صاحب غازی پوری رام پور میں مولوی فضل حق سے پڑھتے تھے۔ یہ (عبدالرشید) ایک مرتبہ کہیں جا رہے تھے۔ اتفاق سے ان کے ایک دوست مل گئے۔ ان دوست نے ان سے کہا کہ چلو مولوی فضل حق صاحب کے یہاں چلیں، تم ان (مولانا اسمٰعیل صاحب) کے معتقد ہو۔ آج تمہیں تمہارے استاد سے ان پر تبّرے سنوائیں گے۔ انہوں نے کہا، چلو۔ یہ دونوں وہاں جا کر بیٹھے تو مولوی عبدالرشید صاحب نے کہا کہ حضرت یہ مجھے یہ کہہ کر لائے ہیں کہ مولوی صاحب سے تمہیں مولوی اسمٰعیل پر تبّرے سنواؤں گا۔ مولوی فضل حق صاحب نے کہا "اچھا اس غرض سے لائے ہیں، یہ کہہ کران پر بہت ناخوش ہوئے اور فرمایا میں اور مولوی اسمٰعیل پر تبّرا کروں یہ نہیں ہو سکتا اور یہ کہہ کران کو اپنی مجلس سے اٹھوا دیا اور فرمایا کہ میرے یہاں کبھی نہ آنا"۔[1]

شاہ عبدالغنی کو اللّٰہ تعالیٰ نے شاہ محمد اسمٰعیل جیسا فرزند ارجمند اور علم و عمل کا ایک ایسا روشن چراغ عطا فرمایا تھا کہ جن کو لوگ متعصّب وہابی کہتے اور ان کی شان میں بہت بڑی بڑی گستاخیاں کرتے تھے لیکن نواب صدیق حسن خان ان کی عظیم شخصیت کا ان الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں:

> "ہر یکے از ایشان بے نظیر وقت و فرید دھر و حید عصر در علم و عمل، عقل و فہم و قوت تقریر و فصاحت تحریر و تقوی و دیانت و امانت و مراتب ولایت بود و ہم چنیں اولاد اولاد ــــــ این سلسلہ از طلائے ناب است"۔[2]

شاہ محمد اسمٰعیل کے بعد ہندوستان میں ان کے پایہ کا کوئی شخص پیدا نہیں ہوا۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کہا کرتے تھے۔۔۔

۱۔ اشرف علی تھانوی، امیر الروایات ـ ص، ۱۶۲

۲۔ نواب صدیق حسن خان، اتحاف النبلاء ـ ص، ۳۲۰

"ھندوستان نے ایک مولوی پیدا کیا اور وہ مولوی شاہ محمد اسمٰعیل کی ذات تھی"۔[1]

شاہ صاحب کی عظیم المرتبت شخصیت وسیع ادبی قابلیتوں کی مالک تھی ۔ آپ اعلیٰ درجہ کے فقیہہ اچھے مقرر، سادہ عادات کے ساتھ خدا داد صلاحیتوں کے مالک تھے ۔ علم وعمل میں وقائع عبدالقادر خانی نے مولوی عبدالقادر رام پوری کا ایک قول نقل کیا ہے کہ :

"دادا اور چچاؤں کی یادگار مولوی محمد اسمٰعیل میں جو ذہن کی جودت اور قوت توجہہ میں بے مثل ہیں ۔ خدا ان کا نگہبان رہے"۔[2]

جب شاہ صاحب ، سید احمد شہید کے مقصد اعلیٰ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی خاطر لکھنؤ کے لوگوں کو وعظ ونصیحت کرنے کے لیے وہاں پہنچے تو وہاں کے علماء کے کانوں میں ایسی صدائیں پڑنے لگیں ، جس کو سننے کے وہ لوگ عادی نہ تھے تو ایک بزرگ مولوی خیرالدین صاحب نے جناب شاہ عبدالعزیز صاحب کے حضور ایک فتویٰ بھیجا جس کے آخر میں اصلی مقصد بھی تحریر کیا کہ مولانا اسمٰعیل وغیرہ جس سفر پر نکلے ہیں ، کیا انہوں نے یہ سفر آپ کی اجازت سے شروع کیا ہے یا اپنے ارادے سے اس کے جواب میں شاہ عبدالعزیز نے صرف اتنا ہی لکھا :

"برخورداران عبدالحئی واسماعیل درحالے کہ وہاں موجود ہیں
تو اس فقیر کو جواب استفتا کی تکلیف دینی فضول ہے جو کچھ
دریافت کرنا ہو ، ان لوگوں سے دریافت کرلیجئے ، ان کا کہنا
عین اس فقیر کا کہنا ہے"۔[3]

آپ کے تایا اور استاد حضرت شاہ عبدالعزیز کے یہ بلند پایہ الفاظ شاہ اسمٰعیل شہید کی ہمہ گیر ، پرکشش اور پرعظمت شخصیت کے مقام اعلیٰ کی غمازی کرتے ہیں ۔ شاہ عبدالعزیز ذہانت وفطانت کے اس بحر زخار

---

1. Abdullah Butt, Aspects of Shah Ismail Shaheed. p. 44.

۲۔ وقائع عبدالقادر خانی ،علم وعمل ۔ جلد ۔ ۱ ، ص ، ۲۵۰

۳۔ فضل حسین ترھتی ، الحیاۃ بعد المماۃ ۔ ص ، ۱۰۹

کی موجوں سے خوش ہو کر ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے اور فرماتے :

"الحمد للّٰہ الذی وھب لی علی الکبر اسمٰعیل واسحق"۔[1]

جید عالم مولانا فضل حق خیرآبادی علم منطق کے پتلے ، افلاطون ، سقراط وبقراط کی غلطیوں کی تصحیح کرنے والے اور آپ کے معاصر اور سب سے بڑے مخالف تھے۔ جب انہوں نے دھلی میں حضرت شاہ محمد اسمٰعیل کی بالاکوٹ میں شہادت کی خبر سنی تو اس وقت درس دے رہے تھے اور مولوی غلام یحییٰ ان سے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ شاہ صاحب کی شہادت کی خبر سنتے ہی انہوں نے کتاب بند کر دی اور سکتے کے عالم میں دیر تک خاموش بیٹھے روتے رہے۔ اس کے بعد یہ تاریخی الفاظ سینۂ قرطاس پر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے۔

"اسمٰعیل کو ہم مولوی نہیں جانتے تھے بلکہ وہ امت محمدیہ کا حکیم تھا۔ کوئی شے نہ تھی ، جس کی انیت اور لمیت اس کے ذہن میں نہ ہو۔ امام رازی نے اگر علم حاصل کیا تو دود چراغ کھا کر اور اسمٰعیل نے محض اپنی قابلیت اور استعداد خداداد سے"۔[2]

جناب شاہ محمد اسمٰعیل نے اوائل عمری میں مجاہدانہ زندگی کے ساتھ ساتھ مذہبی اور دینی مسائل پر کئی کتب اور رسالے لکھے۔ ان کی علمی قابلیت ،عقل سلیم اور زور کلام کا اندازہ ان کی یادگار تصانیف سے کیا جا سکتا ہے۔ شاہ صاحب نے حرمین شریفین روانہ ہونے سے قبل ۱۲۳۲ھ /۱۸۱۶ء میں رد الاشراک اور تقویۃ الایمان اور ۱۲۳۳ھ /۱۸۱۸ء میں صراط مستقیم تصنیف کی تھیں۔

(۱) ردّ الاشراک : (عربی)

یہ کتاب شرک کی باریک ترین اقسام اور غیر شرعی رسوم کے خلاف لکھی گئی ہے۔ اس رسالے کو ۳۵ عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ تقویۃ الایمان ، رد الاشراک کے پہلے حصے کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں شاہ صاحب نے قرآن حکیم کی چھتیس[۳۶] آیات اور مشکوۃ شریف کی تینتالیس[۴۳] احادیث سے دلائل پیش کر کے شرک وبدعت کا رد کیا ہے۔ اس کتاب میں نہایت ہی پرجوش اور مدلل انداز

۱۔ فضل حسین ترھتی ،الحیاۃ بعد المماۃ ۔ ص، ۱۰۸

۲۔ ایضاً ۔ ص، ۱۱۰

اختیار کیا گیا ہے۔ (تذکیر الاخوان ،کتاب " رد الاشراک " کے دوسرے حصے کا اردو ترجمہ ہے جو سلطان محمد خان نے کیا ہے)۔

(۲) صراط مستقیم : (فارسی)

یہ کتاب سید احمد شہید کے ارشادات کا مجموعہ ہے جو چار ابواب پر مشتمل ہے۔

(۳) منصب امامت : (فارسی)

اس کتاب میں امامت کے اسلامی تصور پر بحث کی گئی ہے اور ملت کی قیادت کے لیے پانچ خصوصیات وجاہت ، ولایت ، بعثت ، ھدایت اور سیاست کو بیان کیا گیا ہے۔

(۴) رسالہ در علم منطق : (فارسی)

اس رسالے میں علم منطق پر عالمانہ بحث کی گئی ہے۔

(۵) تنویر العینین فی اثبات رفع الیدین : (عربی)

شاہ صاحب نے اس کتاب میں متعدد احادیث کے حوالے سے نماز میں رفع یدین کا جواز پیش کیا ہے اور تقلید اور عدم تقلید کے مسئلے پر بھی وسعت نظر سے بحث کی ہے۔ رسول پاک کا نماز میں عمل رفع یدین اور بعد ازاں ترک رفع یدین کا ذکر کرتے ہوئے نہایت دیانت داری سے تصویر کے دونوں پہلو پیش کر دیے ہیں۔

(۶) ایضاح الحق الصریح فی احکام المیت والضریح : (فارسی)

اس معرکۃ الاراء کتاب میں قرآن حکیم کی آیات اور احادیث نبوی سے استدلال کرتے ہوئے سنت و بدعت کے درمیان فرق و امتیاز کو واضح کیا ہے۔ اس میں مردے کی تکفین و تدفین کے مسائل اور غیر اسلامی رسوم کی مذمت کی گئی ہے۔

(۷) العبقات : (عربی)

تصوف کے نازک ترین مسائل پر شاہ صاحب کی نہایت مشکل اور ادق تصنیف ہے۔

(۸) اصول فقہ : (عربی)

یہ رسالہ اسلامی فقہ کے اصولوں پر مختصر تبصرہ ہے۔

(۹) حقیقت تصوف (فارسی)

یہ کتاب طبقۂ صوفیاء سے متعلق ہے۔

(۱۰) الاربعین فی احوال المہدیین (عربی - اردو)

یہ کتاب ان احادیث پر مشتمل ہے جن سے امام مہدی کا نزول ثابت ہوتا ہے۔

(۱۱) رسالہ یک روزی : (فارسی)

شاہ صاحب کا یہ مختصر رسالہ " تقویۃ الایمان " پر کیے گئے اعتراضات سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ رسالہ شاہ صاحب نے ایک ہی نشست میں ایک ہی دن میں تصنیف کیا ہے۔

(۱۲) مبحث امکان النظیر وامتناع النظیر " (فارسی)

یہ رسالہ عقائد اور علم الکلام کے بارے میں ہے۔

(۱۳) کتاب سفر السعادت :

اس کتاب میں مسح ، تیمم ، قیام ، رکوع و سجود ، اعتدال سجدہ تہجد - سلام پھیرنے، نماز خوف ، نماز استسقاء ، زکوٰۃ ، اعتکاف اور جہاد وغیرہ کا ذکر ہے۔

شاہ اسمٰعیل کی ان تصانیف کے علاوہ مثنوی سلک نور ، رسالہ بے نماز ، چند رسائل اور مکتوب بھی ہیں۔ شاہ صاحب عربی وفارسی کے صاحب طرز انشا پرداز اور ممتاز مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ شعلہ بیان خطیب اور مقرر بھی تھے۔ شاہ اسمٰعیل کے مختلف اقسام کے مشاغل میں مصروف رہنے کے باوجود یہ چند کتابیں بھی سند کی حیثیت رکھتی ہیں - جن سے آپ کی جدتِ فکر ، اسلوب ادا اور مختلف علوم میں مجتہدانہ شان کا ثبوت ملتا ہے۔

وفات :

شاہ صاحب ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ / ۵ مئی ۱۸۳۱ء میں اپنے پیر سید احمد شہید کے ہمراہ بمقام بالاکوٹ لڑتے ہوئے شہید ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے - (انا للہ وانا الیہ راجعون) اس روحانی پیشوا اور محسن ملت پر خدا کی رحمت ہو - شاہ اسمٰعیل کے ایک فرزند محمد عمر تھے جو ۲۲ جمادی الثانی ۱۲۶۸ھ کو لاولد ہی فوت ہوئے۔

شاہ محمد مخصوص اللہ

خاندان ولی اللہی کے عابد و زاہد بزرگ اور مدرسہ رحیمیہ کے بلند پایہ مدرس شاہ محمد مخصوص اللہ بن شاہ رفیع الدین محدث دہلوی بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ آپ نے تمام علوم عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل اپنے تایا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور اپنے دونوں چچاؤں (شاہ عبدالقادر ، شاہ عبدالغنی) سے کی - علاوہ ازیں شاہ عبدالعزیز سے سلسلہ قادریہ میں بیعت کی - فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ نے اپنی تمام تر توجہ علوم و فنون کی طرف مرکوز کر دی - اپنا تمام وقت ترویج دین اور تدریس علوم میں صرف کرتے رہے - حدیث و تفسیر میں یگانۂ روزگار ہونے کے ساتھ ساتھ فقہ و عقائد اور کلام و اصول وغیرہ میں بھی بلند پایہ رکھتے تھے - شاہ صاحب ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء سے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی وفات ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۲ء تک آپ کے وعظ

۲۵ ۲۰

میں مسلسل شریک ہوتے رہے - اسی بنا پر " حیات ولی " کے مصنف لکھتے ہیں کہ " بیس پچیس سال تک برابر مولانا صاحب کی خدمت میں قراتٌ کلام الہی اور حدیث رسالت پناہی کرتے رہے اور آپ کی تقاریر گوش ہوش کا ذخیرہ فرماتے رہے - اس لیے آپ نے حدیث و تفسیر میں وہ کمال بہم پہنچایا تھا کہ ان دونوں فنون کے جو بیش قیمت اور انمول جواہر آپ کے خزانہ سینے میں تھے ، وہ کہیں اور نہ پائے جاتے تھے -

شاہ صاحب تمام عمر درس و تدریس میں مصروف رہے اور یہ مصروفیت روشن الدولہ کی

قاضی

مسجد (واقع/واڑہ) میں نقطۂ عروج پر ہوتی تھی - جہاں تک آپ کے سلسلہ روزگار کا تعلق تھا تو وہ غازی عالمگیر مرحوم کی ، آپ کے مورث اعلی شاہ عبدالرحیم کو عطا کردہ جاگیر کی آمدنی پر منحصر تھا - شاہ صاحب کے متقی و پرہیزگار ہونے کے باعث طبیعت میں زیادہ تر عبادت و زہادت کے آثار نمایاں تھے - یہی وجہ تھی کہ اکثر اوقات بڑی بڑی رات عبادت الہی اور تقوی شعاری میں گزار دیتے - منصب درس و تدریس کو حسن و خوبی سے سرانجام دینے کے باعث تصنیفات کی طرف زیادہ توجہ مبذول نہ کر سکے - طبیعت میں زہد کی وجہ سے ہی آپ نے آخری عمر میں سررشتہ

تدریس چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی ۔ سرسید احمد خان آپ کے اسی مزاج کے بارے میں رقمطراز ھیں کہ " آپ کے اوقات اس درجہ مجموع تھے کہ شاید سلف صالحین کے زمرہ میں اولیائے کرام کے اوقات ایسے ھی ھوں گے اور از بسکہ توجہ عبادت اور تقوی شماری کی طرف مصروف ھے ۔ نظم عربی اور انشائے پردازی کی طرف میل نہیں "۔[1]

شاہ محمد مخصوص اللہ عامل آمین اور رفع الیدین تھے ۔ شاہ صاحب ، شاہ محمد اسمٰعیل اور مولوی عبدالحئی بڑھانوی کے وھابیانہ رجحانات کے شدید مخالف تھے ۔آپ نے " تقویۃ الایمان " کے جواب میں " معید الایمان " تحریر کی تھی ۔ پھر جامع مسجد دھلی کے تاریخی مناظرہ کے ایک پرجوش فریق تھے ۔ اس مناظرہ کے شروع میں ھی جب مولوی عبدالحئی صاحب نے دریافت کیا کہ " تم لوگ یہاں کیوں آئے ھو تو شاہ صاحب نے جواب دیا تھا " ھم بموجب حکم خدا کے آئے ھیں کہ حق ظاھر ھو جائے "۔[2] پھر مناظرہ کے تیرھویں سال ان دونوں حضرات کے مابین " بدعت " پر بحث ومباحثہ ھوا جس میں شاہ محمد مخصوص اللہ حاوی رھے ۔شاہ صاحب کی طبیعت میں جود وسخا کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ھوا تھا ۔ مغلیہ خاندان کی شہزادیاں آپ کو حویلی میں آنے کی دعوت دیتیں ۔ آپ کی خدمت عالی میں پرتکلف کھانے پیش کیے جاتے لیکن آپ ان کھانوں پر دعائیں پڑھنے کے بعد مساکین وفقراء میں بانٹ دیتے ۔ علاوہ ازیں مدرسہ میں بھی جو کھانوں کے خوان آتے وہ بھی مستحقین میں تقسیم کر دیتے ۔

وفات :

شاہ محمد مخصوص اللہ ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء میں اس دار فانی سے ھمیشہ کے لیے کوچ کر گئے اور اپنے آبائی قبرستان مہندیوں میں دفن کئے گئے ۔

تلامذہ :

مولوی عبدالرشید برادر شاہ عبدالغنی مجددی دھلوی آپ کے شاگرد رشید تھے ۔

۱۔ سرسید احمد خان ، آثار الصنادید ۔ ص ۹۵

۲۔ محمود احمد برکاتی ، شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان ۔ ص ۱۷۹ ۔

مفتی صدرالدین آزردہ دھلوی

مفتی صدر الدین بن شیخ لطف اللہ کشمیری ، جن کا شمار شاہ عبدالعزیز دھلوی کے ارشد تلامذہ اور دلّی کے سربرآوردہ علماء و فضلاء میں ھوتا ھے ، ۱۲۰۴ھ/۱۷۸۹ء میں بمقام دھلی پیدا ھوئے ۔ آپ نے علوم نقلیہ اور فقہ و حدیث و غیرھم کی تحصیل شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر جیسی بلندپایہ اور جلیل القدر ھستیوں سے کی ۔ شاہ عبدالعزیز کے انتقال کے بعد مفتی صاحب نے آپ کے نواسے شاہ محمد اسحاق سے سند حدیث حاصل کی ۔ ان حضرات سے علوم نقلیہ کی تحصیل کے علاوہ جناب فضل امام خیرآبادی کی خدمت میں حاضر ھو کر علوم عقلیہ حاصل کیے ۔ فن خوش نویسی میں بہادر شاہ ظفر کے شاگرد رشید تھے ۔ صرف و نحو ، منطق و فلسفہ ، معانی و بیان ، ریاضیات و انشا پردازی ، فقہ و حدیث و تفسیر اور خصوصاً ادبی فنون میں نادر عصر اور یگانہ روزگار تھے ۔ شعر و سخن کے لحاظ سے آپ کا شمار غالب کے ھم نشینوں اور حریفوں میں ھوتا ھے ۔ مفتی صاحب کا شعری و ادبی ذوق تینوں زبانوں (عربی ، فارسی ، اردو) میں نقطۂ عروج پر تھا ۔ علم و ادب میں بلند مقام رکھنے کے باعث دلّی میں علمائے سلف کے طریقے پر درس بھی دیا کرتے تھے ۔ علاوہ ازیں جامع مسجد دھلی کے نیچے موجود مدرسہ " دار البقاء " کو ازسرنو جاری کرنے اور اس میں تحصیل علم کے لیے آنے والے مستحق طلباء کے تمام مصارف کے کفیل ھونے کا سہرا بھی آپ ھی کے سر ھے ۔ آپ انگریزی حکومت کی طرف سے دلی میں مفتی اور صدر الصدور کے عہدے پر فائز تھے ۔ علم و فضیلت ، قوت حافظہ، حسن تقریر ، متانت تحریر ، وضاحت بیان اور بلاغت معانی کے ساتھ ساتھ دوست نواز اور دشمن گذار ھونے کے باعث یہ عہدہ آپ ھی کے شایان شان تھا ۔ یہاں تک کہ انگریز آپ کی دیانت ، صداقت اور ذھانت کے قائل تھے ، جو مقدمہ بھی آپ کے روبرو پیش ھوتا ، آپ اس کی حتی المقدور چھان بین اور تحقیق کرنے کے بعد اس کا صحیح فیصلہ صادر فرماتے ۔ جس سے مستحق شخص کو اپنا حق مل جاتا اور آپ بھی مطمئن رہتے ۔

۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء میں غدر کے زمانہ میں جہاد کے فتوی کے اتہام میں انگریز سرکار نے آپ

کو منصب روزگار سے علیحدہ کرنے کے ساتھ ساتھ آپ کی تیس سال کی ملازمت میں بنائی ھوئی

جائداد منقولہ و غیر منقولہ اور تین لاکھ کی مالیت کا کتب خانہ بھی ضبط کر لیا ، صرف اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ فتوے کے شک میں نظر بند کر دیا ۔ بالآخر تحقیقات پر رہا ہونے کے بعد آپ نے لاہور میں پنجاب کے چیف کمشنر لارڈ لارنس صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی جائداد کی واپسی کا مطالبہ کیا ۔ لارڈ لارنس مفتی صاحب کی ملازمت کے دوران میں آپ پر بہت مہربان تھے چنانچہ اسی مہربانی اور مروت میں آپ کی جائداد غیر منقولہ آپ کو واپس دے دی گئی لیکن جائداد منقولہ نیلام ہو چکی تھی ، اس لئے وہ نہ مل سکی ۔ اس کے بعد مفتی صاحب آزردہ خاطر ہو کر دہلی واپس تشریف لائے اور اپنی زندگی کے باقی ماندہ ایام و طاعت و عبادت
81
اور تدریس علوم دینیہ میں بسر کئے ۔ آخری عمر میں دو سال مرض فالج میں مبتلا ہو کر اکیاسی برس کی عمر میں یوم پنجشنبہ ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء میں راہی ملک عدم ہوئے اور درگاہ حضرت چراغ دہلوی میں دفن کیا گیا ۔

علم و فضل :

مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی گنجینۂ علم ، کان حلم و بحر سخا ، مخزن لطف و جود و عطا ، عامل کامل ، فاضل اجل ، فقیہہ بے مثل ، عالم باعمل اور اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے ۔ آزردہ تخلص تھا ۔ آپ کا اردو کلام تھوڑا مگر بلند پایہ انتخاب ہے ۔ اردو میں شاہ نصیر ، میر ممنون اور میاں مجرم اکبر آبادی سے مشورہ کیا کرتے تھے اردو کے شاعروں کا تذکرہ فارسی میں مرتب کیا تھا لیکن اب نایاب ہے ۔ وقائع عبدالقادر خانی لکھتے ہیں کہ " جس وقت بندہ (عبدالقادر) نے ان کو دیکھا تھا ۔ ان کی توجہ اشعار ریختہ اور فارسی کی طرف کتب علمیہ سے زیادہ تھی "۔[1]

مرزا غالب ، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ اور امام بخش صہبائی سے مفتی صاحب کے نہایت گہرے تعلقات تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سادہ ، بے تکلف اور رواں اردو میں باہم خط و کتابت ہوتی رہتی تھی ۔ ان کا ایک خط نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے نام ملا ہے ۔ مفتی صاحب لکھتے ہیں :

۱۔ وقائع عبدالقادر خانی ، علم و عمل ۔ جلد ۔ ۱ ص ۲۷۵

"شکر ہے اس پروردگار کا جس نے مجھ کو ایسی دلدل سے کو ھمہ تن اوس میں غرقاب تھا، نکالا ۔ کیسے علاقہ میں جکڑ بند تھا کو نکلا اوس سے سوائے ایسی صورت کے جو پیش آئی ممکن نہ تھا، مقدمات اصلی کا فیصل کرنا، مصفون اور صدر امینون کے مقدمات کا مرافعہ سننا، رجسٹری کے وثائق پر دستخط کرنا، مقدمات دورہ میں فتوی دینا، کچھری میں حاضر ہونا، طلباء مدرسہ سرکاری کا امتحان ماہواری لینا، احکام اخیر کو اپنے ہاتھ سے لکھنا، ہزار ہا کاغذ کا دستخط کرنا، پھر گھر میں آکر طالب علمون کو پڑھانا اور اطراف و جوانب کے سوالات شرعی کا جواب لکھنا، وھابیوں اور بدعتیوں کے جھگڑے میں حکم ہونا، مجالس شادی اور غمی اور اعراس میں جانا، شعر و شاعری کی صحبت کو گرم رکھنا، باغات کی سیر کو اور خواجہ صاحب کی زیارت کو اکثر جانا"۔[1]

دھلی اور اس کے نواح کے تمام خاص امیان واکابر اور علماء فضلاء آپ کے مکان پر بغرض ملاقات تشریف لاتے۔ طلباء تحصیل علم کے لیے، اہل دنیا اپنے معاملات پر مشورے حاصل کرنے کی خاطر، شعراء شاعرون کے لیے اور منشی لوگ انشا میں اصلاح کی غرض سے آپ کے پاس بہ نفس نفیس آتے تھے۔ آپ ان تمام لوگوں سے نہایت محبت وشفقت اور مروّت واخلاق سے پیش آتے ہوئے ان کے مسائل حل کرتے۔ اس دور کے بڑے بڑے علماء و فضلاء آپ کی شاگردی اختیار کرنے میں بہت فخر محسوس کرتے جیسا کہ صاحب "اتحاف النبلاء" لکھتے ہیں کہ:

> "فضلای عصر بتلمذ ایشان سربلند دارند خلقی کثیر فاتحۂ فراغ در حلقۂ درس ایشان خواندہ اند مردم بلاد دور دست بعد تحصیل وتکمیل علوم متداولہ وفنون رسیدہ بخدمت ایشان رسیدہ یک دو سبق یا مختصری در علم خواندہ فراغ حاصل میمودند"۔[2]

جہان تک عربی ادب اور شاعری کے ذوق کا تعلق ہے۔ اس کے بارے میں بقول مولانا ابوالکلام، کہ والد مرحوم فرماتے تھے "متنبی کا درس دھلی میں سب سے پہلے انہوں نے ہی دیا ورنہ اس کا کلام درس

۱۔ معارف ۔ مئی وجون ۱۹۲۱ء، ص ۳۲۷

۲۔ نواب صدیق حسن خان، اتحاف النبلاء ۔ ص، ۲۶۲

کی چیزوں میں شامل نہ تھا"۔[1] شاعری میں دلچسپی رکھنے کے علاوہ نثرنگاری میں بھی شوق رکھتے تھے۔ صدر الصدور کے عہدے پر فائز ہونے کے دوران میں بھی طالب علموں کو پڑھایا کرتے تھے۔ عمر کے آخری حصّے میں جسے دورِ اختلال کہہ سکتے ہیں، آپ نہایت دل شگاف آواز اور درد انگیز حالت میں شعر پڑھتے تھے لیکن شعر و سخن میں عاشق مزاج جوانوں سے زیادہ مذاق رکھتے تھے۔ غالب، حسرت اور مومن جیسے شعرائے دہلی نے آپ کی مدح میں بڑے بڑے قصائد اور اشعار تصنیف کیے ہیں۔ علاوہ ازیں مفتی صدر الدین خاں بہادر طلبہ کو عربی اور فارسی مضامین لکھنے پر ازراہ ترغیب اور فیاضی ایک تمغہ بھی عطا فرماتے تھے۔

مفتی صاحب حکومت انگریز کے خیر خواہ، دیانت دار، انصاف پسند، نیک دل اور بڑے ایمان دار حاکم تھے۔ اہل مقدمہ ہمیشہ آپ کے عدل و انصاف سے خوش رہتے۔ آپ کی انصاف پسندی شوکت ظاہری و باطنی اور عبادت کے بارے میں سرسید احمد خاں رقمطراز ہیں کہ:

"منصب صدارت کو اپنے ذمہ پر لیا۔ سبحان اللہ کیا طریقۂ داد ہے اور کیا سررشتہ انصاف ہے کہ نوشیرواں ان کے دیوان عدالت میں عہدہ پیش کاری کے لائق بھی نہیں سمجھا جاتا۔ باقی رہا عدل عمر یہاں بسبب ادب کے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ شوکت ظاہری سے ان کے دربار میں دارا کو گزار نہیں اور جلالت باطنی سے ان کی خلوت میں فرشتے کو بار نہیں۔ باوجود ان مراتب بلند اور اس منصب ارجمند کے خلق محمدی اختیار کیا ہے کہ افادۂ علوم اور افاضت مسائل دین کے وقت عرادنیٰ کو اجازت سخن ہے۔ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کے موزونی سخن کی طرف بھی متوجہ ہو کر نظم و نثر میں اوقات شریف کو مصروف فرماتے ہیں"۔[2]

ان تمام خوبیوں اور صفات کے علاوہ مفتی صاحب اپنی جامع قابلیت و فضیلت کے باعث نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ آپ نے اپنی پوری ملازمت کے دوران میں اپنے تمام فرائض ہمیشہ ایمانداری سے سرانجام دیئے۔ شاہ عبدالغنی دہلوی سے نہایت عقیدت رکھتے تھے۔ امیر شاہ خاں لکھتے ہیں کہ یہ قصہ مولانا گنگوہی بیان فرماتے تھے۔" ایک مرتبہ شاہ عبدالغنی صاحب کے یہاں

۱۔ غلام رسول مہر، غالب۔ ص، ۲۸۲

۲۔ سرسید احمد خاں، آثار الصنادید۔ ص، ۱۲۰

کئی وقت کا فاقہ ہوا ۔ اس کا تذکرہ ان کی ماں نے کہیں کر دیا ۔ اس کی خبر کسی ذریعہ سے مفتی صدرالدین صاحب کو بھی ہوگئی ۔ مفتی صاحب نے تین سو روپیہ شاہ صاحب کی خدمت میں بھجوا دیے ۔ شاہ صاحب نے واپس کر دیے ۔ اس پر مفتی صاحب وہ روپیہ لے کر خود حاضر ہوئے اور تخلیہ میں روپے پیش کئے اور فرمایا کہ شاید حضور کو خیال ہو کہ یہ صدر الصدور ہے ، رشوت لیتا ہوگا ۔ اس لئے میں عرض کرتا ہوں کہ میں رشوت نہیں لیتا بلکہ یہ روپے میری تنخواہ کے ہیں ، آپ ان کو قبول فرما لیجئے ۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ مجھے تو یہ وسوسہ بھی نہیں گزرا کہ تم رشوت لیتے ہوگے ۔ میں تمہاری نوکری کو بھی اچھا نہیں سمجھتا اور اس لیے میں ان کے لینے سے معذور ہوں "[1] ۔ اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مفتی صاحب کا کمال ادب ، دینی محبت اور ایمانداری روز روشن کی طرح عیاں تھی۔

تصانیف :

=====

مفتی صاحب کی تمام عمر مختلف مسائل کو حل کرنے ، درس و تدریس میں مصروف رہنے اور صدر الصدوری کے علاوہ دیگر بےشمار کاموں کو سرانجام دیتے ہوئے گزر گئی ۔ اگرچہ آپ کی کافی تصانیف تھیں لیکن غدر میں آپ کا کتب خانہ ضبط ہونے کے باعث چند ایک کتابوں کے سوا کچھ معلوم نہیں ہو سکا ۔ ان کے دو رسالے " منتہی المقال فی شرح حدیث لا تشد الرحال " اور " الدر المنضود فی حکم امراۃ المفقود " طبع ہو چکے ہیں ۔ علاوہ ازیں " مجموعہ فتاوی " اور ایک " ریختہ گو شعراء کا تذکرہ " بھی آپ نے لکھا ہے۔

تلامذہ :

=====

وقائع عبدالقادر خانی کے نزدیک سرسید احمد خان بہادر ، نواب یوسف علی خان والئی رام پور ، نواب صدیق حسن خان قنوجی ، مولوی محمد قاسم نانوتوی ، مولوی محمد منیر نانوتوی ، مولوی رشید احمد گنگوہی اور مولوی فقیر محمد جہلمی[2] کا شمار آپ کے شاگردوں میں ہوتا ہے ۔ اس کے علاوہ رئیس احمد جعفری کے قول کے مطابق مولوی ذوالفقار علی دیوبندی ، مولوی فیض الحسن ، مولوی حکیم محمد الحسن امروہوی ، مولوی محمد احسن مراد آبادی اور مولانا سید نواب علی[3] بھی آپکے شاگرد ہیں۔

---

۱ ۔ اشرف علی تھانوی ، امیر الروایات ۔ ص ، ۱۲۰

۲ ۔ وقائع عبدالقادر خانی ، علم و عمل جلد ۔ ۱ ، ص ، ۲۷۵

۳ ۔ رئیس احمد جعفری ، بہادر شاہ اور ان کا عہد ۔ ص ، ۳۵۲

مولوی رشید الدین دہلوی

===============

مولوی رشید الدین بن امین الدین بن وحید الدین بن عبدالسلام کشمیری دہلوی تقریباً ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی - آپ نے اپنی تعلیم کا آغاز استاد مفتی علی کبیر البخارسی سے کیا - بعد ازاں آپ نے علم منقول ومعقول میں استفادہ کسی غرض سے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور شاہ عبدالقادر کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ کیا لیکن جملہ علوم کی تکمیل شاہ رفیع الدین محدث دہلوی کی خدمت میں حاضر ہو کر کی - آپ فاضل کامل اور عالم باعمل ہونے کے باعث تمام علوم وفنون متداولہ میں تبحر کامل رکھتے تھے - معقولات کے امام ہونے کے ساتھ ساتھ خاص طور پر علم ہیئت وہندسہ میں بہت ملکہ حاصل تھا - مختصراً یہ کہ آپ علم منقول ومعقول میں یکتائے روزگار ہونے کے علاوہ ہر فن میں کچھ نہ کچھ معلومات رکھتے تھے - آپ مدۃ العمر فرقہ امامیہ کے علماء سے مباحثہ ومناظرہ میں مصروف رہے اور اس سلسلے میں جو کچھ کہتے اس میں طوالت اختیار کرتے اور جو کچھ لکھتے ، نہایت بسط وتفصیل سے لکھتے - اس طرح متعدد رسائل جمع ہوگئے - دینی اختلافات کے سلسلے میں تحریر وتقریر میں لاجواب طریق کار اختیار کرتے اور سمجھتے کہ مقابل میں ردّ وقدح کی گنجائش باقی نہیں - اس سلسلے میں وقائع عبدالقادر خانی رقمطراز ہیں کہ "مسئلہ متعہ کے متعلق لکھنؤ کے شیعہ علماء کے جواب میں جو کتاب لکھ رہے تھے ، اس کا مقدمہ کئی جزو ہوگیا تھا اور ابھی پورا نہیں ہوا تھا - مجھے کتاب دکھا کر کہا کہ جب یہ کتاب اس شرح وبسط کے ساتھ جو میں چاہتا ہوں ، پوری ہو جائے گی اور لکھنؤ پہنچے گی تو وہاں کے علماء اس کے جواب کی فکر میں مر جائیں گے اور گریبان سے سر نہ اٹھا سکیں گے"۔[1]

ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ آپ ان دینی مباحثوں اور مناظروں میں غلطاں ہونے کے باعث غور وفکر میں مصروف ہو جاتے تھے - آپ عالم باعمل دینی راہنما ہونے کے علاوہ زاہد وعابد ، متقی و پرہیزگار اور عادل ومنصف جیسی صفات سے متصف تھے - حکام وقت آپ کے عدل وانصاف کے باعث

۱- وقائع عبدالقادر خانی ، علم وعمل - جلد - ۱ ص، ۲۵۱

کے باعث آپ کو منصب قضا سونپنا چاہتے تھے تاکہ آپ اپنی نیک نیتی اور منصف مزاجی کے باعث خلق خدا کو ان کے صحیح حقوق دے سکیں چونکہ آپ درس و تدریس اور تعلیم و تعلّم میں مصروف رہتے تھے۔ اس لیے آپ نے اس عہدے کو قبول نہ کیا لیکن احباب و حکّام کی طرف سے بہت اصرار پر آپ نے دہلی کے مدرسہ میں مدرّس عربی کے عہدہ کو قبول کیا، جس سے سو روپیہ (100) تنخواہ پاتے تھے۔ اپنے فطری ایثار و کرم کے باعث محتاجوں، مسکینوں اور فقیروں کی ہر ممکن مدد کرتے تھے۔ آخری عمر میں حج بیت اللہ کا ارادہ کیا تھا لیکن کسی شدید مرض میں مبتلا رہنے کے باعث اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ (انا للہ و انا الیہ راجعون) ۔ "واقعات دار الحکومت دہلی"، "علم و عمل" اور "آثار الصنادید" کے علاوہ بیشتر مستند کتب میں آپ کی کل عمر ستّر برس تحریر کی گئی ہے۔ "آثار الصنادید" کے مصنّف کا بیان ہے کہ "آپ کی وفات کو تیرہ چودہ برس کا عرصہ گزرتا ہے"۔[1] "آثار الصنادید" کا سن طباعت ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء ہے اگر اس میں چودہ سال کا عرصہ نکال دیا جائے تو مولوی رشید الدین کا سن وفات ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۳ء بنتا ہے اور اگر اس لحاظ سے ان کے سن وفات میں سے کل عمر ستّر سال نکال دی جائے تو ان کا سن پیدائش تقریباً ۱۱۷۹ھ / ۱۷۶۳ء نکلتا ہے۔

تصنیفات:

======

مولوی رشید الدین خان صاحب نے تمام عمر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزار دی۔ آپ نے زیادہ تر کتب شیعہ عقائد کے رد میں لکھیں۔ آپ کی تالیفات میں سے مندرجہ ذیل کتب بہت مشہور ہیں۔

۱۔ تشریح الافلاک: یہ کتاب علم ہیئت پر لکھی گئی ہے، جو خلاصہ مولوی عصمت اللہ سہارنپوری کی مختصر شرح ہے۔

۲۔ "تحفہ اثنا عشریہ" کے جواب میں اہل شیعہ مولوی دلدار علی اور لکھنؤ والوں نے جو جوابات لکھے ہیں۔ آپ نے ان کے جوابات کے رد میں ایک رسالہ "رد روافض" تحریر کیا ہے۔ اس میں اصل متن "تحفہ اثنا عشریہ" کے ساتھ ساتھ ان اعتراضات کو لکھتے ہوئے جوابات دیے ہیں۔

۱۔ سرسید احمد خان، آثار الصنادید۔ ص، ۹۰

۳- ایک کتاب "صولة الضیغم" رد" متع میں تصنیف کی ھے - (۴) الشوکة العمریة (۵) مبحث مشعة الشکاح (۶) تفصیل الاصحاب (۷) ایضاح لطافة المقال (۸) اعانة الموحدین و اهانة الملحدین

ان کے علاوہ صاحب "نفحة الیمن" شیخ احمد شروانی اور مولوی رشید الدین خان کے خطوط کا ایک مختصر مجموعہ "المکاتیب" کے نام سے مطبع مجتبائی سے ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء میں شائع ہو چکا ھے -

علامہ فضل حق خیرآبادی

علامہ فضل حق خیرآبادی جادۂ آزادی کے رہبر طریقت و مجاھد اعظم ، علمی و ادبی کمالات میں مسلم الثبوت اور عزم و ثبات میں ضرب المثل تھے - یگانۂ روزگار محقق ، جادو نگار ادیب اور فاضل اجل تھے - آپ ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء میں اپنے آبائی گاؤں وطن خیرالبلاد خیرآباد میں پیدا ہوئے - آپ کے جلیل القدر والد گرامی جناب فضل امام خیرآبادی دارالسلطنت دھلی میں صدر الصدور کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے - آپ اپنے ھمعصروں میں ممتاز اور علوم عقلیہ کے بلند مقام پر پہنچ چکے تھے -

شجرہ نسب :

علامہ فضل حق خیرآبادی کا سلسلہ نسب خلیفہ ثانی امیرالمومنین سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ھے - "باغی ھندوستان" میں آپ کا شجرہ نسب یوں بیان کیا گیا ھے :

"علامہ فضل حق بن مولانا فضل امام بن شیخ محمد ارشد ھرگامی بن حافظ محمد صالح بن ملا عبدالواحد بن عبدالماجد بن قاضی صدر الدین بن قاضی اسمعیل ھرگامی بن قاضی عماد الدین بدایونی بن شیخ ارزانی بن شیخ منور بن شیخ خطیر الملک بن شیخ سالار بن شیخ وجیہ الملک بن شیخ بہاؤالدین بن شیر ملک شاہ ایرانی بن شاہ عطاء الملک بن ملک بادشاہ بن ابوالفتح ملک بن محمد عمر حاکم ملک بن عادل ملک بن فاروق بن جرجیس بن احمد بن محمد شہریار بن محمد عثمان بن ماھان بن ھمایوں بن قریش بن سلیمان بن عفان بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن امیر المومنین خلیفة المسلمین حضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہ" - [1]

۱- عبدالشاھد خان شروانی - باغی ھندوستان - ص ۱۲

علامہ فضل حق خیرآبادی کے اسلاف ایران کے ایک قطعۂ ارض پر کافی عرصہ تک حکمران رہے ۔ گردش ایام کے باعث اس قطعۂ ارض سے دست بردار ہوگئے لیکن علمی خدمات کو خاندانی شعار بنا لیا ۔ آپ کے مورث اعلیٰ شیر الملک بن شاہ عطاء الملک کے دو صاحبزادوں بہاء الدین اور شمس الدین نے علماء معاصر سے علوم و فنون میں بلند مقام حاصل کر لیا ۔ ظاہری و باطنی علوم میں کامل دونوں بزرگ ایران سے ہندوستان وارد ہوئے ۔ فضل و کمال میں اعلیٰ مقام رکھنے کے باعث بہاء الدین شیخ الاسلام بدایوں میں قاضی اور شمس الدین رہتک کے مفتی اعظم مقرر ہوئے ۔ مفتی شمس الدین کے صاحبزادے ملا کمال الدین کے نامور پوتے شاہ ولی اللہ بن عبدالرحیم دہلوی تھے اور بہاء الدین کے صاحبزادے وجیہہ الملک کے پوتے شیخ ارزانی بھی بدایوں رہے پھر شیخ ارزانی نے اپنے بیٹے عماد الدین کو تحصیل علم کی خاطر قاضی ہرگام کی خدمت اقدس میں بھیجا ۔ قاضی ہرگام آپ کے علوم و فنون و شرافت و نجابت میں اعلیٰ درجہ رکھنے اور ذاتی وجاہت و حسن اخلاق کے باعث بہت متاثر ہوئے اور اپنی دختر نیک اختر سے عقد کرنے کے بعد آپ کو اپنی فرزندگی میں لے لیا ۔ قاضی صاحب کے انتقال کے بعد آپ ہرگام کے قاضی بن گئے ۔ آپ کے بعد آپ کے بیٹے قاضی اسمٰعیل اور پوتے قاضی صدر الدین بھی ہرگام کے قاضی رہے ۔ قاضی صدر الدین کے بیٹے عبدالماجد اور پوتے عبدالواجد بھی اپنے عہد کے فاضل جلیل تھے ۔ ملا عبدالواجد کے صاحبزادے اور علامہ فضل حق خیرآبادی کے پردادا حافظ محمد صالح ، محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں منصب جلیلہ پر فائز تھے ۔ حافظ صاحب کے بیٹے اور علامہ فضل حق خیرآبادی کے دادا شیخ محمد ارشد ہرگامی ، ہرگام کو چھوڑ کر خیرآباد (ضلع سیتاپور اودھ) میں سکونت پذیر ہوئے ۔ علامہ صاحب کے والد محترم فضل امام خیرآبادی صدر الصدور دہلی تھے ۔

مولانا فضل حق خیرآبادی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد گرامی سے حاصل کی ۔ اس دور کے دوسرے طلباء کی طرح ایک طرف تو علم معقول کی تحصیل کے لیے اپنے والد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے تو دوسری طرف علم منقول یعنی حدیث ، فقہ اور تفسیر وغیرہم کے لیے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ کرتے ۔ علامہ صاحب نے آٹھ برس کی عمر میں علم صرف و نحو کی طرف توجہ مبذول کی ۔ قوی الحافظہ اور ذہین و فطین ہونے کے باعث چار ماہ کی قلیل مدت میں قرآن پاک حفظ کر لیا ۔ اور تیرہ برس کسی

عمر میں تمام مروّجہ علوم عقلیہ ونقلیہ سے فراغت حاصل کر کے بیک وقت دونوں دریاؤں سے سیراب ہوکر اپنی مسلم الثبوت قابلیت کے جوہر دکھائے ۔

آپ نسباً فاروقی ، فقہی لحاظ سے حنفی ،عقائد میں ماتریدی تھے اور سلسلہ چشتیہ میں حضرت شاہ دھومن دھلوی سے بیعت کی ۔ اس لیے مولوی رحمان علی " تذکرہ علمائے ھند " میں انہیں "عمری ، حنفی ، ماتریدی ، چشتی لکھتے ہیں [1] رئیس زادہ ہونے کے باعث علامہ فضل حق خیرآبادی مفتی صدرالدین آزردہ دھلوی کی معیت میں ھاتھی پر سوار ہوکر تحصیل علم کے لیے شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے ۔ " مولوی فضل حق صاحب اور مفتی صدرالدین صاحب جس روز خود کتاب لے کر جاتے ، اس روز شاہ عبدالقادر سبق پڑھاتے تھے اور جس روز خدمت گار کتاب ساتھ لے کر پہنچتا ، اس روز کشف سے مطلع ہوکر سبق نہ پڑھاتے " ۔[2]

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کے ساتھ اس دربار میں تربیت ، علم کی عظمت اور استاد کی عزت واحترام کے طریقے بھی سکھائے جاتے تھے ۔ اسی طرح " امیر الروایات " میں مولانا محمد قاسم نانوتوی فرماتے ہیں کہ " مولوی فضل حق صاحب اور مفتی صدرالدین یہ فرمایا کرتے تھے کہ اس خاندان کے لوگ علوم دینیہ جیسے حدیث ، تفسیر اور فقہ وغیرہم خوب جانتے ہیں مگر معقولات نہیں جانتے چنانچہ ایک روز جس وقت پڑھنے جا رہے تھے ۔ ابھی وہ شاہ صاحب تک پہنچے بھی نہ تھے کہ شاہ صاحب نے اپنے خدام کو حکم دیا کہ ایک بوریا مسجد سے باہر ڈال دو اور ایک مسجد کے اندر اور جب فضل حق اور صدرالدین آئیں تو ان کو وہیں بٹھا دو ۔ بوریے حسب الحکم بچھا دیے گئے اور جب وہ دونوں آگئے تو ان کو وہیں بٹھا دیا گیا ۔ جب ان کے آنے کی شاہ صاحب کو اطلاع ہوئی تو شاہ صاحب تشریف لائے اور آکر اپنے بچھونے پر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ میاں فضل حق اور میاں صدرالدین آج سبق پڑھانے کو تو جی نہیں چاہتا ۔ یوں جی چاہتا ہے کہ کچھ معقولیوں کی خرافات میں گفتگو ہو ۔ انہوں نے فرمایا کہ جیسے حضرت کی خوشی ہو ۔ اس پر شاہ صاحب نے فرمایا کہ اچھا

---

۱ ۔ مولوی رحمان علی ، تذکرہ علمائے ھند ۔ ص ، ۱۶۳

۲ ۔ اشرف علی تھانوی ، امیر الروایات ۔ ص ، ۱۰۵

یہ بتلاؤ کہ متکلمین کا کونسا مسئلہ ایسا ہے جو فلاسفہ کے مقابلہ میں بہت ہی کمزور ہو۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت متکلمین کے تو اکثر مسائل کمزور ہی ہیں مگر فلاں مسئلہ تو بہت ہی کمزور ہے۔ اس پر شاہ صاحب نے فرمایا کہ اچھا تم فلاسفہ کا مسئلہ لو اور ہم متکلمین کا، اور گفتگو کریں۔ انہوں نے عرض کیا کہ بہت اچھا۔ اس پر گفتگو ہوئی اور شاہ صاحب نے دونوں کو عاجز کر دیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ اچھا اب بتلاؤ، فلاسفہ کا کونسا مسئلہ سب سے کمزور ہے۔ اس پر انہوں نے عرض کیا کہ فلاں مسئلہ بہت کمزور ہے۔ اس پر شاہ صاحب نے فرمایا کہ اچھا اب تم متکلمین کا پہلو لو اور ہم فلاسفہ کا، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور شاہ صاحب نے اب بھی ان کو چلنے نہیں دیا۔ جب ہر طرح سے ان کو مغلوب کر دیا تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ میاں فضل حق اور میاں صدر الدین تم یہ نہ سمجھو کہ ہمیں معقول نہیں آتی بلکہ ہم نے ان کو ناقص اور واہیات سمجھ کر چھوڑ دیا ہے مگر انہوں نے ہمیں اب تک نہیں چھوڑا وہ ابھی تک ہماری قدم بوسی کئے جاتے ہیں"۔[1]

زہانت وفطانت و درس وتدریس:

علامہ فضل حق خیرآبادی نے تیرہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس دور کے قواعد کے مطابق والد محترم کے ارشاد پر درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ مولانا فضل امام کی خدمت میں حاضر ہونے والے طلباء کو علامہ فضل حق خیرآبادی ہی درس دیا کرتے تھے۔ مولانا سید غوث علی شاہ پانی پتی سے منقول ہے کہ " مولوی فضل امام نے ایک طالب علم سے فرمایا کہ میاں جاؤ، فضل حق سے سبق پڑھ لو۔ وہ آیا۔ غریب آدمی بدصورت بڑی عمر کا، کم علم، کند ذہن تھا۔ یہ نازک طبع، ناز پروردہ، جمال صورت ومعنی سے آراستہ چودہ برس کا سن وسال، ذہن فضیلت، ذہن میں جودت بھلا میل ملنے تو کیسے ملے، صحبت راس آئے تو کیونکر آئے، تھوڑا سبق پڑھایا تھا کہ بگڑ گئے۔ فوراً اس کی کتاب پھینک دی اور برا بھلا کہہ کر نکال دیا۔ وہ روتا ہوا مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا حال بیان کیا۔ فرمایا، بلاؤ اس خبیث کو۔ علامہ فضل حق صاحب آئے اور دست بستہ

۱۔ اشرف علی تھانوی، امیرالروایات۔ ص، ۳۸، ۳۹

کھڑے ہوگئے۔ مولانا نے ایک تھپڑ مارا ایسے زور سے کہ دستار فضیلت دور جا پڑی ۔ پھر فرمانے لگے۔

وہ کہ تو تمام عمر بسم اللہ کے گنبد میں رہا ۔ ناز و نعم سے پرورش پائی ۔ جس کے سامنے کتاب رکھی ، اس نے خاطر داری سے پڑھایا ۔ طالب علموں کی قدر و منزلت کو تو کیا جانے۔ اگر مسافت کرتا ، بھیک مانگتا اور طالب علم بنتا تو حقیقت معلوم ہوتی ۔ ارے ، طالب علمی کی قدر ہم سے پوچھ ۔ خبردار ، تم جانوگے اگر آئندہ ہمارے طالب علموں سے کچھ کہا "۔[1] علامہ صاحب چپ کھڑے روتے رہے اور کچھ دم نہ مارا ۔ آخر غصہ رفع دفع ہوا ۔ اسکے بعد علامہ فضل حق صاحب طالب علموں سے ہمیشہ شفقت و محبت اور دلجوئی سے پیش آتے۔

علامہ صاحب علوم عربی میں مہارت تامہ رکھنے کے ساتھ ساتھ درسی کتب ریاضی و منطق و ہیئت کے ایک ایسے بحر زخار تھے کہ جس کی امواج سے استفادہ کرنے والے مطمئن لوٹتے تھے ۔ " باغی ہندوستان " میں آپ کی ذہانت کی ایک انمٹ مثال موجود ہے کہ " شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے جب رد شیعہ میں " تحفہ اثنا عشریہ " محققانہ انداز میں تحریر فرمائی تو شیعان ہند کی طرح اہل تشیع ایران میں بھی ہیجان پیدا ہوا ۔ ایران سے میر باقر داماد " صاحب افق المبین " کے خاندان کا متبحر عالم ، مجتہد اونٹوں پر کتب فریقین لاد کر شاہ صاحب سے مناظرہ کے لیے دہلی پہنچا ۔ خانقاہ میں داخل ہونے پر شاہ صاحب نے فرائض میزبانی ادا فرماتے ہوئے قیام کے لیے مناسب جگہ تجویز فرما کر رخت سفر رکھوایا ۔ شام کو فضل حق حاضر ہوئے تو شاہ صاحب کو مصروف مہمان نوازی دیکھ کر کیفیت معلوم کی ۔ تھوڑی دیر حاضر خدمت رہ کر بعد مغرب مجتہد صاحب کی خدمت میں پہنچے ۔ مزاج پرسی کے بعد کچھ علمی گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا ۔ مجتہد صاحب نے پھر پوچھا وہ میاں صاحبزادے کیا پڑھتے ہو؟ عرض کیا ، شرح اشارات ، شفا اور افق المبین وغیرہم دیکھتا ہوں ۔ مجتہد صاحب کو بہت حیرت ہوئی ۔ " افق المبین " کی کسی عبارت کا مطلب پوچھ لیا ۔ علامہ نے ایسی مدلل تقریر کی کہ " صاحب افق المبین " پر متعدد اعتراضات کر گئے ۔ معزز مہمان نے اعتراضات کی

---

[1] ۔ مولانا گل حسن شاہ پانی پتی ، تذکرہ غوثیہ ۔ ص ۱۲۶ ، ۱۲۷

جواب دہی کی کوشش کی تو ان کے لیے جان چھڑانا اور بھی مشکل ہوگیا جب خوب عاجز کرلیا تو اپنے شبہات کے ایسے انداز میں جوابات دیے کہ تمام ہمراہی علماء بھی انگشت بدنداں ہوگئے۔ آخر آپ نے یہ اظہار بھی کر دیا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز کا شاگرد اور کفش بردار ہوں اور اظہار معذرت کرتے ہوئے رخصت ہوئے"۔[1] ایرانی عالم یہ سن کر بہت متاثر ہوا اور اندازہ کر لیا کہ اس خانقاہ کے بچوں کے علم و فضل کا جب یہ عالم ہے تو خود شیخ خانقاہ خدا جانے کیسا ہوگا ؟

گویا علامہ فضل حق صاحب ایک یگانہ روزگار عالم، عربی زبان کے مانے ہوئے ادیب و شاعر، علوم عقلی کے امام و مجتہد، بہت بڑے سیاست دان، مفکر اور مدبر تھے۔ علامہ صاحب اپنے اقدام و عمل کے نتائج بھگتنے کے لیے نہایت حوصلہ مندی اور دلیری کے ساتھ تیار رہتے تھے۔ "صاحب تذکرہ علمائے ہند" آپ کی ذہانت اور حسن بیانی کے بارے میں رقمطراز ہیں :

"دوازدہ صد و شصت و چہار ہجری مولف ہیچمدان بمقام لکھنؤ
بخدمتش رسیدہ دید کہ در عین حقہ کشی و شطرنج بازی تلمیذی
را سبق افق المبین میداد و مطالب کتاب را بو متعلم باحسن بیانی
دل نشین می شود"[2]

غرض کہ ۱۸۰۹ء سے لے کر ۱۸۵۸ء تک مسلسل پچاس برس تک سلسلہ تدریس جاری رہا۔ اس دوران میں فرائض ملازمت، امور سلطنت اور تصنیف و تالیف میں بھی مشغول رہے لیکن یہ تمام امور آپ کے سلسلہ تدریس میں کبھی بھی حائل نہ ہوئے۔

ملازمت :
======

مولانا فضل امام خیر آبادی کے انتقال کے وقت علامہ صاحب کی عمر اٹھائیس برس تھی۔ خاندانی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لیے دہلی کے محکمہ ریذیڈنٹ کے سررشتہ دار مقرر ہوگئے۔ کچھ عرصے بعد آپ نے ریذیڈنسی کمشنری میں اپنی تبدیلی کروا لی۔ نازک مزاجی کے باعث جب یہ ملازمت

۱۔ عبدالشاہد خان شروانی، باغی ہندوستان۔ ص ۳۲، ۳۲

۲۔ مولوی رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند۔ ص ۱۶۴، ۱۶۵

بھی راس نہ آئی تو استعفے پر ہی بات ختم ہوئی پھر نواب فیض محمد خان والئی جھجر نے پانچ سو روپے ماہوار پر نہایت عزت و احترام کے ساتھ اپنے پاس بلا لیا ۔ کچھ عرصہ جھجر میں قیام پذیر رہنے کے بعد مہاراجہ الور کی دعوت پر الور چلے آئے ۔ بعدازاں نواب ٹونک اور پھر ریاست رام پور میں ملازمت اختیار کرلی ، وہاں نواب یوسف علی خان نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ۔ آٹھ برس رام پور میں قیام کرنے کے بعد لکھنؤ کے صدر الصدور بنا دیے گئے ۔ جب ملک میں ابتری و انتشار کو فرو کرنے کے لیے ایک کچہری "حضور تحصیل" کے نام سے بنائی گئی تو علامہ فضل حق صاحب نے زمانۂ ملازمت میں تمام امور نہایت عمدگی ، ایمانداری اور دیانت داری سے سرانجام دیے۔

علامہ صاحب اور ان کے ہمعصر :

علامہ صاحب اپنے عہد کے متبحر عالم اور عربی کے بلند پایہ شاعر تھے ۔ ان کے ہمعصروں میں شاہ اسمٰعیل شہید ، حکیم مومن خان مومن اور مرزا نوشہ (غالب) بہت مشہور ہیں ۔ شاہ اسمٰعیل شہید اور علامہ صاحب امکان النظیر و امتناع النظیر ، رفع الیدین اور آمین بالجہر کے موضوعات پر اکثر بحث مباحثے کرتے رہتے تھے ، جن میں آخر کار شاہ صاحب بازی لے جاتے تھے ۔ اگرچہ مومن خان مومن اور مرزا غالب ، علامہ کے بہت قریبی اور قدیم دوست تھے لیکن قربت اور دوستی پر حق بات کو ترجیح دیتے تھے ۔ جیسا کہ امیر الروایات میں ہے کہ "جب شاہ اسمٰعیل صاحب اور علامہ فضل حق صاحب میں تحریری مناظرہ ہوتا تو شاہ اسمٰعیل کا قاعدہ تھا کہ جب آپ کے پاس علامہ فضل حق صاحب کی تحریر پہنچتی تو فوراً جواب دیتے اور بعض اوقات تو ایسا ہوا کہ آپ تیر رہے ہیں اور تیرنے کی حالت میں آپ کے پاس تحریر پہنچتی ، آپ نے تیرتے ہی تیرتے اس کا جواب لکھوا دیا ۔ ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ مومن خان اور مولوی فضل حق صاحب شطرنج کھیل رہے تھے اور مولوی فضل حق صاحب نے شاہ محمد اسمٰعیل کے پاس تحریر بھیجی تھی ۔ اتفاق سے ان کے شطرنج کھیلنے میں آدمی واپس آگیا ۔ مولوی فضل حق نے دریافت کیا کہ جواب لائے ۔ اس نے کہا کہ جواب نہیں دیا اور کہا فلاں وقت دوں گا چونکہ یہ بات شاہ اسمٰعیل صاحب کے طرز کے خلاف تھی ۔

اس لئے علامہ فضل حق صاحب نے سمجھا کہ اب شاہ اسمٰعیل عاجز ہوگئے اور یہ سمجھ کر کہا کہ بس دے لیا جواب - یہ بات مومن خان مومن کو ناگوار گذری - انہوں نے کہا کہ وہ بات ہی کہا، جس کا جواب مولانا صاحب نہیں دے سکتے - اس پر ان میں گفتگو شروع ہوگئی اور مومن خان مناظرہ میں غالب رہے - چونکہ گفتگو میں مزاج مکدّر ہوگیا تھا، اس لیے مومن خان یہ شعر کہہ کر چل دیے ---

١

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال دیں   مومن نہ ہو جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

جب علامّہ فضل حق صاحب نے دیکھا کہ مومن خان ناراض ہوگئے تو وہ ان کو منانے کے لیے گئے اور کچھ گفتگو ہو کر صلح ہوگئی ۔[٢]

بلند پایہ شاعر مرزا غالب بھی علامہ فضل حق کے قدیم دوست تھے - علامہ صاحب نے مرزا صاحب کی توجہ شاعری کے ساتھ ساتھ مذہبی بحثوں کی طرف بھی مبذول کی اور مرزا صاحب سے نہایت اصرار کے ساتھ فارسی میں وہابیوں کے خلاف مثنوی لکھنے کا وعدہ لیا، جس میں ان کے بڑے بڑے اور مشہور عقیدت مندوں کی تردید اور خاص طور پر شاہ اسمٰعیل کو مخاطب کر کے " امتناع النظیر خاتم النبیّن کے مسئلہ کو زیادہ شرح وبسط کے ساتھ بیان کرنے کی فرمائش کی - علامّہ صاحب، شاہ اسمٰعیل کی مخالفت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے - جب شاہ اسمٰعیل صاحب نے جامع مسجد دہلی کے تبرکات نبوی کے خلاف مسلمان قوم کو شرک و بدعت سے دور رہنے کے لیے وعظ و تذکیر کے ساتھ صحیح اسلامی توحید کا نقشہ پیش کیا تو دنیا طلب مولویوں کے گروہ میں آگ بھڑک اٹھی اور وہ سب آپ کی مخالفت پر آمادہ ہوگئے - جب وہ لوگ آپ کے خلاف کچھ نہ کر سکے تو انہوں نے ڈیڑھ ہزار دستخطوں پر مبنی ایک درخواست علامہ فضل حق صاحب کی تائید کے ساتھ انگریز حاکم کے سامنے پیش کی، جس میں شاہ اسمٰعیل ہی کامیاب رہے نتیجتاً" شاہ صاحب نے جہاد بالتطبیق بالکلسان کی بجائے جہاد بالسیّف کے وعظ کا آغاز کر دیا -

---

١- آرزو، علامہ فضل حق صاحب کا تخلص ہے -

٢- اشرف علی تھانوی، امیر الروایات - ص ۱۵۹، ۱۶۰

مولانا عبدالشاھد خان شروانی "باغی ھندوستان" میں علامّہ فضل حق خیرآبادی کی شاہ اسمٰعیل شہید سے مخالفت کا ذکر "تقویۃ الایمان" کے حوالے سے اس طرح کرتے ھیں کو اس کتاب میں افراط وغلو کے نتیجے میں مولانا کے جذبہ اصلاح اور وعظ وارشاد کی قدر کرنے والے اور پرانے ساتھی بھی مولانا کی مخالفت کیے بغیر نہ رہ سکے۔ اس موقع پر علامہ فضل حق صاحب بھی پہلوتہی اور خاموشی کو گناہ عظیم تصوّر کرتے ہوئے شاہ صاحب کے مخالف لوگوں میں شامل ہوگئے۔ شروانی صاحب نے اس بات کا اقرار بھی کیا ہے کہ کتاب میں شرک خفی کو شرک جلی میں لکھ دینے کا احساس خود مصنف کو بھی تھا تو کیا شروانی صاحب کا مقصد یہاں علامہ صاحب کی ذات گرامی کو اس بات سے بری کرنا ہے کہ انہوں نے شاہ اسمٰعیل صاحب کی مخالفت صرف اسی موقع پر ہی کی تھی حالانکہ جب وہ انگریز ریذیڈنٹ کے محکمہ میں سررشتہ داری کے عہدے پر فائز تھے تو انہوں نے بلا وجہ ہی آپ کی مخالفت کی تھی۔ عمر کے آخری ایام میں اس بات کا اعتراف، کہ تمام عمر شاہ اسمٰعیل صاحب کی مخالفت بغیر کسی معقول وجہ کے کرتے رہے "امیر الروایات" میں انہوں نے خود کیا ہے۔ مفتی عنایت احمد صاحب علامّہ فضل حق صاحب کے ساتھ رنگون میں ایک ہی جگہ مقید تھے۔ مفتی عنایت احمد نے رہا ہونے کے بعد ھندوستان آکر بیان فرمایا کہ "مولوی فضل حق صاحب بہت نادم تھے، روتے تھے اور فرماتے تھے کہ مجھ سے سخت غلطی ہوئی کہ میں نے مولوی اسمٰعیل صاحب کی مخالفت کی۔ وہ بے شک حق پر تھے اور میں غلطی پر تھا۔ مجھ پر جو یہ مصیبت پڑی ہے، یہ میرے انھی اعمال کی سزا ہے۔ میری مولوی اسمٰعیل سے دوستی تھی اور میں بھی ان کے ساتھ شہید ہوتا مگر کیا کہئیے۔ بدایوں والوں نے ابھار کر ان سے بھڑوا دیا اور میں علم کے غرہ میں حق کو باطل کرنے پر تل گیا۔ تم لوگ گواہ رہنا کہ میں اپنے خیالات باطلہ سے توبہ کرتا ہوں اور اگر میں رہا ہوگیا تو ابھی توبہ شائع کروں گا"۔[1]

۱۸۵۷ء کا غدر اور علامہ فضل حق خیرآبادی کا فتویٰ :

علامہ فضل حق صاحب اگرچہ خیرآباد میں پیدا ہوئے لیکن انہوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصّہ دھلی میں گذارا۔ زندگی کے آخری چند سال لکھنؤ میں صدر الصدور کے عہدے پر فائز رہے۔ وہاں کے

۱۔ اشرف علی تھانوی، امیر الروایات۔ ص، ۱۶۱

حالات دھلی سے بھی ابتر تھے - اس دوران میں مسجد ھنومان گڑھی (متصل اجودھیا) کا خونی واقعہ پیش آیا - مسلمانوں کو وہاں آذان دینے اور نماز پڑھنے سے روک دیا گیا - اگر کوئی مرد مجاھد نماز کا وقت ھونے پر آذان دینے کے لیے چلا جاتا تو اسے مار پیٹ کر لہولہان کرکے نکال دیا جاتا - آخرکار ذیقعد ۱۲۷۱ھ /جولائی ۱۸۵۵ء میں شاہ غلام حسین اور مولوی محمد صالح مسلمانان مجاھدین کے ایک گروہ کے ساتھ کفار کا مقابلہ کرنے کے لیے مسجد ھنومان گڑھی پہنچے - کفار سے زبردست مقابلہ ھوا نتیجتاً تمام مجاھدین مسجد کے اندر ذبح کر دیے گئے - جوتے پہن کر مسجد میں داخل ھوکر سنکھ بجائے گئے اور (نعوذ باللہ) قرآن پاک پرزہ پرزہ کرکے پاؤں سے مسلے گئے چنانچہ اس سنگین خونی حادثے کی اطلاع مولانا شاہ امیر علی ساکن امیٹھی کو ملی تو انہوں نے جوشیلی تقریروں کے ذریعے مسلمانوں کو جہاد کرنے پر آمادہ کرلیا - کفار کے خلاف جہاد میں حصّہ لینے والوں کے امیر المجاھدین امیر علی شاہ تھے - لہذا یہ مسلمان مجاھدین بھی سرکاری فوج کے ھاتھوں ختم ھوئے - اس اثناء میں علامہ فضل حق خیرآبادی ، مفتی سعد اللہ رام پوری اور مولوی محمد یوسف فرنگی محل نے مولوی امیر علی اور جہاد ھنومان گڑھی کے خلاف فتوی دیا مگر علامہ فضل حق خیرآبادی نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مردانہ وار حصہ لیتے ھوئے اس واقعے کی پوری پوری تلافی کر دی -

ھندوستان پر انگریز عرصے سے قابض تھے - مولانا فضل حق اپنے وطن عزیز کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ھوا دیکھ کر پریشان اور غمزدہ ھوجاتے تھے - علامّہ صاحب کے حساس دل اور دوررس نگاھوں نے ھندوستان اور ھندوستانیوں کے خلاف اس جذبہ نفرت وحقارت کا بخوبی جائزہ لے لیا تھا جو سامراجی ارباب حل وعقد انگلستان سے روانگی کے وقت لے کر چلتے تھے - کم وبیش ایک ھزار سال تک مسلمانوں نے بڑے جاہ وجلال اور عظمت وشوکت سے ھندوستان پر حکومت کی تھی لیکن بعد اب ھندوستان کی حکومت کو روبہ زوال وانحطاط کا سبّب حکومت برطانیہ کو سمجھتے تھے - علامہ صاحب مسلمانوں کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے ھر منظم اور باقاعدہ تحریک میں حصّہ لینے کے خواھش مند رھتے تھے - آزادی ~~وطن~~ وطن کی تحریک میں ھر ریاست کے والی کو ، خواہ وہ ھندو ھو یا مسلمان ، شامل کرنے کی کوشش کرتے رھتے - ۱۸۵۷ء کے ھنگامے کے وقت علامہ صاحب الور میں مقیم تھے - اگست ۱۸۵۷ء کو علامہ الور سے دھلی پہنچے - آگ اور دھوئیں کے بادل شروع ھو چکے تھے - قتل وغارت ،

فساد اور لوٹ کھسوٹ غیر معمولی باتیں بن گئی تھیں ۔ مسلمانوں کی دو جماعتیں جن میں ایک جماعت مجاہدین کی اور دوسری روہیلوں کی ، جو جنرل بخت خان کے ماتحت تھی ، دشمن سے لڑ رہی تھیں ۔ علامہ فضل حق نے جنرل بخت سے ملاقات کی اور باہمی مشورے سے جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد علماء کے سامنے تقریر کرتے ہوئے فتوی پیش کیا ، جس پر مفتی صدر الدین خان آزردہ صدر الصدور دھلی ، مولوی عبدالقادر ، قاضی فیض اللہ دھلوی ، مولانا فیض احمد بدایونی ، ڈاکٹر مولوی وزیر خان اکبرآبادی اور سید مبارک شاہ رام پوری نے دستخط کیے ۔ اس فتوے سے پورے ملک میں ہنگامہ اور فساد بڑھ گیا ۔ کمپنی کی فوج نے ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شہر دھلی پر حملہ کر دیا اور ۱۹ ستمبر کو پوری دھلی شہر پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا ۔ جنرل بخت خان اپنی فوج اور توپ خانہ کے ساتھ لکھنؤ روانہ ہو گئے ۔ اس دوران میں بے شمار لوگوں کو گولیوں سے اڑا دیا گیا ، کسی کو پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا گیا اور متعدد لوگ دھلی چھوڑ کر غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنے لگے ۔ علامہ فضل حق بھی فتوے کی بنا پر باغی قرار دیے گئے ۔ قید ہونے سے پہلے اہل و عیال کے ساتھ کچھ مدت چھپے رہے ۔ بالآخر جب ملکہ وکٹوریہ نے عفو عام کا اعلان کیا تو علامہ صاحب بھی اپنے وطن خیرآباد پہنچ گئے ۔ اپنے رسالہ الثورۃ الہندیہ میں فرماتے ہیں :

" فاعلا آن انہ لا ایمان لمن لیس لہ ایمان ، واشد یمین بعد الیمین ،
من لا یتدین بدین ولا یخاف یوم الدین " ۔[1]

خیرآباد میں چند روز تو نہایت سکون و اطمینان سے گزر گئے لیکن دو آدمیوں کے مخبری کرنے پر آپ کو آپ کے گھر سے گرفتار کر کے مقدمے کے لیے لکھنؤ بھیج دیا گیا اور ان پر سلطنت مغلیہ سے وفاداری یا فتوائے جہاد پر جرم بغاوت میں مقدمہ چلا ۔

" مولانا ممدوح موصوف کے فیصلہ کے لیے جیوری بیٹھی ۔ ایک اسیسر نے واقعات سن کر بالکل چھوڑنے کا فیصلہ کیا ، سرکاری وکیل کے مقابل خود مولانا بحث کرتے تھے بلکہ لطف یہ تھا کہ چند الزام اپنے اوپر خود قائم کیے اور پھر خود ہی مثل تار عنکبوت عقلی و قانونی ادلہ سے توڑ دیے ۔ جج یہ رنگ

---

۱ ۔ عبدالشاہد خان شروانی ، باغی ہندوستان ۔ ص ۲۱۶

دیکھ کر پریشان تھا اور ان سے ہمدردی بھی تھی۔ جج نے صدر الصدوری کے عہد میں مولانا سے کچھ عرصہ کام بھی سیکھا تھا۔ وہ مولانا کی عظمت اور تبحر سے بھی واقف تھا۔ وہ دل سے چاہتا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں۔ کرے تو کیا کرے۔ ظاہر یہ ہو رہا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں گے۔ سرکاری وکیل بھی لاجواب تھے"۔[1]

دوسرا دن آخری دن تھا۔ مخبر بھی عدالت میں موجود تھا۔ اس نے عدالت میں آنے کے خوف سے اور پھر علامہ کی پروقار اور بارعب شخصیت سے متاثر ہو کر یہ کہہ دیا کہ یہ وہ فضل حق نہیں لیکن علامہ صاحب نے اسکے بیان کی تصدیق و توثیق کرنے سے انکار کرتے ہوئے اس کے پہلے قول کی تائید کی اور فرمایا :

"پہلے اس گواہ نے سچ کہا تھا اور رپورٹ بالکل صحیح لکھوائی تھی۔
اب عدالت میں میری صورت دیکھ کر مرعوب ہو گیا اور جھوٹ بولا۔
وہ فتوی صحیح ہے، میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری
وہی رائے ہے"۔[2]

جناب علامہ صاحب کے اس اقرار سے انہیں حبس دوام بعبور دریائے شور کا حکم سنا دیا گیا۔ بعد ازاں جزیرہ انڈمان روانہ کر دیا گیا۔ آپ نے اپنے علم وفضل اور تصنیف و تالیف کی بدولت اس بے آباد جزیرہ کو بھی دارالعلوم بنا لیا۔

علامہ صاحب نے اپنی پوری زندگی امیرانہ ٹھاٹھ سے گذاری تھی اور اب قید میں انہیں غیر معمولی مصائب اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں آپ کو بارکوں کی صفائی کرنے اور کوڑا کرکٹ جمع کرکے پھینکنے پر مامور کیا گیا۔ فرماتے ہیں :

"میرے دشمن میری ایذا رسانی میں کوشاں ، اور میری ہلاکت کے

۱۔ عبدالشاہد خان شروانی ، باغی ہندوستان ۔ ص ۱۶۸
۲۔ ایضاً ۔ ص ۱۷۰

در پے رہتے ہیں - میرے دوست میرے مرض کے مداوا سے لاچار ہیں - دشمنوں کے دل میں میری طرف سے بغض و کینہ مذہبی عقائد کی طرح راسخ ہوگیا ہے - ان کے پلید سینے کینہ و عداوت کے دفینے بن گئے ہیں - ان ظاہری اسباب پر نظر کرتے ہوئے میں اپنی نجات سے مایوس اور اپنی امیدوں کو منقطع پاتا ہوں " - [1]

وفات :

انڈمان کی قید کے دوران میں آپ نے انگریز سپرنٹنڈنٹ کی فارسی کی کتاب ہیئت کی عبارت درست کر کے دی ، جس پر وہ بہت متاثر ہوا اور اس نے گورنمنٹ سے آپ کی رہائی کی سفارش کی - علامہ فضل حق کے صاحبزادے مولوی شمس الحق ، خواجہ غلام غوث بے خبر اور میر منشی لیفٹننٹ مغربی و شمالی صوبہ اودھ آپ کی رہائی کے لیے انتھک کوشش میں مصروف تھے - رہائی کے احکام ملتے ہی مولوی شمس الحق انڈمان روانہ ہوگئے - جہاز سے اتر کر شہر میں گئے تو ایک بہت بڑے مجمع کے ساتھ ایک جنازہ بھی دکھائی دیا - معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ یہ مولانا فضل حق خیر آبادی کا جنازہ ہے - علامہ صاحب ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ / ۱۹ اگست ۱۸۶۱ء کو اس جہان فانی سے کوچ کر گئے - (اناللہ و انا الیہ راجعون) مولوی شمس الحق بھی مایوسی کے عالم میں تدفین میں شریک ہوئے اور آخر کار ناکام وطن واپس لوٹے -

علامہ صاحب کی علمی و ادبی شہرت و عظمت:

علامہ فضل حق خیر آبادی علم معقول کے امام و مجتہد اور عربی ادب کے بہت بڑے ماہر فن تھے - علمائے ہند میں سے عربی نثر اور نظم دونوں میں کوئی آپ کا ثانی نہ تھا - شاعری میں عرب کے شعرائے متاخرین پر سبقت لے گئے تھے - عروض و علم شعر میں اعلیٰ مقام رکھنے کے باعث چار ہزار سے زیادہ اشعار کہے گویا آپ منطق و فلسفہ کے امام ہونے کے ساتھ ساتھ عربی ادب کے بلند پایہ ادیب اور

۱- عبدالشاہد خان شروانی ، باغی ہندوستان - ص، ۲۲۷، ۲۲۸

شاعر بھی تھے ۔ اس سلسلے میں مولانا گل حسن شاہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ "علامہ صاحب نے ایک قصیدہ عربی زبان میں امراء القیس کے ایک قصیدہ کی طرز پر لکھا اور مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کی خدمت میں سنانے کی غرض سے لے گئے ۔ شاہ صاحب نے ایک مقام پر اعتراض کیا ۔ اس کے جواب میں انہوں نے بیس شعر متقدمین کے پڑھ دیے ۔ مولوی فضل امام بھی اس وقت وہاں موجود تھے ۔ وہ فرمانے لگے کہ بس حد ادب ۔ علامہ نے جواب دیا کہ حضرت یہ کوئی علم تفسیر و حدیث تو ہے نہیں ، فن شاعری ہے ۔ اس میں بے ادبی کی کیا بات ہے ؟ شاہ صاحب نے فرمایا کہ برخوردار تم سچ کہتے ہو ، مجھ کو سہو ہوا تھا"۔[1]

دہلی میں علامہ فضل حق کے ہاں روزانہ صاحب علم وفضل اور باکمال لوگوں کی نشست رہتی تھی ۔ دہلی میں یہ دو مقام ایسے تھے ، جہاں پر علماء و شعراء کا اجتماع رہتا تھا ۔ ایک علامہ کے ہاں اور دوسرا مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی کے دولت کدے پر ۔ علامہ فضل حق خیرآبادی کے علمی دربار میں آٹھویں دن شعرائے دہلی کا اجتماع ہوتا تھا ۔ "بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر ، مولوی امام بخش صہبائی ، علامہ عبداللہ خان علوی ، حکیم مومن خان مومن ، مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی ، مرزا اسد اللہ خان غالب ، نواب ضیاء الدین خان نیّر ، شاہ نصیر الدین نصیر ، شیخ محمد ابراہیم ذوق ، حکیم آغا خان عیش ، حافظ عبدالرحمن خان احسان ، میر حسین تسکین اور خدا جانے کتنے سخن واران باکمال کا جمگھٹا رہتا تھا ۔ جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا"۔[2]

علامہ صاحب نے بچپن سے جوانی میں قدم رکھتے ہی اپنے آبائی وطن خیرآباد اور اقامتی وطن دہلی میں علمی و ادبی مجالس اور شعر و شاعری کی صحبتوں میں رہتے ہوئے فنون ادبیہ میں مکمل مہارت حاصل کر لی تھی ۔ سخن فہمی اور نکتہ رسی میں بلند مقام رکھتے تھے ۔ مولانا محمد حسین آزاد نے دیوان اردو کے انتخاب کا سہرا مولانا خیرآبادی اور مرزا خان کے سر باندھا ہے ۔ لکھتے ہیں :

---

۱ ۔ مولانا گل حسن شاہ پانی پتی ، تذکرہ غوثیہ ۔ ص ، ۱۲۷

۲ ۔ سید عبدالحئی لکھنوی ، گل رعنا ۔ ص ، ۲۳۰

"سن رسیدہ اور معتبر لوگوں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں ان کا دیوان بہت بڑا تھا، یہ منتخب ہے۔ مولوی فضل حق صاحب خیرآبادی فاضل بے عدیل تھے۔ ایک زمانہ میں دھلی کی عدالت ضلع میں سررشتہ دار ~~xxx~~ تھے۔ اسی عہد میں مرزا خان عرف مرزا خانی خان صاحب کوتوال شہر تھے۔ وہ مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ نظم و نثر فارسی اچھی لکھتے تھے غرضیکہ یہ دونوں باکمال مرزا صاحب کے دلی دوست تھے۔ انہوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مرزا نے کہا، اتنا کچھ کہہ چکا اب تدارک کیا ہو سکتا ہے؟ انہوں نے کہا، خیر جو ہوا سو ہوا۔ انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو مرزا صاحب نے دیوان حوالے کر دیا ـــــ دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا۔ وہ یہی دیوان ہے جو آج ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں"۔ [1]

علامہ صاحب کا علمی کمال نہ صرف اردو ادب میں جلوہ گر ہے بلکہ آپ نے عربی زبان میں حضور پاک کی مدح اور کفار کی ہجو میں قصائد لکھے اور مرثیوں میں بھی طبع آزمائی کی۔ اس کے ساتھ ساتھ فارسی زبان میں بھی یکتائے روزگار تھے اور فارسی شاعری کے لیے انہوں نے اپنا تخلص "فرقتی" رکھا۔ فصاحت و بلاغت اور روانئی سلاست میں بیسیوں خطوط، مضامین اور مقالات لکھے گویا آپ تمام علوم میں فاضل کامل اور متبحر عالم تھے۔ سرسید احمد خان علامہ صاحب کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

"مستجمع کمالات صوری و معنوی جامع فضائل ظاہری و باطنی بنا فضل و افضال بہار آرائے چمنستان کمال ـــــ مبطل باطل و محقق حق، مولانا محمد فضل حق جمیع علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہیں

۱۔ محمد حسین آزاد، آب حیات۔ ص، ۴۶۵، ۴۶۷

اور منطق وحکمت کی توگویا انھیں کے فکرِ عالی نے بنا ڈالی ہے۔ علمائے ہند میں فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس سرگروہ اہل کمال کے حضور میں بساط مناظرہ آراستہ کر سکیں۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ جولوگ اپنے آپ کو یگانہ فن سمجھتے تھے جب ان کی زبان سے ایک حرف سنا، دعوی کمال کو فراموش کر کے نسبت شاگردی کو اپنا فخر سمجھے۔ باین ہمہ کمالات علم وادب میں ایسا علم سرفرازی بلند کیا ہے کہ فصاحت کے واسطے ان کی عبارت شستہ مخفر عروج معارج ہے اور بلاغت کے واسطے ان کی طبع رسا دست آویز بلندی مدارج ہے۔ سحبان کو ان کی فصاحت سے سرمایہ خوش بیانی اور امراؤ القیس کو ان کے افکار بلند سے دستگاہ عروج معانی الفاظ پاکیزہ ان کے رشک گوہر خوش آب اور معانی رنگین ان کے غیرت لعل ناب ہیں"۔[1]

گویا مولانا ایک فخرِ روزگار کامل فاضل اور فلسفی تھے۔ آپ کی جودت طبع رسائی، ذہنی بلند خیالی اور دقیق النظری بے نظیر تھی۔"ایک دفعہ مولوی اکرام اللہ شہابی نے شمس العلماء مولانا عبدالحق سے پوچھا۔ بھائی صاحب دنیا میں حکیم کا اطلاق کن کن پر ہے۔ مولانا کہنے لگے، بھیا ساڑھے تین حکیم دنیا میں ہیں، ایک معلم اوّل (ارسطو) دوسرے معلم ثانی (ابو نصر فارابی) تیسرے والد ماجد مولانا فضل حق خیرآبادی اور نصف بندہ"۔[2]

تصانیف :
======

علامہ فضل حق خیرآبادی نے اپنی عمر کے پچاس برس درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں بسر کیے۔ اس دوران میں انہوں نے امور سلطنت اور فرائض ملازمت کو بھی بڑی تندہی اور ایمانداری سے سرانجام دیا لیکن بوجوہ گوں مصروفیات درس و تدریس اور معرکۃ الاراء تصنیفات کے

۱۔ سرسید احمد خان، آثار الصنادید۔ ص ۱۱۱
۲۔ مفتی انتظام اللہ شہابی، علامہ فضل حق خیرآبادی اور ان کے سیاسی کارنامے۔ ص ۲۷

سلسلہ میں کبھی بھی غافل نہ ہوئیں ۔ اگر ایک طرف آپ نے شاہانہ خلعت میں ملبوس ہو کر مختلف زبانوں میں کتب ورسائل کی تالیف کی تو دوسری طرف ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں خوفناک مصائب اور الم ناک حالات میں جزیرہ انڈمان میں محبوس فقیرانہ لباس میں ملبوس ہو کر بھی اپنے سلسلہ تصنیف کو نہ چھوڑا ۔ آپ کی تمام کتب میں ادبیت کی چاشنی اور فصاحت وبلاغت کی بلندی نمایاں ہے ۔ "باغی ہندوستان" میں آپ کی کتب کی حسب ذیل فہرست موجود ہے ۔

(۱) الجنس الغالی شرح جواہر الغالی (۲) حاشیہ افق المبین (۳) حاشیہ تلخیص الشفاء ۔

(۴) حاشیہ شرح مسلّم قاضی مبارک : اسکے معرکۃ الآراء مباحث کی فہرست "الثورة الہندیہ" میں موجود ہے ۔ اس کتاب کے بارے میں جزیرہ انڈمان میں بعض اسیر فرنگ علماء نے دریافت کیا کہ ہندوستان میں کیا یادگار چھوڑی ہے فرمایا دو یادگاریں چھوڑ کر آیا ہوں ۔ ایک حاشیہ شرح سلّم قاضی مبارک گوپاموی اور دوسری یادگار برخوردار عبدالحق "[۱]

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ صاحب اپنی تصنیف پر کس قدر فخر کرتے تھے ۔

(۵) الہدیۃ السعیدیۃ فی الحکمۃ الطبیعیۃ : یہ فلسفہ اور حکمت کے موضوع پر ایک عمدہ اور مستند تصنیف ہے ۔ اس کتاب میں زمین کی حرکت پر شرح وبسط کے ساتھ براہین قائم کرنے کے بعد موجودہ سائنس کی تحقیقات کو غلط ثابت کرکے مخالفین کے دلائل کو مسترد کر دیا ہے ۔ یہ کتاب ایک مقدمہ اور تین فنون پر مشتمل ہے اور آج تک ہند اور بیرون ہند میں داخل نصاب ہے ۔ اس کتاب کا نام والئی رام پور نواب محمد سعید خان کے نام پر رکھا گیا اور اسکی تصنیف کا سبب بھی نواب صاحب ہی تھے ۔

(۶) رسالہ تشکیک ماہیات (۷) رسالہ کلی طبعی (۸) رسالہ علم و معلوم (۹) روض المجود فی تحقیق حقیقۃ الوجود (۱۰) رسالہ قاطیغوریاس (۱۱) رسالہ تحقیق حقیقۃ الاجسام ۔

(۱۲) رسالہ الثورة الہندیہ ۔

(۱۳) قصائد فتنۃ الہند : یہ رسالہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے درد انگیز تاریخی واقعات ، المناک حادثات ، مجاہدین کی جلا وطنی ، جبر دوام بہ عبور دریائے شور ، مردوں ، عورتوں اور بچوں

---

۱ ۔ عبدالشاہد خان شروانی ، باغی ہندوستان ۔ ص ، ۱۰۰

کا قتل عام اور مسلط حکومت کے مظالم کی دل ہلا دینے والی خونی داستان ہے ، جسے علامہ فضل حق صاحب نے جزیرہ انڈمان میں حالت محبوسی میں مختلف کاغذ کے پرزوں اور کپڑوں پر کوئلہ وغیرہ سے لکھا تھا اور جناب مفتی عنایت احمد کاکوروی (م ۱۲۷۷ھ) کی رہائی پران کے ساتھ اپنے خلف الرشید مولانا عبدالحق خیرآبادی کے پاس بھیج دیا تھا ۔ اس رسالہ میں "قصائد فتنۃ الہند" کو بڑی محنت وکاوش سے مرتب کیا تھا ۔ ان دو عربی قصائد (ہمزیہ اور دالیہ) میں اس وقت کے ہولناک مصائب اور نصاریٰ کے خوفناک عزائم کا ذکر کرتے ہوئے علمائے مجاہدین کے اعلان جہاد کو وقت کی اہمیت کے مطابق اشد ضروری قرار دیا ہے گویا الثورۃ الہندیہ اور قصائد فتنۃ الہند آپ کے علمی وادبی شاہکار ہیں ۔

(۱۴) مجموعۃ القصائد (۱۵) امتناع النظیر ۔ (۱۶) تحقیق الفتوی فی ابطال الطغوی ۔

مندرجہ بالا تصنیفات میں چار پانچ کے علاوہ باقی سب غیر مطبوعہ ہیں ۔ "الثورۃ الہندیہ" میں شروانی صاحب نے ان سولہ تصنیفات کا ذکر کیا ہے جب کہ تاریخ ادبیات عربی جلد دوم میں علامہ صاحب کی ۲۳ کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے ۔

اخلاف :

علامہ فضل حق خیرآبادی نے دو شادیاں کی تھیں ۔ پہلی بیوی کے بطن سے تین صاحبزادیاں اور ایک صاحبزادہ یعنی شمس العلماء مولانا عبدالحق اور دوسری اہلیہ سے دو صاحبزادے ، مولوی شمس الحق اور مولوی علاء الحق تھے ۔

حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی

قطب العالم مجدد دین وملت سید احمد شہید ، شاہ ولی اللہ کی وفات کے چوبیس سال[۲۲] بعد صفر ۱۲۰۱ھ / نومبر ۱۷۸۶ء میں رائے بریلی (اودھ) کے تقدس وبزرگی میں مشہور اور علم وتقوی میں ممتاز خاندان حسنی سادات میں پیدا ہوئے ۔ یہ پورا خاندان طہارت اخلاق ، پاکیزگی عمل ، صبر وتوکل ، ریاضت وعبادت ، زہد وتقوی ، جہاد وغزا اور دیگر فضائل ومحاسن میں برصغیر کے

برگزیدہ اور نامور خاندانوں میں شہرت رکھتا ہے ۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت حسن مجتبیٰ بن علی کرم اللہ وجہہ تک اس طرح پہنچتا ہے ۔

" سید احمد شہید بن سید محمد عرفان بن سید محمد نور بن سید محمد ہدیٰ بن سید شاہ علم اللہ بن سید محمد فضیل بن سید محمد معظم بن سید احمد بن قاضی سید محمود بن سید علاء الدین بن سید قطب الدین محمد ثانی بن سید صدر الدین ثانی بن سید زین الدین بن سید احمد بن سید علی بن سید قیام الدین بن سیّد صدر الدین بن قاضی سید رکن الدین بن امیر سیّد نظام الدین بن امیر کبیر سید قطب الدین محمد حسنی المدنی الکّرمی بن سیّد رشید الدین احمد مدنی بن یوسف بن سیّد عیسیٰ بن سیّد حسن بن سیّد ابی الحسین بن ابی جعفر بن قاسم بن ابی محمد عبداللہ بن سیّد حسن الاعور الجواد نقیب کوفہ بن سیّد محمد ثانی بن ابی محمد عبداللہ الاشتر بن سید محمد صاحب النفس الزکیہ بن عبداللہ المحض بن حسن مثنیٰ بن امام حسن بن امیر المومنین سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ "۔[1]

سید احمد کے مورث اعلیٰ " سید قطب الدین " صاحب علم وفضل اور نہایت قوی وبہادر تھے۔ آپ ساتویں صدی ہجری کے آغاز میں مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ دہلی تشریف لائے اور قنوج ، مانک پور اور کڑا ہ آباد پر حملہ کرکے ان علاقوں کو اسلامی سلطنت میں شامل کر دیا ، پھر کڑا ہ آباد میں ہی مستقل سکونت اختیار کرلی ۔ سید قطب الدین کے انتقال کے بعد یہ خاندان کڑا ہ سے رائے بریلی کے ایک قصبہ جائس اور پھر جائس سے چار میل کے فاصلے پر نصیر آباد میں منتقل ہوگیا ۔ سید قطب الدین کی اولاد میں آپ کے سعادت مند فرزند سید تاج الدین ،ان کے صاحبزادے سید رکن الدین اور پھر شاہ علم اللہ بڑے مشہور و معروف بزرگ تھے ۔ شاہ علم اللہ کی نسل میں دیگر بزرگوں کے علاوہ سید نعمان اور سید عرفان علم وفضل ، زہد وتقوی اور اصلاح خلق کے اعتبار سے بہت مشہور تھے ۔ سید احمد شہید انہی سید عرفان رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر فرزند تھے ۔

ابتدائی تعلیم :

خاندانی رسم ورواج کے مطابق چار سال ، چار مہینے اور چار دن کی عمر میں آپ کو تحصیل

1- سید محمد علی ، مخزن احمدی - ص، ۱۲

علوم کے لیے مکتب میں بٹھا دیا گیا لیکن تین سال کی مسلسل کوشش اور ہمت کے بعد بھی آپ نے اپنی توجہ تعلیم کی طرف مبذول نہ کی۔ اس عرصہ میں لگاتار محنت کے بعد آپ قرآن پاک کی چند سورتوں کے علاوہ کچھ بھی یاد نہ کر سکے۔ اس سلسلہ میں صاحب "نزھۃ الخواطر" رقمطراز ہیں کہ "علم متداولہ کا آپ کو شوق نہ تھا۔ قرآن پاک میں سے اس کی چند سورتوں کے علاوہ کچھ بھی یاد نہ ہوا۔ تحریر کا یہ حال تھا کہ صرف مفردات اور مرکبات لکھ لیتے۔ یہ حالت ابتدائی تین سال تک رہی۔ آپ کے بڑے بھائی اسحاق بن عرفان بریلوی کو اس کا بڑا دکھ ہوتا تھا۔ وہ آپ کسی تعلیم میں کوشاں رہتے لیکن آپ کے والد نے فرمایا کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو اور خدا پر توکل کرو چنانچہ انہوں نے اس طرف سے توجہ ہٹا لی"۔[1] اس کے بعد تو سید صاحب کا سلسلہ تعلیم وقتی طور پر منقطع ہو گیا۔

بچپن میں مردانہ کھیل اور مشاغل :
=====================

سید صاحب کو بچپن میں کھیلوں کا بہت شوق تھا۔ کبڈی، شہ زوری، سپہ سالاری، تیراکی اور غزا وجہاد میں فطری طور پر بہت دلچسپی لیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ اپنے ساتھیوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیتے اور ایک گروہ دوسرے گروہ کے قلعے پر حملہ کرتا۔ "تواریخ عجیبہ" میں ہے کہ "بستی کے ہم سن لڑکوں میں سے ایک لشکر اسلام جمع کر کے بطور جہاد بآواز بلند تکبیر کہتے ہوئے ایک فرضی لشکرِ کفار پر حملے کیا کرتے تھے اور وہ "مارا" "یہ فتح ہوا" کی صدائیں لشکر اطفال سے بلند ہوتی تھیں"۔[2] اس واقعہ سے سید صاحب کے پوشیدہ عزائم اور فطری جوہروں کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ سید صاحب نے ان تمام کھیلوں کے ذریعے غیر معمولی جسمانی قوت حاصل کر لی تھی۔ شوق جہاد کے ساتھ ساتھ خدمت خلق کا جذبہ بھی آپ کی طبیعت میں راسخ ہو چکا تھا۔ ضعیفوں، اپاہجوں، بیواؤں اور بوڑھوں کے گھروں میں جا کر ان کے احوال دریافت

۱۔ سید عبد الحئی لکھنوی، نزھۃ الخواطر ۔ جلد ۔ ۷، ص ۲۸۰

۲۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری، تواریخ عجیبہ ۔ ص، ۲

کرنا ، ان کا سودا سلف لا کر دینا اور جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر انہیں پہنچانا ، یہ تمام امور آپ کی زندگی میں معمول کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ اپنے اس نمایاں وصف میں چھوٹے بڑے ، امیر وغریب ، شریف ورذیل سب کا برابر خیال رکھتے اور بیتامی و مساکین کی خدمت میں ہمہ تن مصروف رہتے۔ شوق جہاد اور خدمت خلق کے ساتھ ساتھ اپنے خالص علمی و دینی ماحول کے مطابق ذوق عبادت بھی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا تھا ۔ گویا رات کو تہجّد کے لیے قیام کرتے تو دن کو تلاوت ، دعا ، مناجات اور قرآن پاک میں تفکر وتدبّر فرماتے اور بستی کے لوگوں کی خدمت کو اپنا شعار بناتے۔

سفر لکھنؤ و دہلی :

سید صاحب کے والد گرامی (متوفی ۱۲۱۲ھ) کی وفات کے وقت آپ کی عمر تقریباً چودہ برس تھی ۔ اٹھارہ برس کی عمر میں احباب واقربا کی سات افراد پر مشتمل جماعت کے ساتھ بظاہر تلاش و معاش کے لیے لکھنؤ روانہ ہوگئے لیکن حقیقتاً ان کا مقصد شاہ عبدالعزیز سے ملاقات تھی۔ اس قافلے کے ارکان کے پاس صرف ایک سواری تھی ، جس سے سات آدمیوں کا سفر طے کرنا ناممکن تھا چنانچہ آپ نے اس سفر میں سب کا سامان سر پر رکھا اور پا پیادہ لکھنؤ پہنچ گئے ۔ سید صاحب اور ان کے ساتھیوں نے بڑی تنگ دستی اور تکلیف میں چار ماہ تک لکھنؤ میں قیام کیا ۔ اس اثنا میں آپ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ محمدی جنگل میں سے گزرتے ہوئے اپنے قافلے سے ارادتاً بچھڑ گئے ۔ آپ نے تحصیل علم کے شوق میں پا پیادہ دہلی کا سفر اختیار کیا ۔ اس سے قبل سیّد صاحب نے بچوکش مرتبہ گھر والوں سے شاہ عبدالعزیز کا ذکر سنا تھا چنانچہ دہلی پہنچتے ہی سب سے پہلے شاہ عبدالعزیز کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے ۔ شاہ صاحب نے مصافحہ اور معانقہ کے بعد نہایت شفقت و محبّت سے اپنے پہلو میں بٹھا کر دریافت فرمایا کہ کہاں سے تشریف لائے ہیں ؟ آپ نے فرمایا کہ رائے بریلی کے سادات خاندان سے تعلق رکھتا ہوں ، پھر شاہ صاحب نے استفسار فرمایا کہ سید ابو سعید اور سید ابو نعمان سے واقف ہو ، آپ نے کہا کہ سید ابو سعید میرے نانا اور سید ابو نعمان میرے حقیقی چچا تھے ۔ شاہ صاحب نے یہ بات سنتے ہی دوبارہ گرمجوشی سے مصافحہ و معانقہ کیا اور

پھر پوچھا کہ اتنے لمبے سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے کی کیا غرض تھی ، تو سید صاحب نے جواب دیا کہ آپ کی ذات مقدس کو غنیمت سمجھ کر اللہ تعالی جل شانہ کی طلب میں یہاں پہنچا ہوں ۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ تمہارے مقدس خاندان میں منصب ولایت موروثی ہے اور تم اپنی پدری اور مادری وراثت حاصل کرلوگے ۔ اس کے بعد شاہ عبدالعزیز نے آپ کو ایک خادم کے ساتھ ترجمان القرآن شاہ عبدالقادر کے پاس اکبرآبادی مسجد میں بھیج دیا ۔ سید صاحب نے شاہ عبدالقادر سے صرف ونحو کی عربی وفارسی کتب کے علاوہ قرآن پاک کا ترجمہ بھی پڑھا ۔ علاوہ ازیں آپ نے عربی اور فارسی لکھنے ، پڑھنے اور بولنے میں مہارت تامہ حاصل کرلی تھی ۔ مدرسہ میں کچھ دن شاہ اسمٰعیل سے بھی کوئی کتاب[1] پڑھی تھی ۔ اسرار دین اور رموز معرفت میں یگانۂ روزگار ہونے کے بعد آپ نے ایک شب جمعہ کو سرگروہ علمائے امام ، جامع کمالات صوری ومعنوی اور خادم حدیث شریف نبوی شاہ عبدالعزیز کے دست حق پر بیعت کا شرف حاصل کیا اور شاہ صاحب سے صوفیاء کے تین سلسلوں نقشبندیہ ، قادریہ اور چشتیہ کے طریقوں کی تربیت حاصل کرلی ۔ اس کے بعد ایک مدّت تک مسجد اکبرآبادی کے ایک حجرے میں ذکر و اشغال اور ریاضت وعبادت میں مصروف رہتے تھے ۔ یہاں تک کہ نفس کشی کے تمام مراحل سے نہایت خوش اسلوبی سے گزر گئے ۔ اسی دوران میں آپ پر بیداری اور خواب کی حالت میں انعامات الہیہ سے بہت بلند مقامات حاصل ہوئے مثلاً " آپ کا رسول پاک اور حضرت ابوبکر کی جسمانی زیارت کرنا ، رسول پاک کا خواب میں آپ کو کجھور کھلانا ، حضرت علی کا آپ کو غسل دینا اور باری تعالی کو خواب میں دیکھنا گویا باطنی و روحانی دولت سے مالا مال ہونا تھا ۔ ڈھائی برس تک شاہ عبدالقادر کے پاس اکبرآبادی مسجد میں رہے پھر شاہ صاحب آپ کو شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے اور فرمایا کہ " سید احمد حاضر ہیں ، ان کو پرکھ لیجئے ۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ میاں عبدالقادر تم جو کچھ کہتے ہو ، ٹھیک ہے ۔ اب ان کو بیعت کی اجازت دے دو ۔ شاہ عبدالقادر نے عرض کیا کہ آپ ہی اجازت دیں گے اور سلسلہ بھی آپ سے ہی چلے گا چنانچہ شاہ صاحب نے بیعت

۱۔ اکثر مستند کتب میں "کوئی کتاب" کا ہی ذکر کیا گیا ہے ۔ کہیں بھی کتاب کے نام کی وضاحت نہیں کی گئی ۔

کی اجازت دے دی "۔[1]

تشنگی علم کو بجھانے اور باطنی و روحانی دولت حاصل کرنے کے بعد سید صاحب اپنے وطن رائے بریلی پاپیادہ واپس پہنچے ۔ وطن پہنچ کر اپنے مورث اعلیٰ شاہ علم اللہ کی مسجد میں قیام پذیر ہوئے ۔ آپ سید صاحب کے بیان میں بلا کی تاثیر ، زبان ذکر الٰہی سے آراستہ اور بذات خود فیوض روحانی کا مجسمہ پیکر تھے ۔ رائے بریلی میں دو سال کے قیام کے دوران میں آپ نہایت خوبی اور عمدگی سے شب و روز قرآن و حدیث کا درس دیتے رہے ۔ اسی مدت میں عزّا واقربا نے آپ کی شادی آپ کے خاندان کی ایک لڑکی سیّدہ زہرہ سے کر دی ۔ دو سال وطن میں گزارنے کے بعد آپ واپس دہلی روانہ ہوگئے ۔ روحانی و باطنی فیوض کے بعد اب دوسرے مقصد کی تکمیل بھی ایک بہت ضروری مرحلہ تھا چنانچہ شاہ صاحب اپنے مقصود اعلیٰ یعنی اسلامیت کے احیاء کی خاطر جہاد کے لیے تربیت کے عملی پہلوؤں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے تھے ۔ اس غرض سے آپ شاہ عبدالعزیز کی اجازت سے نواب امیر خان والئی ریاست ٹونک کے لشکر میں شامل ہوگئے ۔ حضرت سید احمد نواب امیر خان کے لشکر میں تقریباً سات سال تک رہے ۔ اس مدت میں آپ نواب صاحب کو اپنے عظیم ترین مشورں سے نوازتے رہے ۔ آخرکار نواب صاحب کی انگریزوں سے صلح پر سید صاحب نے نہایت مایوسی کے عالم میں لشکر سے علیحدگی اختیار کرلی اور حضرت شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں لکھا کہ " خاکسار قدم بوسی کو حاضر ہوتا ہے ، یہاں لشکر کا کارخانہ درہم برہم ہوگیا ۔ نواب صاحب انگریزوں سے مل گئے ، اب یہاں رہنے کی کوئی صورت نہیں ۔ "[2]

آپ کے دہلی پہنچنے سے ایک ہفتہ قبل شاہ عبدالعزیز نے ایک خواب دیکھا کہ " آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جامع مسجد دہلی میں تشریف لائے ہیں اور لوگ جوق در جوق زیارت کے لئے دور دور سے آ رہے ہیں ، سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شاہ صاحب کو شرف باریابی عطا فرمایا اور عصا مبارک دے کر فرمایا کہ اس عصا کو لے کر مسجد کے دروازہ پر بیٹھ جاؤ اور جو اندر آنا چاہے،

۱۔ امیر شاہ خان ، ارواح ثلاثہ ۔ ص ۱۲۲

۲۔ ابوالحسن علی ندوی ، سیرت سید احمد شہید ۔ ص ۷۷

اندر آکر اس کا حال عرض کرو اور میری اجازت سے اندر بھیجو ۔ شاہ صاحب نے اسکی تعمیل کی اور ہزارہا بندگان خدا نے حضور کی زیارت کی "۔[1] صبح اٹھ کر شاہ صاحب نے سب سے پہلے حضرت شاہ شمس الدین المعروف مرزا مظہر کے خلیفہ حضرت شاہ غلام کی خدمت میں حاضر ہوکر خواب کی تعبیر چاہی ۔ شاہ غلام علی نے خواب کی تعبیر یہ بتائی کہ مخلوق خدا کے فیض رشد و ہدایت کا سلسلہ آپ سے یا آپ کے مریدوں میں سے کسی کے ذریعے جاری ہوگا لہذا ایک ہفتہ بعد سید صاحب کے امیر خان کے لشکر کو چھوڑ کر دھلی وارد ہونے پر حضرت شاہ عبدالعزیز کے خواب کی تصدیق ہوگئی۔ دھلی پہنچ کر آپ اکبرآبادی مسجد میں فروکش ہوئے ۔ اس وقت تک شاہ عبدالقادر صاحب اس جہان فانی کو الوداع کہہ چکے تھے چنانچہ یہاں اب سید صاحب کا نصب العین مسلمانوں کو حقیقی معنوں میں مسلمان بنانے اور جہاد فی سبیل اللہ کی روح کو زندہ کرنے کا تھا ۔ آپ نے شیخ الاسلام حضرت عبدالحئی اور حجۃ الاسلام حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہید کو یکے بعد دیگرے دو رکعت نماز پڑھائی ، جس کے بعد ان دونوں حضرات نے مرشد عالم شاہ عبدالعزیز کی زندگی میں ہی سید صاحب کی علمی استعداد اور قابلیت سے متاثر ہوکر آپ کے دست حق پرست پر بیعت کرلی ۔ اس کے بعد شاہ صاحب کے خاندان کے افراد ، شاہ اسحاق ، شاہ محمد یعقوب ، حکیم مغیث الدین ، مولانا وجیہہ الدین صاحب ، حافظ معین الدین اور ان کے فرزندوں نے آپ کی بیعت کرنے کے بعد آپ کا دامن مضبوطی سے تھام لیا ۔ اس کے بعد آپ نے رشد و ہدایت کے سلسلے کو وسیع کرنے اور زیادہ سے زیادہ افراد کو فیض پہنچانے کی غرض سے علم و فضل کے بحر زخاشر حضرت شاہ اسمٰعیل اور حضرت مولوی عبدالحئی کو درس و وعظ کا حکم دیا۔ ان دونوں بزرگوں کی وعظ و تبلیغ سے آپ کی مقبولیت و شہرت بڑھتی گئی ۔ یہاں تک کہ دور دراز کے علاقوں سے آپ کو دعوت نامے آنے شروع ہوگئے ۔ آپ نے شاہ عبدالعزیز کی اجازت سے اپنے مریدان خاص اور چند عقیدت مندوں کو ساتھ لے کر دھلی سے سہارنپور ، میرٹھ ، مظفرنگر ، دیوبند ، گنگوہ ، نانوتہ کاندھلہ اور لہاری تک کا تبلیغی اور اصلاحی دورہ کیا ۔ اس دوران میں آپ نے مختلف علاقوں میں مسلمان قوم کو حکومت اسلامیہ کی تاسیس ، احیائے اسلامیت اور اغیار کے تسلط کو ختم کرنے کے لیے جہاد

---

۱ ۔ ابوالحسن علی ندوی ، سیرت سید احمد شہید ۔ ص ۷۸ ،

فی سبیل اللہ کے آغاز کی دعوت دی ۔ آپ کے اس دورے میں سینکڑوں خاندانوں اور ہزاروں عقیدت مندوں نے شرک وبدعات اور رسوم قبیحہ سے توبہ کرتے ہوئے آپ کی بیعت کی ۔ اس کے بعد آپ واپس دہلی تشریف لائے ۔ یہاں اپنے بھائی سید اسحاق کے انتقال کی خبر سن کر سخت مغموم ہوئے اور تقریباً دس سال کے عرصہ کے بعد اپنے وطن لوٹنے کا ارادہ کیا چنانچہ ستر اسی ۷۰/۸۰ افراد کے قافلے کے ہمراہ رام پور ، الٰہ آباد ، بنارس ، کان پور اور لکھنؤ میں قیام کرتے ہوئے رائے بریلی پہنچے ۔ ان تمام مقامات پر علماء ومشائخ ، امراء و رؤسا اور فوجی سردار آپ کی وعظ ونصیحت سے فیض یاب ہوکر مشرکانہ رسوم کو ترک کرنے اور صوم وصلوٰۃ کی پابندی کرنے کا عہد کرتے ہوئے جوق در جوق آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے ۔ رائے بریلی میں دو سال قیام کے دوران میں آپ نے بے شمار اصلاحی وتبلیغی کارنامے سرانجام دیئے ، جن میں پیر پرستی ، قبر پرستی ، سوئم ، چہلم ، شادی میں ہندوانہ رسوم اور بے جا اسراف کو ختم کرنے کے علاوہ بیوہ عورت کے نکاح ثانی کا اجراء اور شیعہ سنّی حضرات کے درمیان تعصّب کی بنا پر اختلاف کی خلیج کو دور کرنا خاص اہمیت رکھتے ہیں ۔ اس عرصہ میں آئندہ جہاد کے لیے لوگوں کو فنون جنگ سیکھنے اور ان کی مشق کرنے کی طرف متوجّہ کیا گویا اب سلوک کے کاموں کی بجائے فنون حرب کی تعلیم کا سلسلہ وسیع پیمانے پر شروع ہو چکا تھا ۔

سفر حج اور مراجعت:

سید صاحب حج سے قبل جہاد کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اب یکم شوال ۱۲۳۶ھ / ۱۸۲۰ء کو نماز عید ادا کرنے کے بعد چار سو مردوں اور عورتوں کے قافلے کے ہمراہ حج کے ارادے سے رائے بریلی سے روانہ ہوئے ۔ سفر میں جب کسی قصبہ میں قیام کرتے تو ہزاروں لوگ آپ سے بیعت لینے کے لیے آپ کے منتظر ہوتے ۔ کلکتہ سے روانگی کے وقت آپ کے قافلے کی تعداد تقریباً ۸۰۰ کے قریب پہنچ چکی تھی ۔ ۲۸ شعبان ۱۲۳۷ھ کو یہ قافلہ مکّہ معظمہ پہنچ گیا ۔ رمضان اور عید الفطر آپ نے مکہ معظمہ میں ہی گزارے ۔ آٹھ ۸ ذی الحجہ سے دس ۱۰ ذی الحجہ تک آپ مناسک حج کے ادا کرنے میں مصروف رہے ۔ ۱۰ صفر ۱۲۳۸ھ میں سید صاحب نے مدینہ منورہ کے لیے رخت سفر باندھا ۔ مدینہ میں پچیس

روزہ قیام کے دوران میں بارگاہ نبوی پر حاضری دینے کے علاوہ متبرک اور تاریخی مقامات کی زیارت کی ۔ ۲۶ ربیع الاول کو آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ آلہ و سلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ بڑی مہربانی سے مسکرا کر فرماتے ہیں " احمد اب تم کو جلد مکۃ چلے جانا چاہیئے ، اس لیے کہ سردی سے تمہارے قافلے کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے " ۔[1] چنانچہ ۲۹ ربیع الاول ۱۲۳۹ھ کو یہ قافلہ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوا ۔ مکہ مکرمہ پہنچ کر عمرہ و طواف کیا اور ۱۵ شوال کے بعد دیار حبیب کو الوداع کہہ کر تقریباً دو سال گیارہ ماہ بعد ۲۹ شعبان ۱۲۳۹ھ کو بخیریت و عافیت اپنے وطن رائے بریلی پہنچ گئے ۔ حرمین شریفین میں آپ کے قیام کے دوران میں بڑے بڑے علماء و عمائد دین نے آپ کی بیعت کی ۔ اس پورے سفر میں مولانا عبدالحئی اور شاہ اسمٰعیل شہید آپ کے ہمراہ رہے ۔ سفر حج کے بعد سید صاحب ہندوستان کو غلامی سے نجات دلانے اور پنجاب و سرحد کے مسلمانوں کو سکھوں کے ظلم و ستم سے بچانے کے لیے جہاد کے لیے سر و سامان کی تیاری میں ہمہ تن مصروف ہو گئے ۔ ۱۲۴۱ھ میں آپ نے اقامت جہاد کے لیے اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ وطن سے ہجرت کی ۔ راجپوتانہ ، رواڑ ، سندھ ، بلوچستان ، افغانستان اور صوبہ سرحد کے کھلے ریگستانوں ، وسیع میدانوں ، بلند پہاڑوں تنگ دروں ، پرخطر جنگلوں اور موجیں مارتے ہوئے دریاؤں میں سے سفر طے کیا اور ہر جگہ توحید و سنت اور عقائد صحیحہ کی اشاعت و تبلیغ کرتے رہے ۔ سید احمد اور ان کے ساتھیوں کے جہاد کا ذکر " تحریک جہاد " کے باب کے تحت ہوگا ۔

شہادت :

حضرت سید احمد شہید اور ان کی جماعت مجاہدین بالاکوٹ میں جہاد فی سبیل اللہ کرتے ہوئے سکھ فوج کے گھیرے میں آ گئی اور اسی لڑائی میں سید احمد شہید نے ۲۴ ذیقعد ۱۲۴۶ھ/مئی ۱۸۳۱ء میں میدان جنگ میں بہادری سے لڑتے ہوئے جام شہادت نوش فرمایا ۔ (انا للہ و انا الیہ راجعون) آپ کو بالاکوٹ میں دفن کیا گیا ۔

۱۔ سید محمد علی ، مخزن احمدی ۔ ص ، ۱۰۷

سید احمد شہید کی شخصیت :

سید احمد شہید بڑے روحانی پیشوا اور قابل و فصیح شعلہ بیان مقرر تھے ۔ آپ کے وعظ و تقریریں سن کر ہزاروں لوگ آپ کے مریدوں کے حلقہ میں شامل ہو گئے تھے ۔ اگرچہ سید صاحب کسی علمی درسگاہ کے فارغ التحصیل اور سند یافتہ نہ تھے لیکن پھر بھی دینی علوم میں غیر معمولی بصیرت رکھتے تھے ۔ آپ نے ہندوستان سے بدعات و محدثات کو ختم کرنے اور اصلاح عقائد و رسوم کے لیے پورے ملک کا دورہ کیا اور مواعظ حسنہ سے لوگوں کو کتاب و سنت کی پیروی کی تلقین کی ۔ میاں جی محمدی صاحب فرماتے تھے کہ " سید صاحب نے سہارن پور میں بوجیسی کی مسجد میں منبر کے اوپر کی سیڑھی پر بیٹھ کر وعظ فرمایا ۔ مسجد میں ایک طرف مولوی عبدالحئی صاحب اور مولوی اسمٰعیل صاحب پاس پاس بیٹھے ہوئے تھے ۔ وعظ جب نصف سے زیادہ ہوگیا تو مولوی عبدالحئی صاحب نے مولوی اسمٰعیل صاحب کو اشارہ سے اٹھایا اور اٹھا کر اس طرف لے گئے جس طرف تیرہین ہیں ۔ میں بھی پیچھے پیچھے گیا اور وہاں جا کر فرمایا کہ سید صاحب نے یہ مضمون پہلے بیان فرمایا ہے ، میں نے اور تم نے اس کو لکھ بھی لیا ہے لیکن اس وقت جو کچھ فرما رہے ہیں ، یہ تمہاری سمجھ میں بھی آتا ہے یا نہیں ۔ مولوی اسمٰعیل صاحب نے کہا کہ کچھ کچھ آتا ہے ۔ اس پر مولوی عبدالحئی صاحب نے فرمایا کہ سچی بات ہے ، میں نے تو بہت زور لگایا مگر میری سمجھ میں تو نہیں آیا ۔ اب اس سمندر کو ہم اپنی کلھیا میں کیونکر بند کر لیں ۔ سید صاحب سے عرض کرنا چاہئیے کہ حضرت مضمون کو ذرا آسان کر کے بیان فرمایا کریں تاکہ ہم لوگوں لوگ سمجھ سکیں یہ کہہ کر دونوں صاحبان پھر اپنی اپنی جگہ جا بیٹھے "۔[1]

بچپن میں اگرچہ سید صاحب کا ذہن حصول علم کی طرف مائل نہ ہوتا تھا لیکن پھر بھی آپ نے اس دور کے جید علماء شاہ عبدالعزیز ، شاہ عبدالقادر ، شاہ اسحاق اور شاہ اسمٰعیل سے دینی علوم حدیث ، اور قرآن پاک کے ترجمہ کے علاوہ عربی اور فارسی کی کتب بھی

۱۔ امیر شاہ خان ، ارواح ثلاثہ ۔ ص ، ۱۲۷

اس کے حصول کی تمنا ہے ۔ میں تو صرف فریضۂ جہاد ادا کرنے ، بندگان خدا کی خیرطلبی کلمہ دین کی سربلندی اور سید المرسلین کی شریعت کی خدمت کے لیے کمربستہ ہوا ہوں ۔ میرا خزانہ صرف اللہ پر توکل ہے اور میرا خرچ ہر روز مجھے میرے رب کے خزانہ سے مل جاتا ہے ۔ میرے پاس امراء و سلاطین کی طرح درہم و دینار کے خزانے نہیں کیونکہ میں دنیاداروں کے آئین و قوانین سے بیزار ہوں ۔ میرا طریقہ وہی ہے جو میرے جد بزرگ سید المرسلین کا تھا یعنی ایک دن نان خشک شکم سیر ہو کر کھاتا ہوں اور اس پر خدا تعالی کا شکر بجا لاتا ہوں اور ایک روز فاقہ کرتا ہوں اور اس پر صبر کرتا ہوں " ۔[1]

تصانیف :

جناب سید احمد شہید نے سیاست کی وادی خار زار اور میدان کی ہنگامہ خیز زندگی میں اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے تھے ۔ اسی لیے بظاہر علمی کاموں کی طرف توجہ نہ دے سکے لیکن پھر بھی چند ایک کتب و رسائل تصنیف کیں ۔

(۱) صراط مستقیم : (فارسی)

یہ سید صاحب کی بہت مشہور کتاب ہے ۔ اس کتاب کو شاہ اسمٰعیل شہید نے سفر حج سے قبل تصنیف کیا تھا اور مولوی عبدالحئی نے حرمین شریفین میں اس کتاب کا عربی میں ترجمہ کیا تھا گویا اس کتاب کی عبارتیں مولوی عبدالحئی اور شاہ اسمٰعیل شہید صاحب کی اور مفہوم سید احمد شہید کا ہے ۔

(۲) تنبیہ الغافلین (فارسی)

اس کا اردو ترجمہ طبع ہو چکا ہے ۔

(۳) رسالہ در نماز و عبادت : (فارسی)

ابھی تک غیر مطبوعہ ہے ۔

---

۱ ۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری ، مکاتیب احمدی ۔ ص ، ۲۳۰

(۴) رسالہ در نکاح بیوگان (فارسی)

اس میں " نکاح بیوگان " کی اہمیت بیان کی گئی ہے اور ابھی تک یہ رسالہ غیر مطبوعہ ہے ۔

(۵) رسالہ حقیقت الصلوٰۃ اور رسالہ تفسیر سورۃ فاتحہ :

یہ دونوں رسالے سید صاحب کی زندگی میں ۱۲۳۷ھ میں کلکتہ سے شائع ہوئے تھے۔

(۶) رسالہ اشغال (فارسی)

یہ رسالہ سلاسل عالیہ قادریہ ، چشتیہ اور نقشبندیہ کے اذکار و مراقبات پر مبنی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے اور مکتبہ محمودیہ لاہور سے طبع ہو چکا ہے۔

شیخ الاسلام مولانا عبدالحئی بڈھانوی

خاندان ولی اللہی کے چشم و چراغ شیخ الاسلام مولانا عبدالحئی بن ھبۃ اللہ بن نوراللہ صدیقی بڈھانوی ، بڈھانہ ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی - آپ کے دادا نوراللہ صدیقی شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے اساتذہ کرام میں سے تھے اور ان کی بیٹی شاہ عبدالعزیز کے حرم میں تھیں - مولانا عبدالحئی نے سن رشد کے ساتھ ہی تعلیم کی غرض سے دہلی تشریف لا کر مولانا شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کی شاگردی اختیار کرکے فقہ و حدیث کے علاوہ دیگر علوم میں بھی مہارت تامہ حاصل کرلی - شاہ عبدالعزیز اپنے شاگردوں میں سے خصوصیت کے ساتھ مولانا عبدالحئی سے ایک تو آپ کے علمی تبحر اور باہم رشتہ داری کے باعث پیار و محبّت سے پیش آتے اور تفسیر میں انہیں اپنے تلامذہ پر فضیلت دیتے اور اپنا نمونہ فرماتے تھے - دوسرے یہ کہ آپ مولانا کے دادا نوراللہ صدیقی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے - شاہ عبدالعزیز نے آپ کو " شیخ الاسلام " کا لقب دیا ہے اور آپ کو اور شاہ اسمٰعیل صاحب کو ایک خط میں جو آپ نے لکھنؤ میں منشی خیرالدین صاحب کے نام حج کے متعلق لکھا ہے ، تاج المدرسین ، فخرالمحدثین اور سرآمد علماء و محققین تحریر

کیا ہے اور فرمایا ہے کہ دونوں حضرات تفسیر وحدیث ، فقہ و اصول ومنطق وغیرہ میں اس فقیر سے کم نہیں ہیں ۔ اس سلسلے میں صاحب "نزہۃ الخواطر" بحوالہ "مقالات طریقت" آپ کے بارے میں فرماتے ہیں :

"وکان عبدالحئی مفرط الذکاء ، قوی الحفظ ، شدید الاشتغال بالبحث والمطالعۃ ، حلو الکلام ، فصیح المنطق" ۔[1]

گویا آپ اپنی علمی فضیلت ، رشد وصلاحیت اور تقوی وتقدس میں بے نظیر تھے ۔ ایک دفعہ آپ اکبری مسجد میں شاہ عبدالقادر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ اثنائے گفتگو میں اسرار الصلوۃ اور حضور قلب کا ذکر آیا ۔ شاہ عبدالقادر صاحب نے فرمایا کہ اگرچہ اسرار الصلوۃ اور حضور قلب کسی تصوّف واخلاق میں اکثر کتب موجود ہیں لیکن بغیر مرشد کامل کے اسے حاصل کرنا سخت مشکل ہے ۔ لہذا ان دونوں بھائیوں (شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر) سے تکمیل علوم کے بعد آپ سید احمد بریلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ سید صاحب نے نماز کی حقیقت اور اس کے اسرار ومعارف پر زبانی اور تفصیلی تقریر کرنے کے بعد عملی طور پر دو رکعت نماز پڑھائی ۔ نماز پڑھنے کے فوراً بعد آپ نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرلی ۔ دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد جو اسرار وحقائق آپ پر منکشف ہوئے تھے ، ان کے بارے میں شاہ اسمٰعیل صاحب سے گفتگو کی تو آپ نے بھی سید صاحب کی اقتداء میں نماز پڑھنے کے بعد آپ کے ہاتھ پر بیعت کرلی ۔ مرشد عالم شاہ عبدالعزیز کی زندگی میں ہی ان دونوں حضرات نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرلی تھی ۔ اس کے ساتھ ہی شاہ صاحب کے خاندان کے اکثر صالحین ، علماء وفضلاء اور دیگر افراد بھی جوق در جوق حلقۂ بیعت میں شامل ہونے لگے ۔ اب آپ سید صاحب کے ادنی خادم اور کفش بردار بن گئے حتّی کہ جب سید صاحب ۱۲۳۷ھ میں حج کی غرض سے حرمین شریفین تشریف لے گئے تو مولانا صاحب آپ کی معیت میں تھے ۔ وہاں کے قیام کے دوران میں آپ کی علمی ، قلمی اور زبانی قوت اور قابلیت کے باعث یمن کے مشہور محدّث محمد بن علی الشوکانی نے آپ کو اپنی

---

۱ ۔ مولوی عبدالحئی لکھنوی ، نزہۃ الخواطر ۔ جلد ۔ ۷ ، ص ۲۳۹ ۔

تصانیف مع سند و اجازہ حدیث از خود بخش کیں ۔ سید صاحب کے ساتھ آپ کی نیک نیتی و خلوص اور ایثار و قربانی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ حج بیت اللہ ، تبلیغی دعوت اور میدان جہاد میں آپ سید احمد کے ہمرکاب رہے لہذا سید صاحب کے مریدین میں بلند ترین مرتبہ بھی مولانا عبدالحئی صاحب اور مولانا محمد اسمٰعیل شہید کا تھا بلکہ " سوانح احمدی " میں ہے کہ " یہ دونوں بزرگ بمنزلہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر کے ، آپ کے یار غار اور جانثار تھے " ۔[1] اسکی وجہ یہ تھی کہ مولانا محمد اسمٰعیل ، حضرت عمر کی طرح جوش و خروش اور جرأت و بہادری سے باطل و بدعت کے خلاف تیغ بکف رہتے تھے اور مولانا عبدالحئی صاحب ، سید احمد کے مریدین میں افضل ہونے کے باوجود خاموش طبع تھے ۔ طبیعت حضرت ابوبکر کی طرح پروقار ، تحمل مزاج ، رقیق القلب اور ایمان چٹان کی طرح محکم اور مضبوط تھا ۔ سب سے بڑی خوبی تو یہ تھی کہ وہ ہی مصیبت میں گھبرا کر گھبراتے تھے اور وہ ہی کامیابی میں آپے سے باہر ہوتے تھے ۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو فریضۂ حیات سمجھ رکھا تھا ۔ " ایک مرتبہ شادی کے بعد سید صاحب کو خلاف معمول جماعت میں کچھ تاخیر ہوگئی ۔ دوسرے دن پھر اتنی تاخیر ہوئی کہ تکبیر اولیٰ فوت ہوگئی ۔ مولانا نے سلام پھیرنے کے بعد کہا کہ عبادت الٰہی ہوگی یا شادی کی عشرت ، سید صاحب خاموش ہوگئے اور اپنی غلطی کا اعتراف کیا " ۔[2] گویا آپ ایک عالم فاضل شخصیت سے لے کر ایک عام انسان میں بھی کوئی خلاف سنت فعل دیکھتے تو اس کو اس عمل سے ٹوکتے اور راہ راست پر لانے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتے ۔

ہندوستان میں بیوہ عورت کے نکاح ثانی کو بہت برا اور حرام سمجھا جاتا تھا ۔ ایک دفعہ آپ نے اس خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے رائے بریلی کی مسجد میں ایک نہایت فصیح و بلیغ وعظ فرمایا ، جس کے الفاظ یہ تھے ۔ " لا تجد قوما یومنون باللہ والیوم الاخر یوادون من حاد اللہ ورسولہ ولو کانوا اباءھم او ابناءھم او اخوانھم او عشیرتھم " ۔[3]

۱۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری ، تواریخ عجیبہ ، ص ۲۹۵

۲۔ ابوالحسن علی ندوی ، سیرت سید احمد شہید ۔ ص ، ۲۱۶

۳۔ ایضاً ۔ ص ، ۲۱۷

اس وعظ میں آپ نے خاندان عزیزی اور خاندان شاہ علم اللہ سمیت ہندوستان کے تمام علماء وفضلاء کے افعال واعمال کا ذکر کرتے ہوئے ان کی کمزوریوں کو واضح طور پر بیان فرمایا ۔ اس وعظ سے قبیح رسم کا خاتمہ ہوا اور نکاح ثانی عام ہوگیا ۔ اس کے بعد آپ نے لکھنؤ کے قیام کے دوران میں بھی برابر وعظ کیے ، جس سے سارے مجمع اور علمائے فریقین پر سکتے کا عالم ہوتا تھا ۔ ان خطبات سے ہزاروں لوگوں نے اثر قبول کرتے ہوئے راہ راست اختیار کی ۔ آپ کے اور شاہ صاحب کے جلسوں میں خلقت کی کثیر تعداد دیکھ کر دوسرے علماء وفضلاء حیران وپریشان ہوتے تھے ، یہاں تک کہ لکھنؤ کے ایک محدث اور مشہور عالم نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "میں بھی قرآن وحدیث کا وعظ کہتا ہوں اور یہ دونوں عالم (مولانا وشاہ صاحب) بھی قرآن وحدیث کا وعظ کہتے ہیں مگر میرے وعظ میں دس پانچ آدمیوں سے زیادہ جمع نہیں ہوتے اور ان کے وعظ میں سارا شہر ٹوٹ پڑتا ہے ۔ مسجدوں میں سامعین کو بیٹھنے کو جگہ نہیں ملتی "۔[1] اس سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا صاحب شیریں سخن ، قوی المقال ، اور ذکی الفہم شخصیت تھے ۔ صاحب "نزھۃ الخواطر" آپ کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ :

"کان آیۃ من آیات اللہ سبحانہ ، فی التقوی والعمل وتاثیر الوعظ وقلۃ الامل وایثار القناعۃ فی المجلس والماکل ، کثیر الصمت شدید التوکل جلیل الوقار ، محبًّا للسنۃ السنیۃ متجردا عن الرسوم والبدع قد غشیہ نور الایمان وسیماء الصالحین ، یغضب اذا مدح ویتبشّر اذا نصح ، والقلم یقصر فی المدح لعدم امکان الاحاطۃ "۔[2]

گویا آپ قاطع بدعت تھے اور آپ کا مقصد احیائے تجدید دین اور اعلائے کلمۃ اللہ تھا ۔ مولانا صاحب اپنی خدا داد قابلیت کی بناء پر ہر فن کے بحث ومناظرہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے ۔ ایک طویل عرصے تک آپ درس وتدریس میں مصروف رہے ۔ آپ شاہ عبدالعزیز کے مدرسہ کے دوسرے

---

۱ ۔ ابوالحسن علی ندوی ، سیرت سید احمد شہید ۔ ص، ۳۱۹

۲ ۔ عبدالحئی لکھنوی ، نزھۃ الخواطر ۔ جلد ۷ ، ص ، ۲۳۹

دور (۱۷۶۲ء تا ۱۸۲۴ء) کے نادر روزگار محدثین ومدرسین میں سے ہیں ۔ شاہ عبدالعزیز کے ارشد تلامذہ میں آپ کا شمار دوسرے طبقہ میں عقل ونقل میں جامع استاد کی حیثیت سے دوسرے درجے پر ہوتا ہے۔ [1]

شاہ صاحب اور مولانا عبدالحئی تمام عمر ترغیب جہاد فی سبیل اللہ میں سرگرم عمل رہے ۔ اوائل ذالحج ۱۲۴۲ھ میں کوہستان کی طرف بغرض جہاد تشریف لےگئے اور تھوڑے عرصے تک سید صاحب کی رفاقت میں رہے ۔

وفات:
====

مولانا صاحب مرض بواسیر میں پہلے سے ہی مبتلا تھے ۔ مقام "خہر" میں زمانہ قیام کے دوران میں شدید دورہ پڑا ۔ آپ کے علاج معالجہ میں کوشش کو تاہی نہ کی گئی لیکن پھر بھی بوجہ مرض کمزوری بڑھتی گئی یہاں تک کہ اکثر اوقات بے ہوشی کا غلبہ رہتا ۔ جب آپ کا انتقال ہونے لگا تو آپ نے سید صاحب سے عرض کیا کہ "سید صاحب "شہادت تو میری قسمت میں نہ ہوئی ۔ اب اتنی تمنا ہے کہ آپ اپنا قدم مبارک میرے سینہ پر رکھ دیجئے کہ اسی حالت میں میری جان نکل جاوے ۔ سید صاحب نے فرمایا کہ میرا پاؤں اس قابل کہاں ہے کہ آپ کے سینہ پر ہو اور آپ نے ان کی تسلی کے لیے اپنا ہاتھ ان کے سینہ پر رکھ دیا "۔ [2] جس سے کچھ اطمینان نصیب ہوا ۔ تھوڑی دیر بعد چند مرتبہ "اللہ رفیق الاعلی" "اللہم رفیق الاعلی" کے الفاظ زبان مبارک سے ادا کیے اور روح جسد عنصری کو چھوڑ کر مالک حقیقی کی بارگاہ میں پہنچ گئی ۔ مولانا عبدالحئی صاحب نے ۸ شعبان ۱۲۴۲ھ / ۲۲ فروری ۱۸۲۸ء میں رحلت فرمائی ۔ آپ کے اکلوتے فرزند مولانا عبدالقیوم بھوپالی تھے ۔

تصانیف:
======

مولانا عبدالحئی صاحب تمام عمر درس وتدریس ، احیائے تجدید دین اور اعلائے کلمۃ اللہ

۱۔ شاہ عبدالعزیز کے شاگردوں میں پہلے طبقے میں عقل ونقل کے جامع استاد شاہ رفیع الدین اور دوسرے طبقے میں پہلے درجے پر شاہ اسمٰعیل شہید اور دوسرے درجے پر مولانا عبدالحئی صاحب کا شمار ہوتا ہے۔

۲۔ امیر شاہ خاں ، ارواح ثلاثہ ۔ ص، ۱۶۱

میں مصروف رہے - جب آپ نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور ان کے ساتھ حرمین شریفین تشریف لے گئے تھے - اس وقت انہوں نے "صراط مستقیم" کے دو باب (سلوک میں) تحریر کیے تھے اور پوری کتاب " صراط مستقیم" کا عربی زبان میں ترجمہ کیا - اس کے علاوہ شیخ رشید الدین کشمیری سے آپ کا جو تحریری مناظرہ ہوا تھا ، اس کی رو ئیداد بھی آپ نے مرتب فرما کر کتابی شکل میں منضبط کر دی تھی - علاوہ ازیں صاحب " الیانع الجنی " رقمطراز ہیں :

"واشتہر کان من احسنہم (یعنی اصحاب شیخ عبدالعزیز) خبرۃ بالفقہ و امرسہم بالکتب الدرسیۃ رایت لہ رسالۃ فی حث الناس علی تزویج ایاماھم وردعھم عن استقباح ذلک "-[1]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا صاحب کا ایک رسالہ " نکاح بیوگان " پر بھی موجود ہے -

مولوی محبوب اللہ دہلوی

مولانا محبوب علی بن مصاحب علی بن حسن علی بن روشن علی بن رحیم الدین بن فہیم الدین حسینی جعفری دہلوی محرم ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۵ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے - علوم عقلیہ اور نقلیہ کی تحصیل شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر محدث دہلوی سے کی جیسا کہ سرسید احمد خان لکھتے ہیں کہ

"علم حدیث و فقہ میں اقران و امثال سے بیش جہاد دیدہ و سفر کردہ - تحصیل علوم نقلیہ وعقلیہ کی جناب مولوی شاہ عبدالعزیز دہلوی کے خاندان رفیع الارکان سے کی - ان فنون میں ایسی مہارت رکھتے ہیں کہ مسائل جزئیہ مثل لوح محفوظ کے ان کے تختۂ حافظہ پر منقوش ہیں "-[2]

مولوی محبوب علی صاحب ، شاہ اسمٰعیل صاحب کے ساتھ " ترمذی شریف " کی قرأت اور سماع میں شامل درس تھے - حدیث اور تفسیر کی طرف زیادہ توجہ دیتے تھے - اپنے علم کے مطابق عمل میں بھی

۱- محمد محسن یحیی ترہتی ، الیانع الجنی - ص، ۷۶

۲- سرسید احمد خان ، آثار الصنادید - ص، ۲۵۲

مصروف رہتے تھے ۔ بحث و مباحثہ اور مناظرہ کو مختصر اور عمدہ طریق سے ادا کرتے تھے کہ سننے والے آپ کے حافظے کی داد دیتے تھے ۔

مولوی صاحب نے سید احمد شہید کے ہاتھ پر بیعت کی اور سکھوں سے جہاد کے لیے سید احمد شہید کے ہمراہ " یاغستان " تشریف لے گئے لیکن وہاں کے شدائد و مصائب دیکھ کر گھبرا گئے اور ہندوستان واپس لوٹ کر جہاد کے خلاف فتوی دینا شروع کیا ، جس سے نہ صرف تحریک جہاد متاثر ہوئی بلکہ مجاہدین کی صفوں میں بھی انتشار پھیل گیا ۔ اس کے بعد مولوی صاحب نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں بھی فتوی جہاد کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کیا اور کہا کہ ہم مسلمان حکومت انگریز کی رعایا ہیں اور اپنے مذہب کی رو سے اپنے حاکموں سے مقابلہ نہیں کر سکتے ۔ مولوی صاحب ۱۰ ذوالحج ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۲ء میں اسی ۸۰ سال کی عمر میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئے ۔ انہیں دہلی شہر میں دفن کیا گیا ۔

تصنیفات :

آپ کی مشہور تصنیفات آپ کے تین قلمی رسالے ، اختصار الصیانۃ ، صیانۃ الایمان اور رسالہ در بیان عدم جواز رفع سبابہ ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی لائبریری میں محفوظ ہیں ۔

مولوی عبدالخالق دہلوی

عالم و فاضل شخصیت عبدالخالق حسینی دہلوی ، جن کا شمار بڑے بڑے مشہور علماء اور محدثین میں ہوتا ہے ، بمقام دہلی پیدا ہوئے ۔ آپ نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور شاہ عبدالقادر بن ولی اللہ سے تحصیل علوم کے علاوہ شیخ اسحاق بن افضل عمری دہلوی سے بھی سند حدیث لی ۔ تکمیل علوم کے بعد آپ کافی عرصہ دہلی میں پڑھاتے رہے ۔ علم و فضل میں بلند پایہ رکھنے کے ساتھ ساتھ زہد و تقوی ، ترویج ملت اور اعلائے دین میں ہمیشہ کوشاں رہتے تھے نتیجتاً بہت سے لوگوں نے آپ کے ارشاد و ہدایت اور مواعظ و نصائح سے راہ راست اختیار کی ۔ بے شمار لوگ آپ کے کمال سے بہرہ ور

ہونے کے لیے آپ کی خدمت میں تشریف لاتے - مولوی صاحب شیریں مقال ، امانت و دیانت میں مشہور اور نہایت متین و سنجیدہ شخصیت کے مالک تھے - ۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء میں آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی (انا للہ و انا الیہ راجعون) اور آپ کو دہلی میں دفن کیا گیا -

شاہ احمد سعید مجدّدی

شاہ احمد سعید بن شاہ ابو سعید بن صفی القدر بن عزیز القدر بن عیسی بن سیف الدین[1] بن خواجہ محمد معصوم بن مجدّد الف ثانی سرہندی رضی اللہ تعالی عنہم ربیع الاول ۱۲۱۷ھ / ۱۸۰۲ء میں بمقام رام پور پیدا ہوئے - ابتدائی تعلیم کا آغاز اپنے والد بزرگوار شاہ ابو سعید سے کیا - اپنے والد ماجد سے قرآن پاک حفظ کیا - ابھی دس برس کے بھی نہ ہوئے تھے کہ اپنے والد ماجد کے ساتھ دہلی کا سفر اختیار کیا - دہلی پہنچ کر شاہ غلام علی صاحب سے بیعت کی اور ان کے حلقہ مراقبہ میں شامل ہونے کے علاوہ علمائے دہلی مولوی فضل امام خیر آبادی اور مفتی شرف الدین وغیرہ سے علوم عقلیہ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ، شاہ عبدالقادر ، شاہ رفیع الدین اور مولوی رشیدالدین خان صاحب سے علوم نقلیہ پڑھے - لکھنؤ میں مولوی محمد اشرف اور مولوی نور صاحب سے بھی پڑھا - آپ نے شاہ عبدالعزیز سے سند حدیث لینے کے علاوہ شاہ غلام علی صاحب سے اکثر کتب تصوف مثلاً " رسالہ قشیری " " عوارف المعارف " ، " احیائے علوم " ، " نفحات " ، رشحات ، " مکتوبات امام ربانی " ، " مثنوی مولانا روم " " مشکوۃ المصابیح " اور " ترمذی " پڑھیں اور کچھ کتب سماعت بھی کیں - آپ حافظ قرآن اور سنت رسول اللہ کے مطیع ہونے کے باعث دن رات درس و تدریس میں مصروف رہتے - شاہ غلام علی خاص طور پر آپ کی طرف متوجہ ہوتے اور آپ کو اپنے برابر مسند پر بٹھا لیا کرتے تھے - شاہ غلام علی آپ کے اور تین دوسرے خلفاء کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ :

" عبارت از وی و شاہ ابو سعید و شاہ رؤف و مولوی بشارت اللہ بشارت ہائے نیکو داد و تحریر فرمود کہ این چہارکس درین زمانہ ستون محمدی اند " -[2]

۱- تذکرہ کاملان رام پور میں آپ کا نام " غلام غوث " لکھا ہے جو آپ کے دادا شاہ محمد صدیقی نے رکھا تھا -
۲- مفتی غلام سرور لاہوری ، خزینۃ الاصفیاء - ج - ۲ ، ص ۲٦٧

شاہ غلام علی کو جب مرض الموت لاحق ہوا تو انہوں نے شاہ ابو سعید کو دہلی طلب فرماتے وقت یہ لکھا کہ شاہ احمد سعید کو لکھنؤ میں ہی چھوڑ آئیں تو اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ وہاں مسند ارشاد پر بیٹھ کر اپنے دینی امور سرانجام دیتے رہیں۔ شاہ غلام علی کے انتقال کے سوا نو سال بعد ۱۲۳۱ھ / ۱۸۲۳ء میں جب ابو سعید حرمین شریفین حج بیت اللہ کے ارادہ سے روانہ ہوئے تو شاہ احمد سعید کو خانقاہ میں اپنا قائم مقام بنا گئے۔ اس دوران میں ہزاروں مرید آپ کے گرد اکٹھے ہو گئے۔

شاہ صاحب نماز اشراک کے بعد جلسہ عام میں بیٹھ کر دینی علوم کا درس دیتے۔ علم معقول کی تعلیم کو ناپسند فرماتے ہوئے "قطبی میر" تک کتابیں پڑھاتے اور اگر کوئی اس علم میں اس سے زیادہ مطالعہ کا خواہش مند ہوتا تو علمائے معقول کے پاس بھیج دیتے تھے۔ البتہ علوم تفسیر وحدیث وفقہ واصول وتصوف پر نہایت شرح وتفصیل سے گفتگو کرتے اور ان کے حقائق ومعارف پر نہایت ہی فصیح وبلیغ تقریر کرتے۔ فتوی نویسی بھی بحالت مجبوری صرف اس لیے کرتے کہ عوام نے جاہلوں کو عالم بنا لیا تھا۔

ستاون[۵۷] برس کی عمر میں ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے دہلی شہر میں داخل ہونے پر آپ نے اپنے اہل وعیال دہلی شہر سے باہر بھیج دیے۔ اور بعد ازاں اپنے بزرگوں کی اجازت پر خانقاہ کا انتظام حاجی دوست محمد قندھاری کے سپرد کر کے خود اہل وعیال سے جا ملے۔ پھر پروانہ راہ داری حاصل کر کے سو سوا سو آدمیوں کی معیت میں براستہ کراچی کشتی کے ذریعہ بمبئی تشریف لے گئے حتی کہ خالد پاشا محافظ مدینہ منورہ نے حضرت علی کی مسجد سے متصل ایک مکان کرایہ پر لے کر دیا۔ یہاں بھی بہت سے مرید آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے۔

وفات:
=====

ہندوستان میں قیام کے دوران میں آپ نے یہ وصیت کی تھی کہ آپ کو مرزا مظہر جانجاناں کے زیر قدم دفن کیا جائے اور مدینہ منورہ کی حاضری پر وصیت فرمائی تھی کہ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قریب دفن کریں کیونکہ وہاں انوار وبرکات کا زیادہ ظہور ہے لہذا معمولی بخار اور سر درد کے بعد

سہ شنبہ ۲ ربیع الاوّل ۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۰ء میں مدینہ منورہ میں ہی آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی (اناللہ وانا الیہ راجعون) اور آپ کو وصیت کے مطابق عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے روضہ کے قریب دفن کیا گیا ۔

فضیلت وعظمت:
=========

شاہ احمد سعید اپنے والد بزرگوار کی زندگی میں ہی مسند ارشاد پر بیٹھے ۔ جود و سخا کا یہ عالم تھا کہ ساٹھ ۶۰ آدمی دونوں وقت آپ کے باورچی خانہ سے کھانا کھاتے تھے ۔ اس کے علاوہ حاجت مندوں کی حاجت روائی کرتے ۔ شاہ غلام غوث نہایت متقی و پرہیزگار اور عالم کامل وفاضل اجل تھے ۔ آپ کی خانقاہ میں نماز فجر، ظہر اور مغرب کے بعد حلقہ مراقبہ ہوتا اور دوسرے اوقات میں علوم حدیث و تفسیر اور فقہ وغیرہ کا درس بھی ہوتا تھا ۔ نماز تہجّد نہایت اہتمام کے ساتھ ادا کرنے کے بعد صبح کی نماز طویل قرأت سے ادا کرتے ۔ پھر آفتاب کے تھوڑا بلند ہونے پر نماز اشراق پڑھ کر جلسہ عام میں بیٹھ جاتے اور تعلیم و تدریس میں مصروف ہو جاتے ۔ مسائل دینی کو حل کرنے میں انتہا درجے کا کمال رکھتے تھے ۔ صاحب " خزینۃ الاصفیاء " آپ کی تعریف میں رقمطراز ہیں :

" حضرت مولوی محمد غوث مجددی است کہ در زہد وتقوی و شریعت و طریقت و طاعت وعبادت وعلم وحلم ولطف ومہربانی ثانی ندارد شخصی است باوصاف حمیدہ آراستہ وباخلاق محمدی پیراستہ صاحب صورت و سیرت اہل ظاہر و باطن وحال وقال است " ۔[1]

اولاد :
======

آپ کی اولاد میں سب سے بڑے بیٹے اور خلیفہ شاہ عبدالرشید پھر شاہ محمد عمر اور محمد مظہر صاحب تھے ۔ آخر الذکر " مناقب احمدیہ " اور " مقامات سعیدیہ " کے مصنف ہیں ۔ علاوہ ازیں

---

۱ ۔ مفتی غلام سرور لاہوری ، خزینۃ الاصفیاء ۔ جلد ۔ ۲ ص ، ۲۶۸

آپ کے خلفاء کی بھی ایک طویل فہرست ہے - جن میں سے چند ایک کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے -

حاجی دوست محمد قندھاری - مولوی ارشاد حسین رام پوری ، شاہ عبدالواجد ، تاشقر غوری ، مولانا حبیب اللہ ملتانی ، ملا قربان قراتگینی ، ملا حسام الدین باجوڑی ، ملا نور محمد کولابی ، ملا فیض احمد غزنوی ، ملا احمد شاہ کشمیری ، حاجی میر مظہر کابلی ، مولوی سید بشیر علی امروھی ، ملا عبدالرحیم چیتی ، شیخ محسن بصری حنبلی ، مولوی سید قمر الدین لکھنوی ، حافظ خلیل آفندی اناطولی ، سید ابراھیم کردی ، مولوی فضل الدین پشاوری ، سید غسان حنفی قرشی اور حاجی عبدالرحمن راغستانی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین -

تصنیفات:
======

آپ کی تصنیفات میں " حق المبین فی رد علی الوھابیین " الفوائد الضابطہ فی اثبات الرابطہ" الذکر الشریف فی دلائل المولد الشریف اور " اربع انہار" موخر الذکر رسالہ شاہ غلام علی صاحب کے رسالہ " ایضاح الطریقۃ" کے ساتھ مطبع علوی علی بخش خاں میں ۱۲۸۲ھ میں طبع ہو چکا ہے -

شاہ ابو سعید
==========

شاہ ابو سعید بن صفی القدر بن عزیز القدر بن عیسی بن سیف الدین بن خواجہ محمد معصوم بن مجدد الف ثانی سرھندی رضی اللہ تعالی عنھم ، ذو قعدہ ۱۱۹۶ھ / ۱۷۸۱ء میں بمقام روھیل کھنڈ (رام پور) پیدا ہوئے - گیارہ سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا اور طریقہ نقشبندیہ میں اپنے والد ماجد سے بیعت کی - فن تجوید ایک جید قاری نسیم علیہ الرحمۃ سے حاصل کیا - آپ قرآن پاک کی تلاوت ایسی ترتیل سے کرتے کہ جو بھی سنتا ، محو ہو جاتا تھا حتی کہ جب آپ حرمین شریفین فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے تشریف لے گئے تو اھل عرب نے آپ کی تلاوت سن کر بہت شہرت کی تھی - قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد ظاھری علوم کی تحصیل علمائے کبار مفتی شرف الدین دھلوی اور مولانا شاہ رفیع الدین محدث دھلوی سے کی - مولانا شاہ عبدالعزیز اور حضرت سراج احمد بن شیخ محمد مرشد سے علم فقہ و حدیث

کی سند حاصل کی۔ علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد آپ علوم باطنی کی تحصیل کے لیے اپنے والد بزرگوار کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مزاج میں انقطاع اور ترک دنیا غالب تھا۔ اس لیے اپنے والد صاحب کی اجازت سے ارادہ خدا طلبی میں شاہ درگاہی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر خاندان قادریہ میں مرید ہوئے اور بارہ سال کی محنت شاقہ سے خلافت عطا ہوئی چونکہ ابھی شوق خدا طلبی باقی تھا۔ اس لیے آپ رامپور سے دہلی آئے اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے نام خدا طلبی کے باب میں خط لکھا۔ انہوں نے جواب میں لکھا کہ اس وقت شاہ غلام علی سے بہتر کوئی شخص نہیں لہذا سلوک مجددیہ طے کرنے کے لیے ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء میں رامپور سے دہلی، شاہ غلام علی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چند ماہ بعد ہی شاہ صاحب نے آپ کو خلافت سے نوازا۔ ۱۲۳۹ھ /۱۸۲۳ء میں جب حج بیت اللہ کے ارادے سے حرمین شریفین تشریف لے گئے تو خانقاہ میں اپنے فرزند ارجمند شاہ احمد سعید کو اپنا جانشین بنا گئے۔ مکہ معظمہ میں شیخ عبداللہ سراج، شیخ عمر مفتی شافعیہ، سید عبداللہ، میر غنی مفتی حنفی، سید حسین، ان کے چچا اور دوسرے بزرگ ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ اہل حرمین نے آپ کی نہایت تعظیم و تکریم کی۔ تین ماہ مکّہ مکرمہ میں قیام کے بعد مدینہ منورہ تشریف لائے۔ حج وزیارت کے بعد ہندوستان واپس لوٹ آئے۔

۲۲ رمضان ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء میں ٹونک داخل ہوئے، عیدالفطر کے دن سکرات موت شروع ہوئی آپ کے صاحبزادے شاہ عبدالغنی آپ کے ہمراہ تھے۔ ان کو وصیت کی کہ "اتباع سنت کرنا اور اہل دنیا سے پرہیز کرنا، اگر دنیا داروں کے پاس جاؤگے تو ذلیل ہو جاؤگے ورنہ دنیا دار کتّوں کی طرح تمہارے دروازے پر لوٹیں گے"۔[1] اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ جو اذکار و اشغال مجھے پہنچے ہیں، ان کی اجازت تمہیں بلکہ عبدالغنی کو بھی دیتا ہوں پھر حافظ سے سورۃ یٰسین پڑھنے کے لیے فرمایا۔ جب تین مرتبہ سن چکے تو فرمایا کہ بس کرو، اب وقت بہت کم باقی ہے۔ عیدالفطر کے دن بروز شنبہ ظہر اور عصر کے درمیان اپنی انگشت سبابہ کو حرکت دیتے ہوئے ۱۲۵۰ھ /۱۸۳۴ء میں

۱۔ وقائع عبدالقادر خانی، علم و عمل۔ جلد۔ ۱ ص ۲۶۲

چوّن برس کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے (انا للہ وانا الیہ راجعون) غسل اور نماز جنازہ کے بعد شاہ عبدالغنی نے آپ کی نعش مبارک تابوت میں رکھی اور چالیس دن بعد دہلی لا کر آپ کو شاہ غلام علی کے پہلو میں دفن کیا گیا ۔

شاہ صاحب کی علمیت :

شاہ صاحب علوم ظاہری و باطنی ، فقہ و حدیث و تفسیر میں یگانۂ آفاق تھے ۔ آپ کے بارے میں علوم ظاہری و باطنی میں نادر روزگار ہونے کی پیش گوئیاں قبل از وقت ہو چکی تھیں ۔ آپ فرماتے ہیں کہ "اوائل عمر میں ایک مرتبہ میرا اتفاق لکھنؤ جانے کا ہوا ۔ محلہ کی مسجد میں جب نماز پڑھنے جایا کرتا تو راستہ میں ایک مجذوب برہنہ بیٹھا ہوتا ۔ مجھ کو دیکھ کر ستر عورت چھپا لیا کرتا ۔ کسی نے اس سے دریافت کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ جب تو ان کو دیکھتا ہے ، اپنا ستر عورت پوشیدہ کر لیتا ہے ۔ اس نے جواب دیا کہ ایک وقت آئے گا کہ ان کو ایسا منصب حاصل ہوگا کہ مرجع اقارب ہوں گے"۔[1] پس جیسے اس مجذوب نے کہا تھا ویسے ہی واقع ہوا۔

خاندان قادریہ میں بیعت کرنے کے بعد جب خرقہ خلافت عطا ہوا تو ہزاروں آدمی آپ کے مرید ہو گئے تھے ۔ سلوک مجددیہ طے کرنے کے لیے جب آپ شاہ غلام علی کی خدمت میں تشریف لے گئے تو شاہ صاحب نے آپ کو اپنے برابر مسند پر بٹھا لیا اور فرمایا کہ میں تو آپ کے خاندان کا ایک ادنیٰ منتسب ہوں آپ نے فرمایا کہ میں تعلیمی استفادہ اور کفش برداری کی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں ۔ شاہ غلام علی صاحب سے خرقہ خلافت حاصل ہونے کے بعد بے شمار لوگ آپ کے مرید ہو گئے تھے ۔ نسبت باطنی کی قوت اتنی مضبوط تھی کہ جس پر نظر ڈالتے وہ بے تاب ہو جاتا تھا ۔ اپنے پیر اور اساتذہ کی تہہ دل سے عزت و احترام کرتے تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی آپ سفر سے واپس لوٹتے تو شاہ صاحب آپ کے استقبال کے لیے تشریف لے جاتے تھے ۔ آپ کو اپنے پہلے پیر شاہ درگاہی سے بھی حد درجہ عقیدت تھی ۔ ایک روز کسی نے شاہ درگاہی صاحب کی غیبت کی ۔ آپ نے

۱۔ محمد حسن ، حالات مشائخ نقشبندیہ مجددیہ ۔ ص ، ۲۲۵

غصّہ میں آکر اس کو تھپڑ مارا اور فرمایا کہ اگر شاہ غلام علی صاحب یہاں تشریف فرما نہ ہوتے تو میں واپس لوٹ جاتا آپ کی علمی عظمت کو دیکھتے ہوئے شاہ صاحب اپنے اکثر مریدوں کو آپ کے سپرد کر دیا کرتے تھے چنانچہ مولانا خالد رومی اور سید اسمٰعیل بھی آپ سے راہنمائی حاصل کیا کرتے تھے۔ شاہ غلام علی کے انتقال کے بعد جب شاہ ابو سعید مسند آرا ہوئے تو آپ اپنے آباؤاجداد اور مشائخ عظام کی طرح شریعت محمدی اور طریقۂ احمدی کی ترویج میں سرگرم عمل ہوئے۔ طبیعت میں ایثار و نرمی کے باعث تلخی و سختی اور فقر و فاقہ کو بطریق احسن برداشت کیا۔ آپ کی تحمّل مزاجی اور بردباری کے باعث شاہ صاحب کے منکر لوگ بھی آپ کے معتقد ہوگئے۔ ان تمام خوبیوں اور صفات کے علاوہ آپ کی بے شمار کرامات اور تصرفات ہیں جیسا کہ صاحب " خزینۃ الاصفیاء " لکھتے ہیں کہ آپ کے ایک مرید اصغر خان نے اپنا مسئلہ پیش کرتے ہوئے کہا :

" گاہے گاہے بسبب غلبہ خواب نماز تہجّد من شمارا بیدار خواہم کرد
آمدہ گفتہ ادرن نماز باختیار شما است پس ہر شب ہمچنیں بود
کہ وقت نماز تہجّد از خود بیدارمی شدم وخود را بر بستر نشستہ
می یافتم "۔[1]

آپ کے علمی مقام کے باعث ہی اہل حرمین آپ سے نہایت تعظیم و تکریم سے پیش آتے اور اکثر شرفاء و سادات داخل طریق ہوکر آپ کی صحبت سے مستفیض ہوتے۔ آپ دنیاداروں کو سخت ناپسند کرتے تھے اور فرماتے کہ دنیاداروں کے ہمارے ہاں آنے سے ظلمت وکدورت ہوتی ہے۔ غرضکہ آپ کی ذات بابرکات سے سینکڑوں لوگوں نے استفادہ کرتے ہوئے راہ راست اختیار کی۔

اولاد :

آپ نے اپنے پیچھے چار بیٹے ، شاہ احمد سعید ، شاہ عبدالمغنی ، شاہ عبدالغنی اور شاہ محمد عمر چھوڑے۔

۱۔ مفتی غلام سرور لاہوری ، خزینۃ الاصفیاء ۔ جلد ۔ ۲ ، ص، ۶۶۱ ، ۶۶۲

حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی

کبیر الاولیاء بیہقی وقت ،علم الھدی حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ جو شیخ جلال الدین عثمانی المعروف کبیر الاولیاء کی اولاد میں سے ہیں ۔ ۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۰ء میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے ۔ آپ کا سلسلہ نسب بارہ واسطوں سے شیخ صاحب سے ملتا ہوا حضرت عثمان بن عفان تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے ۔ قدیم بادشاہوں کے زمانے سے آپ کے مشہور بزرگوں کے علم و فضل میں باکمال ہونے کے باعث منصب قضاۃ کا سلسلہ آپ کے خاندان میں چلتا ہوا آپ تک بھی پہنچا ۔

بیہقی وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے ابتدائی تعلیم کا آغاز اپنے گھر اور شہر کے اساتذہ سے کیا ۔ آپ کی والدہ نے آپ کو بچپن میں ہی قرآن کریم کی دولت سے مالا مال کر کے اچھے اخلاق کا خوگر بنا دیا تھا نتیجتاً اپنی والدہ کی عمدہ تربیت کے باعث ہی آپ نے سات برس کی عمر میں قرآن پاک حفظ کر لیا ۔ ماں کی آغوش سے علم کی دولت سمیٹنے کے ساتھ ساتھ سولہ سال کی عمر میں منطق ،فلسفہ ،ادب ، تاریخ اور فقہ جیسے علوم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد مزید تشنگی علم کو بجھانے کے لیے دھلی پہنچ کر حجۃ اللہ شاہ ولی اللہ سے حدیث کا علم حاصل کیا ۔ علم ظاہری کی تکمیل کے بعد علم باطنی کی پیاس پر غلبہ پانے کے لیے پہلے شاہ محمد عابد سنامی سے بیعت کی ۔ ان کے وصال کے بعد قاضی صاحب مرزا مظہر جان جاناں حبیب اللہ مظہر شہید کے چشمۂ فیض سے سیراب ہونے کے لیے ان کی جانب متوجّہ ہوئے چنانچہ مرزا صاحب شیخ وقت نے اپنے مرید اور طالب رشد وھدایت میں جواھر صادق دیکھ کر چند ہی دنوں میں انہیں عالم ملکوت کی سیر کروا دی اور تکمیل علوم کے بعد انہیں "علم الھدی" کے خطاب سے نوازا ۔ قاضی صاحب ، شاہ عبدالعزیز سے عمر میں پندرہ سولہ برس بڑے تھے ۔ اگر یہ کہا جائے کہ قاضی صاحب ،شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی کے شاگرد نہیں تھے بلکہ شاہ ولی اللہ کے شاگرد تھے تو بے شک بجا ہے لیکن عمر میں بڑا ہونا تعلیم و تدریس اور استادی و شاگردی میں مانع نہیں ہوتا ۔ اگرچہ علم آپ کے آباؤ اجداد سے متوارث تھا اور بھر شاہ ولی اللہ ،شیخ محمد عابد سنامی اور مرزا مظہر جان جاناں جیسے باکمال علماء سے بھی آپ نے تکمیل علم کیا تھا لیکن ممکن ہے کہ ان حضرات

سے تکمیل علم کے بعد کسی علم میں شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی سے بھی استفادہ کیا ہو اور اس وجہ سے مصنفین و مورخین نے قاضی صاحب کو آپ کا شاگرد بتایا ہو۔

علمی عظمت و فضیلت:

=============

قاضی صاحب علوم ظاھری و باطنی میں یگانۂ روزگار تھے۔ آپ نے اپنے زمانہ طالب علمی کے دوران میں درسی کتب کے علاوہ مختلف علوم کی ایک سو پچاس کتب کا مطالعہ کیا تھا۔ آپ کی علمی صلاحیتوں اور مراتب کے باعث شاہ ولی اللہ آپ کو درس حدیث کے دوران میں "بیھقی" کہا کرتے تھے لیکن تکمیل علوم کے بعد انہیں "امام بیھقی" کے لقب سے سرفراز کیا تھا۔ قاضی صاحب معرفت علم، معرفت نفس اور معرفت ذات کے حامل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ایک طویل عرصے تک فیض ظاھر و باطن، فصل خصومات، افتاء سوالات، حل مشکلات اور اشاعت علوم میں مشہور رہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی نے فقہ و حدیث میں آپ کی بلند پایہ تبحر علمی کے باعث آپ کو "بیھقی وقت" کا خطاب دیا تھا۔ قاضی صاحب نے بیاسی سال کی عمر تک مختلف مضامین اور مختلف کی ھر فن کی تقریباً چار سو کے قریب کتب کا مطالعہ کیا۔

قاضی صاحب کا مسلک حنفی تھا اور مشرباً صوفی تھے۔ علم تفسیر، حدیث، فقہ، کلام اور تصوف میں بلند مقام پر فائز تھے۔ حدیث پر وسعت نظر کے باعث اھل حدیث، دیوبندی، بریلوی اور دیگر تمام طبقوں میں عزت و احترام کی نگاھوں سے دیکھے جاتے تھے۔ علم و فضل اور زھد و تقوی کے لحاظ سے آپ کا مقام اپنے ھمعصروں میں بہت بلند ہے۔ شیخ مظہر جانجانان علوی دھلوی آپ کی عظمت کا اعتراف یوں کرتے ھیں کہ:

> "در دل فقیر مھابت ایشان می آید از روی صلاح و تقوی و دیانت
> مروج شریعت منور طریقت ملکی صفت اند ملائکہ تعظیم ایشان می‌نمایند
> می فرمودند اگر خدای تعالیٰ روز قیامت از بندہ پرسد کہ بدرگاہ ما چہ
> تحفہ آوردے عرض کنم ثناء اللہ پانی پتی"۔[1]

۱۔ نواب صدیق حسن خان، اتحاف النبلاء۔ ص، ۲۲۱

آپ کے تقوی و دیانت میں یکتائے زمانہ ہونے کی تائید اس بات سے بھی ہو جاتی ہے کہ آپ ہر روز ایک سو رکعت نماز پڑھتے تھے اور قرآن کریم کی تلاوت کے علاوہ ذکر و مراقبہ میں بھی مصروف رہتے تھے۔ شیخ محسن بن یحیی ترہتی "الیانع الجنی" میں رقمطراز ہیں کہ :

"کان فقیہاً اصولیاً زاہد مجتہدلہ اختیارات فی المذہب ،
ومصنّفات عظیمۃ فی الفقہ والتفسیر والزہد وکان شیخہ المظہر
یفتخربہ "۔[1]

گویا قاضی صاحب ایسے شہباز علم تھے، جن کی علمی قوت پرواز کو دیکھ کر لوگ فخر سے عش عش کر اٹھتے تھے۔ قاضی صاحب بیاسی [82] برس کی عمر میں رجب ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ آپ کے جسد خاکی کو پانی پت میں سپرد خاک کیا گیا۔

تصنیف و تالیف :
==========

قاضی صاحب طالبان حق کے لیے چشمۂ حیات تھے۔ آپ نے تیں سے زائد مشہور عالم کتب تصنیف کیں۔ علم فقہ میں بلند مرتبہ رکھنے کے باعث کئی رسالے اور کتب تحریر کیں۔ علاوہ ازیں مشکل سوالات کے جوابات میں بہت سے خطوط بھی تحریر فرمائے۔

(۱) آپ کی سب سے مشہور اور اہم کتاب "تفسیر مظہری" ہے۔ یہ تفسیر سات جلدوں میں قرآن پاک کی ضخیم تفسیر ہے اور آپ نے اس کا نام اپنے مرشد کے نام پر رکھا ہے۔ اس کا فارسی ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔ اس تفسیر میں سادہ اور بے تکلفانہ اسلوب نگارش کو اختیار کر کے زمخشری اور بیضاوی کے اسلوب کی یاد تازہ کر دی ہے۔

(۲) مالا بدمنہ : فقہ حنفی کی یہ کتاب مدارس نظامیہ میں داخل نصاب ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ فقہی ترتیب کے ساتھ عقائد پر بے مثل کتاب ہے۔ اس کتاب کے آخر میں آپ نے ایک "وصیت نامہ" بھی منظم فرمایا ہے۔

۱۔ شیخ محسن بن یحیی ، الیانع الجنی ۔ ص۹۰۔

(۳) السیف المسلول یا شمشیر برہنہ : یہ کتاب شیعہ مذاہب کے رد میں شمشیر برہنہ کا کام دیتی ہے۔

(۴) حرمت متعہ : یہ بھی شیعہ مذاہب کے رد میں لکھی گئی ہے۔

(۵) ارشاد الطالبین : تصوف کے بارے میں تحریر کی گئی ہے۔

(۶) تزکرۃ الموتی والقبور (۷) تسذکرۃ المعاد ۔

(۸) حقوق الاسلام : یہ کتاب حقیقت اسلام کے نام سے بھی مشہور ہے۔

(۹) رسالہ حرمت واباحت سود (۱۰) رسالہ شہاب ثاقب (۱۱) رسالہ فی حکم الغناء

(۱۲) رسالہ فی العشر والخراج ۔

مندرجہ بالا کتب کے علاوہ دو رسائل "ماخذ الاقوٰی" اور "مختارات" کا ذکر صاحب "اتحاف النبلاء"[1] نے کیا ہے ۔ علاوہ ازیں مرزا مظہر جان جاناں نے سیرت رسول پاک کی خدمت اقدس میں ایک رسالہ (شاہ ولی اللہ کا تحریر کردہ) اور چند کتب قاضی صاحب کی خدمت اقدس میں بھیج کر فرمائش کی تھی کہ سیرت رسول پر ایک کتاب اپنے علم کے مطابق لکھیں ۔ قاضی صاحب نے یہ رسالہ حذف اسناد کے ساتھ چودہ کتابوں سے مع حوالہ تحریر فرمایا ۔ اس میں آنحضرت کے تمام افعال فقہی ابواب کے ساتھ جمع کر دیے تھے ۔ اس رسالے کے شروع میں اخلاق نبوی پر بھی ایک رسالہ ہے ۔ قاضی صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ مسوّدہ ابھی تک موجود ہے اور طبع نہیں ہوا ۔

مرزا حسن علی صغیر محدث لکھنوی

مرزا حسن علی صغیر بن عبدالعلی کا اصل نام محمد ، لقب میرک جمال الدین اور مرزا کے عرف سے مشہور تھے ۔ آپ لکھنؤ کے محلہ یحییٰ گنج میں پیدا ہوئے ۔ آپ علوی سادات ہونے کے باوجود اپنے آپ کو ہاشمی لکھتے تھے ۔ آپ نے لکھنؤ میں ملّا حیدر علی سندیلوی سے درسی کتب پڑھنے کے بعد دہلی کا

---

۱ ۔ نواب صدیق حسن خان ، اتحاف النبلاء ۔ ص ، ۲۲۰

۲ ۔ آپ کے عہد میں محلہ "محمود نگر" لکھنؤ میں ایک اور شخصیت مرزا حسن علی بھی تھے محلہ "یحییٰ گنج" میں رہائش رکھنے والے "صغیر" اور محلہ "محمود نگر" میں رہنے والے "کبیر" کہلواتے تھے ۔

سفر اختیار کیا ۔ دہلی میں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر سے مختلف علوم میں استفادہ کرنے کے علاوہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے بھی سند حدیث حاصل کی ۔ مرزا صاحب ، سید احمد شہید سے ہمیشہ عزت و احترام سے پیش آتے ۔ جب سید احمد شہید بغرض تجدید دین اور اسلاء کلمة اللّٰہ کی خاطر لکھنؤ میں وارد ہوئے تو مرزا حسن علی نے آپ کی بہت خاطر تواضع کی ۔ لکھنؤ میں قیام کے دوران میں سید صاحب ، مرزا صاحب کی دعوت پر جب دو مرتبہ آپ کے دولت کدہ پر تشریف لائے تو آپ نے از راہ تعظیم و تکریم چند چیزیں بھی آپ کی نذر کیں ۔

علم حدیث میں کامل عبور رکھنے کے باعث آپ نے اپنی تمام عمر توحید و سنت کی اشاعت اور رسوم بدعت کے ابطال میں گذار دی ۔ مرزا صاحب کا حلقۂ درس بہت وسیع تھا ۔ تشنگان علم حدیث اپنی پیاس بجھانے کے لیے دور دراز کے علاقوں سے جوق در جوق آتے اور آپ کی مجلس علمی سے سیراب ہو کر واپس جاتے ۔ آپ نے کلکتہ کے عوام کو اپنے وعظ و نصائح اور قوت بیانی سے بہت فائدہ پہنچایا ۔ آپ باندہ کے مقام پر بھی کچھ عرصہ ترویج و تدریس علم حدیث میں مصروف رہے ۔ اس دوران میں منشی خادم علی سندیلوی مولف " تاریخ جدولیہ " کے علاوہ بہت سے دوسرے لوگوں نے بھی آپ سے استفادہ کیا اور علمائے فرنگی محل آپ سے علم حدیث میں مکمل طور پر مستفید ہوئے ۔ آپ کی وجہ سے لکھنؤ کی درسگاہوں میں علم حدیث کا رواج عام ہوا اور سینکڑوں لوگوں نے آپ سے یہ علم سیکھا ۔

مرزا صاحب ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء میں فریضۂ حج کی ادائیگی سے سبکدوش ہو گئے تھے ۔ آپ اپنے زمانے کے نامور مدرس ، بلند پایہ محدث ، شیوہ بیان مقرر اور سحر طراز خطیب تھے ۔ تمام لوگ آپ کی تبحر علمی ، قوت بیان اور نکتہ دانی کے قائل تھے ۔

وفات :
=====

مرزا صاحب ، نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کے آخری زمانہ میں بمقام لکھنؤ چھبیس[26] صفر ۱۲۵۵ھ / ۱۸۳۹ء میں اس جہان فانی کو الوداع کہہ گئے (انا للّٰہ و انا الیہ راجعون) اور آپ کو وہیں دفن کیا گیا ۔

تلامذہ :

مرزا صاحب کے نامور تلامذہ میں سے مولانا حسین احمد ملیح آبادی ، مولانا اولاد حسن قنوجی ، مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی ، مفتی سعد اللہ مراد آبادی ، مولانا عبدالحکیم فرنگی محلی ، مولانا محمد علی صدر پوری ملیح آبادی ، مولانا ابو الخیر معین الدین المشہدی الکٹر دائی ، مولانا شاہ محمد سعید اور مولوی مسیح الدین کاکوروی کے علاوہ دیگر حضرات نے مختلف مقامات پر مختلف علوم میں استفادہ کیا ۔

تصنیفات :

مرزا صاحب کی کتب میں " تحفة المشتاق فی بیان النکاح والصداق " رسالہ قوس وقزح برهان الخلافة وفتاوی ، حاشیہ ابی داؤد اور حاشیہ جامع ترمذی زیادہ مشہور ہیں ۔ مندرجہ بالا کتب میں سے اوّل الذکر دونوں کتب طبع ہو چکی ہیں ۔

شاہ غلام علی دہلوی

شاہ عبداللہ عرف شاہ غلام علی بن عبداللطیف ۱۱۵۸ھ / ۱۷۴۵ء میں بمقام بٹالہ (پنجاب) میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم کا آغاز بھی بٹالہ شہر سے ہی کیا ۔ اس کے بعد دہلی کا سفر اختیار کیا اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے " صحیح بخاری " پڑھنے کے بعد ان سے سند حدیث حاصل کی ۔ ۱۱۸۰ھ / ۱۷۶۷ء میں بائیس[۲۲] سال کی عمر میں حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے ہاتھ پر سلسلہ مجددیہ میں بیعت کرنے کے بعد طریقہ نقشبندیہ میں بیعت کی اور طریقہ نقشبندیہ مجددیہ کی اشاعت شروع کر دی ۔ مرزا مظہر جان جاناں کے انتقال پر آپ ان کی جگہ خانقاہ کے خلیفہ مقرر ہوئے ۔ ہندوستان ، کابل ، بلخ ، بخارا ، عرب اور روم سب مقامات پر اپنی حیات مبارک میں ہی خلفاء بھیج

دیے تھے ، جس کے باعث تمام جگہوں پر آپ کا فیض جاری ہوا ۔ آپ ابتدائی قبولیت کے آغاز کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ " اوائل میں مجھ کو معاش کی نہایت سختی ہوئی ۔ کچھ قدر سے وجہ معاش تھی ۔ اس کو چھوڑ کر بالکل توکل اختیار کیا ۔ ایک ٹوٹے ہوئے کا بچھونا اور اینٹ سرہانے ہوتی تھی ۔ ایک مرتبہ شدّت ضعف بھوک میں میں نے حجرہ کا دروازہ بند کر دیا اور دل میں عہد کرلیا کہ بس یہیں میں تہرہے کہ اسی اثناء میں ایک شخص آیا اور اس نے کہا ، دروازہ کھولو ۔ میں نے نہ کھولا پھر اس نے کہا کہ دروازہ کھولو ، مجھ کو تم سے کچھ کام ہے پھر بھی میں نے نہ کھولا ۔ آخرکار وہ کواڑ کی شگاف کی راہ سے پانچ روپے ڈال گیا " ۔[1] چنانچہ یہاں سے یہ عالم شروع ہوا کہ تقریباً " ۲۰۰ علماء و صلحاء بیک وقت دور دراز کے ممالک سے آ کر وہاں قیام کرتے اور آپ کی اجازت و خلافت سے مشرف ہو کر اپنے وطن واپس لوٹ جاتے ۔

زاہد و عابد عالم :

شاہ غلام علی صاحب حافظ قرآن ، حدیث و تفسیر و فقہ کے کامل عالم تھے ۔ آپ کا روزمرّہ کا معمول تھا کہ خود نماز تہجّد پڑھ کر مراقبہ یا تلاوت کلام پاک میں مشغول ہو جاتے تھے اور روزانہ دس سپارے پڑھتے تھے ۔ صبح کی نماز اوّل وقت میں پڑھ کر اشراق کے وقت تک حلقہ مراقبہ میں مصروف رہتے ۔ ہجوم کے باعث کئی دفعہ حلقہ فرمایا کرتے تھے ۔ پہلی مرتبہ جو حضرات تشریف فرما ہوتے ، وہ اٹھ جاتے تو ان کی جگہ اور لے لیتے تھے ۔ نماز اشراق کے بعد طلباء کو تفسیر و حدیث کا درس دیتے اور اس دوران میں اگر کوئی ملاقاتی تشریف لاتا تو یہ کہہ کر ، کہ فقیر ابھی گور و موت کی فکر میں مشغول ہے ، رخصت کر دیتے ۔ زوال کے قریب تھوڑا سا کھانا تناول فرماتے ۔ کھانا کھانے کے بعد تھوڑا سا قیلولہ کرتے ۔ بعد ازاں کتب دینیہ مثلاً " نفحات ، آداب المریدین اور ضروری تحریروں میں مصروف ہو جاتے ۔ نماز ظہر ادا کرنے کے بعد نماز عصر تک فقہ و حدیث و تصوف کا درس دیتے ۔ نماز عصر ادا کرنے کے بعد صبح کی طرح

---

۱ ۔ محمد حسن ، حالات مشائخ نقشبندیہ مجدّدیہ ۔ ص، ۲۱۷

پھر اپنے طلباء کی طرف متوجہ ہوتے اور کتب حدیث و تصوف مثلاً "مکتوبات امام ربّانی ، عوارف اور رسالہ قشیریہ کا وعظ فرماتے اور نوجوانوں کی اصلاح مراقبہ اور اصلاحات تصوف کے مطالب سمجھانے میں مصروف ہو جاتے۔ مغرب کی نماز کے بعد خاص خاص مریدوں کی طرف توجّہ فرماتے۔ نماز عشاء کے بعد بھی اکثر شب جاگ کر ہی گزارتے۔ اگر کبھی نیند کا غلبہ ہوتا تو داہنی کروٹ کچھ دیر کے لیے سو جاتے۔

آپ کے مزاج میں ترک و تجرید ، طبیعت میں دنیا سے بیزاری اور غیبت سے نفرت تھی۔ امراء آپ کے لیے عمدہ عمدہ کھانے پکا کر بھیجتے لیکن انہیں نہ تو آپ خود کھاتے اور نہ ہی طلباء میں تقسیم کرتے بلکہ ہمسایوں میں بانٹ دیتے تھے۔ اگر کوئی رقم آپ کی نذر کی جاتی تو اس کا چالیسواں حصّہ اسی وقت الگ کر کے زکوٰۃ دے دیتے اور باقی ماندہ رقم سے حلوا وغیرہ پکوا کر بوڑھوں کمہاروں کے نام سے نیاز دے دیتے یا اگر خانقاہ کے فقراء کے اخراجات کی وجہ سے قرض دینا ہوتا تو وہ ادا کر دیتے۔ آپ کی خانقاہ کے باورچی خانہ میں کم از کم پانچ ⁵⁰⁰ سو لوگ روزانہ کھانا کھاتے تھے اور سب کا خرچ آپ کے ذمہ تھا حالانکہ نواب امیر الدولہ ، امیر محمد خان والیٔ ٹونک نے وظیفہ کے تقرر کی درخواست کی لیکن آپ نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ ہماری جاگیر مواعید الٰہی ہیں ، و فی السماء رزقکم وما توعدون۔

لباس ہمیشہ موٹے کپڑے کا پہنتے تھے۔ اگر کوئی شخص عمدہ اور نفیس کپڑے بنوا کر بھیجتا تو اس کو فروخت کر کے چند کپڑے خرید کر اللہ کے نام پر دے دیتے اور فرماتے کہ ایک کی بجائے زیادہ لوگ پہنیں تو اچھا ہے۔

اپنے استاد کی عزت و احترام اس حد تک کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص اپنا کوئی مسئلہ لے کر آتا تو اس مسئلے کا حل تو بتا دیتے لیکن فرماتے کہ اگر زیادہ تحقیق مقصود ہے تو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے کر لو۔ اس معاملہ میں آپ مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سختی سے پابند تھے۔ اکثر فساق و فجار آپ کی توجّہ سے تائب ہو کر راہ راست پر آئے۔

رسول پاک سے بے انتہا عشق تھا ۔ اس لیے سنت رسول کے بہت پابند تھے ۔ اگر کوئی آپ کے سامنے رسول پاک کا نام لیتا تو خوشی سے جھومنے لگتے ۔

طبیعت میں اس قدر حلم و بردباری تھی کہ اکثر لوگ آپ سے پڑھنے کے لیے کتابیں لے جاتے اور پھر آپ کے پاس ہی فروخت کرنے کے لیے آتے اور آپ قیمتاً ان سے کتابیں خرید لیتے ۔

شاہ صاحب تین قسم کے اولیاء اور تین کتب کی بہت تعریف کرتے تھے ۔ اولیاء میں ارباب کشف ، ارباب ادراک اور ارباب جہل اور کتب میں " قرآن پاک " ، صحیح بخاری اور مثنوی مولانا روم ہیں ۔

سرسید احمد خان آپ کی تعریف میں رقمطراز ہیں :

" میرا کیا مقدور ہے کہ آپ کے کمالات ظاہری اور مقامات باطنی کا حال لکھ سکوں کیونکہ حالات آپ کے اس کے سوا ہیں جو بیان ہو سکیں ـــــــ سبحان اللہ علم و عمل اور فضل و کمال اور تجرید و تجرد اور حلم و کرم اور سخاوت اتم اور ایثار و انکسار آپ کی ذات پر ختم ہے ۔ آپ کی ذات فیض آیات سے تمام جہان میں فیض پھیلا اور ملکوں ملکوں کے لوگوں نے ان کی بیعت اختیار کی ۔ میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم اور شام اور بغداد اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہو کر بیعت کی " ۔[1]

گویا شاہ غلام علی کی خانقاہ میں تشنگان علم کا دور و نزدیک سے جمگھٹا لگا رہتا تھا ۔

شاہ صاحب ۲۲ صفر یوم شنبہ ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء میں اس دار فانی کو الوداع کہہ گئے ۔ حضرت شاہ ابو سعید نے جامع مسجد میں نماز جنازہ پڑھائی اور حسب وصیت جنازے کو آثار شریف لایا گیا اور وہاں سے لاکر حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے پہلو میں دفن کیا گیا ۔

---

۱ ۔ سرسید احمد خان ، آثار الصنادید ۔ ص ، ۱۵ ، ۱۶ ، ۱۸

مولوی عبدالرحیم گورکھپوری

علوم جدیدہ کے داعی علامہ عبدالرحیم بن صاحب علی گورکھپوری ، جو "عبدالرحیم دھری" کے نام سے مشہور ہیں ، شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں ۔ شاہ عبدالعزیز کے مدرسہ میں آپ شاہ اسمٰعیل شہید کے ہم درس تھے ۔ علامہ صاحب اپنی تبحر علمی اور رسائی ذھن و فکر کے باعث تمام علوم عقلیہ و نقلیہ میں یگانۂ روزگار تھے ۔ علوم عقلیہ میں تو کوئی ان کا ثانی نہ تھا ۔ ابوالکلام آزاد رقمطراز ہیں کہ " شاہ صاحب کے حلقۂ تلامذہ میں ، جو اس وقت علمی جماعتوں کا خلاصہ و عطر تھا ، کوئی شخص ان کی ٹکر کا نہ تھا ۔ معقولات کے حافظ تھے اور ھنگامہ درس ایسے ایسے اعتراضات اور ایسے ایسے نکتے اور پہلو تراشتے تھے کہ شاہ صاحب کو بھی اعتراف کرنا پڑتا تھا " ۔[1]

شاہ صاحب آپ کی اس رسائی ذھن و فکر کو دیکھ کر کہا کرتے تھے کہ عبدالرحیم تمہاری ذھانت اور طباعی کے پیچھے دھریت کھڑی نظر آتی ہے چنانچہ دھلی میں شاہ صاحب سے علوم کی تکمیل کے بعد آپ زبان و علوم کے شوق میں دلی سے کلکتہ روانہ ہوئے اور فورٹ ولیم کالج میں بحیثیت مدرس ملازمت اختیار کرلی ۔ انگریزی حکومت اور اس پر مستزاد یہ کہ ان کے ھاں ملازمت کرنے کے باعث اپنے اندر علمی انقلاب کو محسوس کرتے ہوئے یورپ کے علوم اور نئی نئی زبانیں سیکھنے کا شوق پیدا ہوا ۔ ھندوستان میں یورپین علماء میں سے ڈاکٹر مارٹن جو مختلف زبانوں کی بہت اچھی استعداد رکھتے تھے ، ان کی صحبت میں رہ کر انگریزی اور لاطینی زبان پر عبور حاصل کیا ۔ انگریزی زبان کے لب و لہجہ اور فصاحت و بلاغت کے باعث بڑے بڑے انگریز مقرر اس شخصیت سے بہت متاثر ہوئے ۔ علامہ صاحب انگریزی کی طرح لاطینی ، عربی ، فارسی ، ترکی ، پشتو اور ھندوستان کی زبانوں پر بھی مکمل طور پر حاوی تھے ۔ اسی وجہ سے آپ " دھری " اور " ملحد " مشہور ہوگئے ۔ اس زمانے میں انگریزوں کے ھاں مسلمانوں کے ملازمت کرنے کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا مثلاً شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی اللہ کے ھاں فاقوں کی نوبت آنے پر جب مفتی صدرالدین ، " صدرالصدور دھلی " نے تین سو روپیہ آپ کی نذر کیا تو آپ نے

۱۔ عبدالرزاق ملیح آبادی ، ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی ۔ ص ، ۳۷۲

محض اس لیے لیجے سے انکار کر دیا کہ تم انگریزوں کی نوکری کرتے ہو ، اس لحاظ سے عبدالرحیم گورکھپوری بھی ایک محدود مقام سے باہر نکل آئے تھے اور انہوں نے نہ صرف انگریزوں کی ملازمت اختیار کی بلکہ یورپ کی زبانوں پر بھی کامل عبور حاصل کرنے کی بڑی بڑی کوشش کی، جس میں آپ کامیاب رہے نتیجتاً علوم عقلیہ میں اشتغال وانہماک کے باعث آپ "دھری" مشہور ہوگئے ورنہ آپ کی تصنیفات میں آپ کی "دھریت" کا ذرّہ بھر شائبہ بھی موجود نہیں - گویا علوم جدیدہ کے داعی ، سرسید احمد خان سے پہلے بھی مسلمان علماء میں انگریزی زبان اور دیگر نئے علوم کے بہت سے حامی گزر چکے ہیں ، جن میں سب سے مقدم علامہ عبدالرحیم گورکھپوری ہیں -

تصنیفات:

علامہ صاحب نے متعدد زبانوں اور علوم پر حاوی ہونے کے باعث کافی کتب تصنیف کیں، جن میں چند ایک کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے -

(۱) جامع العلوم : یہ کتاب ریاضیات میں جدید تقسیم اور اضافات کے ساتھ عربی زبان میں تحریر کی ہے جو فورٹ ولیم کالج پریس سے طبع ہوچکی ہے - اس کتاب کا آغاز ریاضی سے کرتے ہوئے تمام علوم اس میں جمع کر دیے ہیں -

(۲) جرِّ ثقیل : یہ رسالہ عربی زبان میں جدید علم میکانک کے اصولوں پر تحریر کیا ہے -

(۳) پند نامہ : "گلستان" کی طرز پر چھوٹے چھوٹے پند اس فارسی رسالے میں لکھے ہیں اور عربی الفاظ سے پورے طور پر اجتناب کیا ہے -

(۴) کارنامہ حیدری : یہ کتاب سلطان ٹیپو اور اس کے باپ حیدر علی کے بارے میں تحریر کی اور نہایت اہتمام سے تصاویر تیار کر کے کتاب میں شامل کی ہیں -

(۵) عرض داشت درباب ضرورت ترویج زبان انگریزی وعلوم فرنگ : یہ رسالہ اس وقت کے حکام تعلیم کے ایک سوال کا جواب ہے - اس رسالے میں علامہ صاحب نے علوم میں انقلاب محسوس کرتے ہوئے انگریزی زبان کی ضرورت پر صرف علمی حیثیت سے زور دیا ہے اور صرف ان علوم کی تحصیل کو ہندوستان کی ترقی و تقدّم کا راستہ بتایا ہے -

(۶) صولت ضیغم : "شاہنامے" کے وزن پر ٹیپو سلطان کا معرکہ نظم کیا ہے -

(۷) مثنوی : پرنس اعظم شاہ کی فرمائش پر ایک فارسی مثنوی تحریر کی ہے -

(۸) جان مارش کلارک کی "ہسٹری آف انڈیا" کا نہایت فصیح و بلیغ اور بامحاورہ فارسی ترجمہ کیا ، جس میں عربی الفاظ کے استعمال سے مکمل طور پر احتیاط کی ہے -

(۹) عربی اور فارسی دونوں زبانوں کی فضیلت میں مقابلہ کرتے ہوئے ایک رسالہ لکھا لیکن اس میں عربی کی بجائے فارسی زبان کی فضیلت کی طرف مائل ہوگئے -

(۱۰) علاوہ ازیں "الانوار المشرقہ فی الاسرار المنطقیۃ" اور التالیفات التشہیلیۃ السی رسالۃ الاسرار المنطقیۃ" بھی آپ کی اچھی تصنیفات ہیں -

-----

باب — چہارم

شاہ صاحب کی دینی وعلمی خدمات (تصانیف) ، شاہ صاحب کی عربی خدمات

(الف) شاہ عبدالعزیز کی نامور شخصیت بحیثیت مصنف ،
تفسیر فتح العزیز ، عجالہ نافعہ ، بستان المحدثین ، فتاوی عزیزی
تحفہ اثنا عشریہ ، سرّ الجلیل فی مسئلۃ التفضیل ، ملفوظات
شاہ عبدالعزیز ، وسیلۃ النجات ، عزیز الاقتباس فی فضائل
اخبار الناس ، سرّ الشہادتین ۔

(ب) شاہ صاحب کی عربی خدمات

شاہ عبدالعزیز کی نامور شخصیت بحیثیت مصنّف :

مغلیہ سلطنت کے دور آخر میں مسلمانان ھند کے سیاسی انحطاط ، اخلاقی اقدار کی پامالی، معاشرتی تباھی وبربادی اور معاشی بدحالی کے باعث تعلیمی ومذھبی معیار بے حد پست ھوچکا تھا۔ اس پرآشوب اور پرفتن دور میں ھندوستان کے مدارس میں عربی اور فارسی کی معمولی تعلیم کا اندازہ اس دور کی مروجہ نصابی کتب مثلاً "گلستان ابوالفضل ، بہار دانش ، انوار سہیلی ، یوسف زلیخا اور سکندرنامہ سے ھوسکتا ھے ۔ تفسیر ، حدیث اور فقہ کی عربی تعلیم کے باوجود بھی ان علوم کی کتب کسے پڑھنے کا کوئی رواج نہ تھا ۔ قرآن پاک کا مطالعہ صرف مریضوں کی جھاڑپھونک کے لیے کیا جاتا تھا ۔ بعض لوگ ان علوم کی تعلیم کے علاوہ دیگر علوم وفنون کی تحصیل ناجائز اور حرام تصوّر کرتے تھے۔ فتنوں اور مصائب کے اس دور میں اللہ تعالیٰ نے سلوک راہ عرفان میں طالبین کی راھنمائی واصلاح اور اسلام کی تبلیغی خدمات کے لئے مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی جیسی بلند پایہ اور معزز و نامور شخصیت کو منتخب کیا ۔ شاہ عبدالعزیز کو تمام علوم عقلیہ اور فنون نقلیہ پرکامل دسترس حاصل تھی ، جس کی تائید میں انتظام اللہ شہابی رقمطراز ھیں کہ :

"شاہ عبدالعزیز دھلوی ابن شاہ ولی اللہ محدث کا براعن کابر در حدیث وفقہ اصول و علوم عربیت خاصہ لغت مشہور اند "۔[1]

شاہ صاحب نے تیرہ برس کی عمر میں کتب درسیہ ، صرف ونحو ، فقہ ، اصول فقہ ، کلام ، عقائد ، ھندسہ ، ھیئت اور ریاضی وغیرہ میں خاصی مہارت حاصل کرلی تھی ۔ آپ کو نہ صرف ان علوم میں شہرت ونامبری اور فوقیت وعظمت حاصل تھی بلکہ فارسی اردو ، عربی اور عبرانی زبانوں پرعبور رکھنے کے علاوہ تاریخ اور جغرافیہ کے متعلق بھی کافی معلومات رکھتے تھے ، جیسا کہ آپ کے علوم کے متعلق صاحب علم وعمل لکھتے ھیں کہ :

۱۔ انتظام اللہ شہابی ، تراجم الفضلاء ۔ ص، ۱۶

"آپ علم تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت اور تاریخ میں شہرہ آفاق تھے اور ھیئت، ھندسہ، مجسطی، مناظر، اصطرلاب، جرثقیل، طبعیات، الہیات، منطق، اتفاق، اختلاف، ملل ونحل، قیافہ، تاویل، تطبیق، مختلف اور تفریق مشتبہ میں یکتائے زمانہ تھے۔ فن ادب اور ہر قسم کے اشعار سمجھنے میں بلند مرتبہ رکھتے تھے"۔ ۱

گویا شاہ صاحب نے اس ماحول کی بداعمالیوں کے استحصال کے لیے جرأت مندانہ قدم اٹھاتے ہوئے اس بگڑی ہوئی قوم کو پوری توجہ اور سرگرمی سے مندرجہ بالا تمام علوم و فنون کی طرف متوجہ اور راغب کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں اپنی مسلسل مساعی جمیلہ اور انتھک تبلیغی جد وجہد سے اخلاقی، مذہبی اور تعلیمی حالت کو بہتر بنا دیا نتیجتاً آپ کی ان تبلیغی کوششوں سے ہر جگہ مذہب اور دین عام ہوگیا۔ مساجد میں نمازیوں کی تعداد میں اضافے کے باعث جگہ ملنی مشکل ہوگئی تھی۔ قرآن پاک کی تعلیم کی طرف میلان اتنا بڑھ گیا تھا کہ سب سے پہلے بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم کی طرف رغبت دلائی جاتی تھی کہ مسجدوں، خانقاہوں میں تعلیم قرآن کے مکاتیب اور مدارس قائم ہوگئے۔

علم وفضل میں ممتاز ہونے کے باعث مسند درس و خلافت پر فائز ہوتے ہی درس و تدریس، ہدایت و ارشاد، فصل خصومات و پند و موعظت، افتاء تصنیف و تالیف اور شاگردوں کی اعلیٰ پیمانے پر تعلیم و تربیت کو اپنا شعار بنایا۔ علوم اسلامیہ خصوصاً حدیث و فقہ کی درس و تدریس سے مسلمانوں میں اصلاحی روح پھونکتے ہوئے عظیم انقلاب پیدا کیا۔ ایسے سیاسی انتشار اور ناسازگار حالات میں دہلی میں بیٹھ کر دین اسلام اور اہل سنت والجماعت کی حمایت و حفاظت کرتے ہوئے مدرسہ عزیزی کو چار چاند لگا دیے۔

شاہ صاحب اپنے زمانے کے مرجع علماء و مشائخ تھے۔ دنیوی جاہ وعزت اور احترام عظیم کے ساتھ ساتھ باطنی کمالات بھی رکھتے تھے۔ آپ کا شمار مجتہد علماء اور مستند دینی فضلاء میں ہوتا ہے۔

۱۔ وقائع عبدالقادر خانی، علم وعمل۔ جلد ۲، ص ۲۲۶

آپ اپنے زمانے میں ہندوستان کے معزز ترین عالم دین تسلیم کیے جاتے تھے ۔ علوم کی تحقیقات اور مخالفین کے ساتھ مذاکرہ و مباحثہ میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز مقام رکھتے تھے ۔

حکومت ہند نے آپ کو علامہ تفضّل حسین کے ذریعے کلکتہ کے مدرسہ عالیہ کی صدارت کی پیش کش کی لیکن آپ نے شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کو عوام تک پہنچانے ، درس و تدریس اور وعظ و خطابت سے عوام الناس کو رشد و ہدایت کی طرف لانے اور علوم اسلامی کی اشاعت کو اس دنیاوی عزّ و جاہ پر ترجیح دی ۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اپنی مشہور و نامور شخصیت اور علمی قابلیت کے باعث اپنے جلیل القدر خاندان کو تمام دنیا سے روشناس کروایا ہے ۔ درحقیقت اگر ہندوستان میں یہ قابل احترام خاندان اور شاہ عبدالعزیز کی مقبول و معروف ذات گرامی موجود نہ ہوتی تو اس خاندان کو یہ شہرت و ناموری حاصل نہ ہوتی اور سرزمین ہندوستان کے باشندے بھی گمنامی کے اندھیروں میں بھٹکتے رہتے ۔

شاہ صاحب کی شخصیت بہترین انسانی ہمدردی ، ذاتی خوبیوں اور علمی کارناموں کے باعث خاص طور پر قابل ذکر ہے ۔ شاہ صاحب کی گوناگوں علمی و ادبی صلاحیتوں کا اندازہ آپ کی قابل قدر تصنیفات سے ہوتا ہے ۔ مختلف مواقع پر خاص ضرورت کے تحت لکھی گئی یہ کتب آپ کی بے نظیر یادگار ہیں اور آپ کے یہ علمی و ادبی جواہر ریزے آج بھی نہ صرف ہندوستان و پاکستان بلکہ پوری اسلامی دنیا میں نہایت مقبولیت کا درجہ رکھتے ہیں ۔ آپ کی ہر تصنیف اپنی جگہ علم کا ایک نفیس ذخیرہ ہے ۔ شاہ صاحب ہر مکتبہ خیال کے اہل سنت حضرات میں مقبول و معروف سربرآوردہ عالم اور ارباب تصوف کے ایک مایہ ناز بزرگ ہیں اور آپ کا شمار اسلامی ہند کے صف اوّل کے علماء میں ہوتا ہے ۔

آپ کے علمی کارناموں میں آپ کی تصنیف " تحفہ اثنا عشریہ " یقیناً آپ کا قابل ذکر اور اہم ترین کارنامہ ہے اور اپنے موضوع پر حرف آخر ہے ۔ اس کے علاوہ شاہ صاحب کی تفسیر " فتح العزیز " بھی اپنی جگہ انتہائی اہمیت کی حامل ہے ۔ اس تفسیر کو شاہ صاحب نے انتہائی کمزوری کی حالت میں املا فرمایا تھا ۔ اس کے علاوہ شاہ صاحب کے بہت سے رسائل اور متعدّد کتب کی شروح ، حواشی اور تعلیقات

بھی تحریر فرمائیں ، جن میں مندرجہ ذیل مشہور و معروف ہیں ۔

تفسیر فتح العزیز ، عجالہ نافعہ ، بستان المحدثین ، فتاوی عزیزی ، تحفہ اثنا عشریہ، سرّ الجلیل فی مسئلۃ التفضیل ، ملفوظات شاہ عبدالعزیز ، وسیلۃ النجات ، عزیز الاقتباس فی فضائل اخیار الناس اور سرّ الشہادتین ، اب ان میں سے ہر ایک کا سرسری جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

فتح العزیز المعروف بہ تفسیر عزیزی :

رئیس العلماء ، افضل الفضلاء شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی قرآن پاک کی تفسیر "فتح العزیز" اپنی نوعیت میں تمام دوسری مضبوط تفاسیر سے ممتاز ہے۔ یہ تصنیف ایک بلند درجہ کی تفسیر ہونے کے باعث علمی معیار پر پوری اترنے کے لحاظ سے خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اس تالیف میں نظم قرآنی اور تفسیری نکات کے خوبصورت جوڑ سے شاہ صاحب کی علمی و ادبی صلاحیتوں کا اندازہ لگانا بہت آسان ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب خود بھی اپنی اس معرکۃ الارا تفسیر پر خوشی اور فخر محسوس کرتے ہوئے اپنے شاگرد مرزا حسن علی محدث کے ایک خط کے جواب میں ، جو دراصل "تحفہ اثنا عشریہ" کے معترضین کے لیے تحریر کیا تھا ، فرماتے ہیں :

"ومعہذا جائے طعن معاندان وحاسدان وقتی متوجہ فقیر می تواند شد کہ این فقیر دعوی تصنیف این کتاب را موجب افتخار خود دانستہ تقریراً وتحریراً بقلم زبان یا بزبان قلم کردہ باشد معلوم صاحب است کہ این کتاب را تصنیف حافظ غلام حلیم ابن شیخ قطب الدین احمد بن شیخ ابو الفیض نوشتہ ام اگر منظور دعوی نسبت این کتاب خود می بود چرا این قدر اخفا بنا مہائے غیر معروف بعمل می آوردم بلکہ حالا ہم ہرگز بہ نسبت این کتاب بطرف خود خوش نمیشوم آرے اگر تفسیر فتح العزیز وامثال این تصانیف را اگر بہ فقیر نسبت کنند موجب شادمانی خاطر می گردد "۔[1]

۱۔ شاہ عبدالعزیز ، فتاوی عزیزی ، ج ۔ ۱ ، ص ۱۳۰ ، ۱۲۰

گویا شاہ عبد العزیز اپنے اس گران قدر اور مایہ ناز ادبی شہ پارے پر بہت مسرّت و شادمانی کا اظہار فرماتے ہیں ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا شاہ صاحب نے پورے قرآن پاک کی تفسیر لکھ کر اس کا نام " فتح العزیز " رکھا یا اس وقت دستیاب شدہ صرف سوا تین سپاروں (شروع کے سوا سپارہ سے کچھ زائد اور آخری دو سپارے) کی تفسیر تحریر فرمائی ۔ اس (تفسیر) کے متعلق مختلف الخیال قسم کی روایات ملتی ہیں ۔ بعض لوگوں کے خیال میں آپ نے پورے قرآن کی تفسیر لکھی تھی ، جس کا کافی حصّہ ہندوستان کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں ضائع ہوگیا اور کچھ روایات سے اس بات کا اندازہ لگایا جاتا ہے کہ آپ نے صرف سوا تین سپاروں کی تفسیر تحریر فرمائی تھی ۔

شاہ صاحب نے ۱۲۰۸ھ / ۱۷۹۳ء میں " جب کہ آپ بے شمار مہلک امراض میں مبتلا تھے اور آپ کی بینائی بھی تقریباً ختم ہو چکی تھی ، یہ تفسیر تحریر فرمائی جیسا کہ خود " فتح العزیز " کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ " تفسیر لکھنے کا مقصد مولانا شاہ فخر الدین صاحب کے مرید شیخ مصدق الدین عبد اللہ کی خواہش اور ان کا شوق تھا چونکہ بصارت اس وقت تقریباً زائل ہو چکی تھی ، اس لیے یہ تفسیر خود تحریر کرنے کی بجائے املا فرمائی تھی " ۔[1]

مندرجہ بالا بیان کے بعد عام خیال یہی کیا جاتا ہے کہ آپ نے اتنی ہی تفسیر تحریر فرمائی جتنی کہ آج قلمی یا شائع شدہ شکل میں دستیاب ہے ۔ اس کی تائید میں صاحب تذکرہ علمائے ہند " تفسیر سورۃ بقرۃ دو پارہ اخیر قرآن مجید از تصانیف " [2] جیسے الفاظ لکھتے ہیں ۔ اسکے باوجود بھی چند حقائق کی روشنی میں مندرجہ بالا بیان کی تردید ہوتی ہے کہ آپ نے پورے قرآن مجید کی تفسیر لکھی تھی اور اس خیال کی تائید میں صاحب " مقالات طریقت " لکھتے ہیں کہ " شاہ صاحب اپنی زندگی میں اس (تفسیر) کو مکمل نہ کر سکے ، اسلئے آپ کے تلمیذ مولانا حیدر علی فیض آبادی (متوفی ۱۲۹۹ھ) صاحب منتہی الکلام نے نواب سکندر بیگم والیہ بھوپال کی خواہش پر اس کو

---

۱ ۔ شاہ عبد العزیز ، مقدمہ فتح العزیز ، جلد ۔ ۱ ، ص ۳۰
۲ ۔ رحمان علی ، تذکرہ علمائے ہند ۔ ص ۱۲۲

ستائیس جلدوں میں مکمل کیا ۔ اور حضرت شاہ صاحب قدس سرّہ کی یہ فارسی تفسیر اکبرآباد کے قاضی کے ہاں موجود ہے مگر چھپی نہیں " ۔[۱] اسکے علاوہ شاہ عبدالعزیز کی تصانیف کی مختلف عبارات سے یہ بات مکمل طور پر واضح ہوجاتی ہے کہ آپ نے پورے قرآن مجید کی تفسیر لکھی تھی ۔ آپ اپنی تصنیف "فتاوی عزیزی " میں متعدد مقامات پر آیات کی تفسیر کرتے ہوئے "فتح العزیز " کا حوالہ دیتے ہیں ۔ مثلاً " ثم انشأنا من بعدهم قرناً اخرین " الخ ' کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔ " نقلا هذه التفسیر من کتاب " فتح العزیز " ۔[۲] پھر ایک دوسری جگہ " کلما نضجت جلودهم بدّلناهم جلوداً غیرها لیذوقوا العذاب " الخ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ " تفسیر فتح العزیز میں سورۃ نساء کی تفسیر میں اس آیت کے بیان میں لکھا ہے " ۔[۳]

ایک دوسری جگہ پر " وهو الذی خلق السموات والارض فی ستة ایام " کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں " چنانچہ تفصیل آن دفعات در سورۂ سجدہ مذکور است ودر تفسیر فتح العزیز شرح آن بوجہ متوفی مذکور شد چون این وقت حواس درست نبود نقل از مسودہ آن ممکن نشدہ " ۔[۴]

پھر ایک اور مقام پر " وانّا عرضنا الامانة " کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ " نقلاً من مسودة فتح العزیز فی سورة آل عمران قوله تعالی قل آمنا بالله وما انزل علینا فقط " ۔[۵]

ان تمام سورتوں کی تفسیر کے حوالہ جات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ شاہ صاحب یقیناً پورے قرآن پاک کی تفسیر احاطۂ تحریر میں لا چکے تھے لہذا اگر ایک طرف صاحب " تذکرہ علمائے ہند " کے قول اور اس دور میں دستیاب شدہ فقط سوا تین سپاروں کی تفسیر کو درست مان لیا جائے تو پھر قدیم تذکرہ نگار " صاحب مقالات طریقت " کا یہ قول کہ " شاہ صاحب کی یہ مکمل تفسیر اکبرآباد کے قاضی کے پاس موجود ہے " اور " فتاوی عزیزی " میں مختلف آیات کی عبارات کے تحت دیے گئے " فتح العزیز " کے حوالے غلط ہوجائیں گے ، جو سراسر زیادتی ہے اور شاہ صاحب کی تصانیف کو جھٹلانے کے مترادف ہے اور پھر " صاحب مقالات طریقت " اور خود " فتاوی عزیزی " میں شاہ صاحب کسی تفسیر

---

۱ ۔ عبدالرحیم ضیاء ، مقالات طریقت ، ص ۳۳ ۔
۲ ۔ شاہ عبدالعزیز ، فتاوی عزیزی ، ج ۲ ، ص ۲۲۰
۳ ۔ ایضاً ۔ ج ۲ ، ص ۲۲۰
۴ ۔ ایضاً ۔ ج ۲ ، ص ۲۲۰
۵ ۔ ایضاً ۔ ج ۲ ، ص ۲۹۰

"فتح العزیز" کے حوالے دینے کی تائید میں ایک اور شہادت پیش کی جاتی ہے، جو شاہ صاحب کے سوانح نگار پروفیسر عضد الدین تحریر کرتے ہیں کہ "اس تفسیر کے چند اوراق قلمی شکل میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانے میں نمبر ۲۲۷ کے تحت موجود ہیں اور یہ اوراق شاہ عبدالعزیز دہلوی کے نام منسوب ہیں اور اس میں سورۃ مائدہ کی آیت ۳۷ تک کی تفسیر ملتی ہے۔ اس مخطوطہ کے آخر میں یہ عبارت درج ہے۔

"شاہ عبدالعزیز هشتم جمادی الاوّل روز پنجشنبه درلکھنؤ درعمل نصاری ۱۲۲۷ھ

الحمد للہ رب العالمین صلوۃ اللہ و سلامہ علی محمد خیر خلقہ واصحابہ اجمعین"

پھر لکھتے ہیں کہ "یہ تفسیر مجھے اپنے ایک محترم بزرگ مولانا مسیح الزمان صاحب قاسمی کے ذاتی کتب خانہ میں ملی ہے، جو سورۃ المومنین سے لے کر سورۃ یسین تک کی فارسی تفسیر اور ۲۵۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب مطبع انصاری دہلی سے شائع ہو چکی ہے لیکن اس پر سن طباعت درج نہیں ہے البتہ کتاب کے مقدمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تیرھویں صدی ہجری کے نصف آخر/شائع کی شدہ ہے"۔[1]

لہٰذا ان شواہد کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ شاہ صاحب نے پورے قرآن مجید کی تفسیر تحریر فرمائی تھی۔ ممکن ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے یہ تفسیر بذات خود نہ لکھی ہو چونکہ شاہ صاحب نے اپنے درس میں پورے قرآن پاک کی تفسیر فرما دی تھی، اس لیے آپ کے کسی شاگرد نے آپکے درس قرآن کے دوران میں ہی مکمل قرآن مجید کی تفسیر لکھ لی ہو۔ شاہ صاحب نے سورۃ بقرۃ کے تیسویں رکوع کی دوسری آیت کی نامکمل تفسیر کی ہے اور آخری جملہ بھی پورا نہیں کیا۔ یہ تفسیر شاہ صاحب نے ۱۲۰۸ھ میں تحریر فرما دی تھی اور اس تفسیر کے اکتیس[۳۱] سال بعد ۱۲۳۹ھ میں شاہ صاحب کا انتقال ہوا تو کیا شاہ صاحب اس عرصے میں اس تفسیر کو مکمل نہیں کر سکے چنانچہ اس کے بارے میں کچھ قیاس کرنا مشکل دکھائی دیتا ہے۔ اب سوال یہ

۱۔ پروفیسر عضد الدین، تفسیر فتح العزیز چند حقائق کی روشنی میں۔ ص، ۲۲۶

پیدا ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کی یہ سوا تین سپاروں کی تفسیر تو آپ نے اپنے شاگرد شیخ مصدق الدین کو املا کروائی تھی جیسا کہ تفسیر "فتح العزیز" کے مقدمہ سے ظاہر ہوتا ہے تو باقی تفسیر آپ نے کب اورکیسے تحریر فرمائی ۔ اس سلسلے میں یہ جواز پیش کیا جا سکتا ہے کہ عین ممکن ہے ، ان سوا تین سپاروں کی تفسیر کے بعد آپ نے لوگوں کے کہنے پر باقی پورے قرآن پاک کی تفسیر بھی املا کروا دی ہو اور پھر مختلف عوارض کے باعث اس مسودے پر نظرثانی کرنے کا موقع نہ ملا ہو۔ اس وجہ سے وہ مسودہ بیاض تک نہ پہنچ سکا ہو اور نہ ہی اس کی متعدد نقلیں شائع ہوئی ہوں لہٰذا امتداد زمانہ کے ہاتھوں وہ مسودہ بھی ضائع ہوگیا ہو جیسا کہ صاحب "نزھۃ الخواطر" لکھتے ہیں کہ "اما مصنفاته فاشهرها : تفسیر القرآن المسمّی لفتح العزیز صنفه فی شدّة المرض ولحوق الضعف املاء وهو فی مجلدات کبار ----ضاع معظمها فی ثورة الهند وما بقی منها الا مجلدان من اوّل وآخر"۔[1]

چنانچہ مندرجہ بالا قرائن و شواہد کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاہ صاحب نے پورے قرآن کی تفسیر املا کروائی تھی اور شدید امراض کے باعث نظرثانی کرنے کا موقع نہ ملا یہاں تک آپ اس جہانِ فانی سے کوچ کرگئے ۔ بعد ازاں آپ کی تفسیر "فتح العزیز" کی متعدد جلدیں تسلسل حوادث (غدر) سے نہ بچ سکیں اور آج جو جلدیں مطبوعہ شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں ، صرف وہی زمانے کی دستبرد سے محفوظ رہیں ۔

شاہ صاحب کی یہ قابل قدر ، بے مثال اور لاجواب تفسیر "فتح العزیز" آپ کے وسعت علم وکمال پر ایک پختہ دلیل ہے ۔ یہ تفسیر ہندوستان (کلکتہ) میں دوبار شائع ہوچکی ہے ۔ پہلی دفعہ ۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۱ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۲۶۴ھ / ۱۸۴۸ء میں ، بعد ازاں ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۲ء اور ۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۵ء میں اردو ترجمہ و تفسیر کے ساتھ بھی طبع ہوئی ۔

۱۔ سید عبدالحئی لکھنوی ، نزھۃ الخواطر ۔ ج ۷ ، ص ۲۷۰

عجالہ نافعہ :

خاتم المفسرین شاہ عبدالعزیز محدث دهلوی نے مشہور و مقبول فارسی رسالہ "عجالہ نافعہ" اصول حدیث کے متعلق تحریر فرمایا ہے۔ اس مختصر اور جامع ونافع رسالے میں مصطلحات حدیث اور اس کے اقسام ومراتب کے علاوہ احادیث کی تنقید کے اصول وقواعد نہایت خوش اسلوبی اور اختصار کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ ان اصول وقواعد کو مدّنظر رکھ کر احادیث کے موضوع ، صحیح ، حسن ، اور متفق علیہ ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس دل پسند مفید اور عجلت میں لکھے گئے رسالے کے فوائد سے علماء وطلباء حدیث کبھی بھی مستغنی نہیں ہو سکتے۔ شاہ صاحب اس رسالے کی تالیف کا سبب بیان کرتے ہیں۔

"این رسالہ ایست راشدہ وعجالہ ایست نافعہ درفوائد متعلقہ بعلم حدیث کہ باعث بر تحریرآن شوق وخواہش برادر عالی ---- سید قمرالدین الحسنی است ---- درین ایام داعیہ اشتغال باین علم شریف وفن منیف درخاطر عاطر ایشان تمکن ورسوخ پیدا کردہ وازین ہیچمدان محفل افادہ واستفادہ بنا برحسن ظنے کہ دارند درخواست اجازت این کار واعانت درتحمل این بار فرمودہ اند بحکم ان للّٰہ فی ایّام دھرکم نفحات الا فتعرّضوا لما تعرّضا لنفحات اللّٰہ"۔[1]

اس رسالے کی فصل اوّل میں علم حدیث کے فوائد کے تحت بیان کیا گیا ہے کہ علم القرآن ، عقائداسلام ، احکام شریعت اور اصول طریقت سب ہی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ کے ارشادات پر موقوف ہیں۔ تمام کشفی باتوں اور عقلی چیزوں کے زروجواہر کو پرکھنے کے لیے علم حدیث کی اتباع وپیروی لازمی امر ہے کیونکہ علم حدیث دونوں جہانوں کا سرمایۂ سعادت اور حیات جاودانی کی دلیل راہ ہے۔

پھر اس علم کے حصول کی راہ یہ بتاتی ہے کہ راویان حدیث کے حالات کی چھان بین کرنے اور ان سے واقفیت رکھنے کے بعد حدیث کے معنی سمجھنے میں نہایت احتیاط سے کام لیا جائے کیونکہ اس امر میں کوتاہی کرنے سے ایک تو سچے اور جھوٹے راوی میں تمیز نہیں رہے گی اور دوسرے مقصد اور غیرمقصد

1۔ شاہ عبدالعزیز ، عجالہ نافعہ ۔ ص ، 1

میں فرق نہیں رہے گا ۔

اس کے بعد آپ نے طبقات کتب حدیث پر بحث کی ہے کہ پہلے طبقے میں تین کتب ، موطا امام مالک ، صحیح بخاری اور صحیح مسلم شامل ہیں اور قاضی عیاض کی "مشارق الانوار" ان ہی تین کتب کی شرح ہے ۔ ان تینوں کتب میں موطا امام مالک ، صحیحین کی اصل اور ماخذ ہونے کے باعث کمال شہرت کو پہنچی ہوئی ہے ۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم بسط و تفصیل اور احادیث کی تعداد کے اعتبار سے اگرچہ موطا سے دس گنا زیادہ ہیں لیکن حدیثوں کی روایت کا طریقہ ، راویوں کی جانچ پڑتال کا ڈھنگ ، اعتبار و استنباط کا اسلوب موطا سے ہی سیکھا ہے ۔ اس کے باوجود یہ دونوں کتب تمام علمائے اسلام کی مخدوم ہیں ۔

حدیث کی کتب کے دوسرے طبقے میں وہ تمام کتب شامل ہیں ، جن کی احادیث صحت ، شہرت اور قبولیت میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے درجہ تک نہ پہنچ سکیں مثلاً جامع ترمذی ، سنن ابی داؤد اور سنن نسائی ۔ ابن الاثیر نے ان چند کتب کے الفاظ غریبہ کی شرح اور مشکلات کو ضبط کرنے کے ساتھ ساتھ یہ راویان حدیث کے ناموں اور دیگر متعلقات کی وضاحت کی ہے ۔ اس لحاظ سے ابن الاثیر کی "جامع الاصول" ان چند کتب کی شرح ہے ۔

کتب حدیث کے تیسرے طبقے میں علمائے متقدمین یعنی امام بخاری اور امام مسلم سے پہلے یا ان کے ہم عصر یا ان کے بعد میں آنے والوں نے جن احادیث کو بیان کیا ہے لیکن ان کی صحت کا التزام نہیں کیا اور نہ ان کی کتب شہرت اور قبولیت میں طبقہ اولی اور ثانیہ تک پہنچ سکی ہیں ۔ یہ کتب مسند شافعی ، سنن ابن ماجہ ، مسند دارمی ، مسند ابی یعلی موصلی ، مصنف عبدالرزاق ، مصنف ابی بکر بن ابی شیبہ ، مسند عبد ابن حمید ، مسند ابوداؤد طیالسی ، سنن دارقطنی ، صحیح ابن حبان ، مستدرک حاکم ، کتب بیہقی ، کتب طحاوی اور تصانیف طبرانی ہیں ۔

کتب حدیث کے چوتھے طبقے میں وہ احادیث شامل ہیں ، جن کا صحابہ وتابعین کے دور میں کسی قسم کا نام ونشان تک نہیں ملتا لیکن متاخرین علماء نے ان احادیث کو نقل کیا ہے ۔ ان کے متعلق دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا تو سلف صالحین کو ان کی چھان بین کرنے کے بعد کوئی اصل نہیں ملی

کو وہ ان کو روایت کرتے یا ان کی اصل پانے کے بعد ان میں وضاحت دیکھ کر روایت سے گریز کیا ۔ بہرحال دونوں صورتوں میں ان احادیث سے اعتماد جاتا رہا اور وہ کسی عقیدہ یا عمل کے ثبوت کے لیے دلیل بنانے کے قابل نہیں رہیں ۔ اس قسم کی کتب میں کتاب الضعفاء از ابن حبّان ، تصانیف حاکم ، کتب الضعفاء از عقیلی ، کتاب الکامل از ابن عدی ، تصانیف ابن مردویہ ، تصانیف خطیب ، تصانیف ابن شاہین ، تفسیر ابن جریر ، فردوس دیلمی بلکہ اس کی تمام تصانیف ، تصانیف ابی نعیم ، تصانیف جوزقانی ، تصانیف ابن عساکر ، تصانیف ابوالشیخ اور تصانیف ابن نجّار ہیں ۔

اس کے بعد اکثر موضوع احادیث اور ان کی نشاندھی کے لیے چند کتب کا ذکر کیا گیا ہے ۔ بعد ازاں بعض راویوں کے ناموں کی تحقیق اور ضبط کو بیان کرتے ہوئے چند امثال کا ذکر کیا ہے کہ حدیث کی کتب میں سوائے پانچ جگہوں کے ہر مقام پر لفظ " سلام " کو لام کی تشدید کے ساتھ پڑھنا چاہیئے ۔ اس طرح عمارہ ، کریز ، حزام ، عسل ، غنّام ، قمیر ، عبور کے ضبط و تقریر کے مختلف قواعد بیان کیے ہیں ۔

پھر اسی طرح چند نسبتوں کے قواعد بیان کرنے کے بعد چند نامی اور ان کے قواعد و ضوابط کا ذکر کیا ہے ۔ مندرجہ بالا قواعد وضوابط کا ذکر کرنے کے بعد کتب احادیث کی اقسام کو بیان کیا گیا ہے مثلاً جامع ، مسانید ، معاجم ، اجزاء ، رسائل اور اربعینات ۔

محدثین کی اصطلاح میں " جامع " آٹھ قسم کی احادیث پر مبنی کتاب ہے یعنی عقائد کی احادیث ، احکام کی احادیث ، رقاق کی احادیث ، سفر و حضر ، نشست و برخاست کے آداب اور کھانے پینے کی احادیث ، تفسیر کے بارے میں احادیث ، تاریخ و سیر کی احادیث ، فتنوں کے متعلق حدیثیں ، فضائل و مناقب کے متعلق احادیث ۔

ان میں سے عقائد کی احادیث کو علم التوحید والصفات کا نام دیا جاتا ہے ۔ مثلاً ابوبکر بن خزیمہ کی کتاب التوحید اور امام بیہقی کی کتاب الاسماء والصفات ہے ۔ احکام کی احادیث کو سنن کہتے ہیں اور یہ کتاب الطہارت سے کتاب الوصایا تک فقہی ابواب کی ترتیب پر مرتب ہوتی ہے ۔

رقاق کی احادیث سے مراد علم الزہد والسلوک کی حدیثیں ہیں مثلاً امام احمد اور عبداللہ بن المبارک کی " کتاب الزہد " احادیث آداب کا نام علم الادب ہے ۔ اس سلسلے میں امام

بخاری کی کتاب الادب المفرد موجود ہے۔

تفسیر سے متعلق احادیث کو تفسیر کی حدیثیں کہتے ہیں مثلاً تفسیر ابن جریر اور تفسیر ابن مردویہ وغیرہ۔

تاریخ و سیر کی حدیثوں کی دو قسمیں ہیں ، ایک تو وہ احادیث جو آسمان و زمین ، حیوانات جنات ، شیاطین ، فرشتوں کی پیدائش ، گزشتہ انبیاء علیہم السلام اور پہلی امتوں کے متعلق ہیں ۔ اس قسم کی احادیث کو بدء الخلق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور دوسرے وہ احادیث جو نبی کریم کے وجود باوجود ، صحابہ کرام اور آپ کے آل عظام کے متعلق ہیں اور نبی پاک کی پیدائش سے وفات تک کے حالات پر مشتمل ہیں وہ سیر کے نام سے مشہور ہیں مثلاً سیرت ابن ہشام اور سیرت ابن اسحاق وغیرہما۔

احادیث فتن ، علم الفتن کے نام سے مشہور ہیں مثلاً نعیم بن حماد کی کتاب الفتن وغیرہ ۔

فضائل و مناقب کے ذخیرہ احادیث کو علم المناقب کہتے ہیں مثلاً محب طبری کی تالیف "الریاض النضرۃ فی مناقب العشرۃ المبشرۃ" ہے لہذا ان سب فنون کے مجموعہ پر مبنی کتب کو جامع کہتے ہیں جیسے صحیح بخاری اور جامع ترمذی ۔

کتب احادیث کی دوسری قسم مسانید ہے ۔ محدثین کی اصطلاح میں مسند وہ کتاب ہے ، جس میں صحابہ کرام کی ترتیب پر مبنی احادیث ہوں خواہ وہ ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے ہو یا اسلام لانے میں سبقت کے اعتبار سے یا شرافت نسب کے لحاظ سے ۔

کتب حدیث کی تیسری قسم معاجم ہے ۔ محدثین کی اصطلاح میں معجم میں شیوخ کی ترتیب سے احادیث بیان کی جاتی ہیں ۔ اس میں شیوخ کی وفات کے تقدم کا اعتبار کرتے ہیں یا حروف تہجی کے مطابق یا ترتیب فضیلت یا علم و تقویٰ میں افضل ہونے کا لحاظ رکھتے ہیں ۔

حدیث کی چوتھی قسم اجزا ہے ۔ محدثین کی اصطلاح میں "جزو" صرف ایک خاص شخص کی مروی احادیث ہوتی ہیں ، خواہ وہ شخص صحابہ کے طبقے سے تعلق رکھتا ہو یا ان کے بعد کے طبقے سے مثلاً جزو حدیث ابوبکر صدیق ، جزو حدیث مالک وغیرہما ۔

تصنیف حدیث کی پانچویں قسم رسائل جزئیہ ہے اور یہ رسائل ہر ہر موضوع پر مستقل اور جداگانہ ہیں ۔ شیخ جلال الدین سیوطی کی تصانیف میں ان رسائل جزئیہ کا دائرہ نہایت وسیع ہے ۔

اربعین بھی تصانیف احادیث کی اقسام میں سے ہیں ، چالیس حدیثوں کو ایک ہی سند یا متعدد سندوں سے جمع کرنے کو اربعین کہتے ہیں ۔ اربعینات بےشمار ہیں ۔

فصل دوم میں علم حدیث کی اسناد کو وضاحت سے بیان کیا ہے کہ میں نے حدیث اور دیگر تمام علوم کو اپنے والد ماجد سے حاصل کیا ہے اور اس علم کی بعض کتب مثلاً مصابیح السنۃ ، مشکوۃ ، مسوی شرح مؤطا ، حصن حصین اور شمائل ترمذی نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ پڑھی اور سنی ہیں اور صحیح بخاری کی ابتداء کا کچھ حصّہ بطریق درایت ان سے سنا ہے ۔ اس طرح والد بزرگوار (شاہ ولی اللہ) کے دوستوں شاہ محمد عاشق پھلتی اور خواجہ امین ولی اللہی سے بھی اجازت حاصل کی ہے ، جب کہ ان سب اصحاب نے شیخ ابو طاہر مدنی سے استفادہ کیا تھا ۔

شاہ عبدالعزیز نے اپنا کچھ ذکر کرنے کے بعد شیخ ابو طاہر مدنی کا صوفیاء وعارفین کے واسطے سے سلسلہ سند مکمل طور پر بیان کیا ہے ۔ اس کے ساتھ ہی شاہ ولی اللہ نے کتاب المؤطا ، صحیح بخاری ، صحیح مسلم ، سنن ابن داوٗد ، جامع ترمذی ، سنن نسائی ، سنن ابن ماجہ ، مشکوۃ المصابیح اور حصن حصین جن جن شیوخ سے پڑھیں ، ان کا سلسلہ سند شروع سے آخر تک بیان کیا ہے ۔

آخر میں شاہ عبدالعزیز حدیث کے موضوع اور راوی کے جھوٹا ہونے کی چند علامتیں بیان فرماتے ہیں ، مثلاً راوی رافضی ہو اور وہ صحابہ پر طعن کے متعلق حدیث بیان کرے یا راوی ایسی بات روایت کرے جس کا جاننا اور اس پر عمل کرنا ہر مکلّف پر فرض ہو یا ناصبی ہو اور اہل بیت پر طعن کے سلسلہ میں حدیث روایت کرے یا پھر حدیث میں لفظ ومعنی کا رکیک ہونا یا پھر صغیرہ گناہ سے ڈرانے میں حد سے زیادہ مبالغہ کیا گیا ہو یا پھر راوی نے حدیث کے وضع کرنے کا خود اقرار کیا ہو ۔

گویا شاہ عبدالعزیز کا یہ فارسی رسالہ اصول حدیث کے متعلق ہے ۔ اگرچہ شاہ صاحب نے اس فارسی رسالے "عجالہ نافعہ" کا کوئی نام تجویز نہیں کیا لیکن موصوف کے ان الفاظ "این رسالہ ایست

راشدہ وعجالہ ایست نافعہ" سے یہ رسالہ "عجالہ نافعہ" کے نام سے مشہور ہوگیا ہے - یہ مختصر رسالہ ہندوستان میں لکھنئو اور دہلی کے علاوہ پاکستان میں لاہور اور کراچی سے کئی دفعہ شائع ہو چکا ہے - زیر نظر رسالے کی بحث و تصحیح کے سلسلے میں ایجوکیشنل پریس، کراچی کے فارسی متن پر مشتمل نسخے سے استفادہ کیا ہے، جس کے اردو ترجمہ کے فرائض محمد عبدالحلیم چشتی نے سرانجام دیے ہیں - علاوہ ازیں اس رسالے کا ۱۳۹۵ھ /۱۹۷۵ء میں مکتبہ السعودیہ سے عربی ترجمہ شائع ہو چکا ہے - یہ عربی ترجمہ حافظ عبدالرشید بن عبدالعزیز نے کیا ہے -

بستان المحدثین :
===========

خاتم المحدثین وعلامۂ زماں حضرت شاہ عبدالعزیز کی فارسی تصنیف "بستان المحدثین" علوم و معارف کا بیش بہا گنجینہ ہونے کے باعث بہت اہمیت کی حامل ہے - شاہ صاحب کی یہ کتاب فن تاریخ کا ایک کامل ذخیرہ ہونے کے علاوہ مستند وجامع اور عمدہ و معتبر ہونے کی وجہ سے قبول عام کا درجہ رکھتی ہے - آپ نے اس کتاب میں عالم اسلام کے تمام محدثین و مؤلفین عظام کے تاریخی حالات اور ان کی کتب حدیث کا تذکرہ نہایت شرح و بسط سے کیا ہے - یہ کتاب مصنّف کی دینی وعلمی تحقیقات اور تاریخ دانی میں کامل مہارت پر دلالت کرتی ہے، نیز اپنے دلکش، قابل دید اور خوبصورت انداز بیان کی وجہ سے فن تاریخ میں بے نظیر اور لاجواب تصنیف ہے -

سراج الہند شاہ عبدالعزیز نے "بستان المحدثین" کی ابتداء میں اسکی تالیف کا مقصد بیان فرمایا ہے کہ اکثر رسائل و تصنیفات میں ایسی کتب سے احادیث نقل کی جاتی ہیں کہ ان (احادیث) کا مطالعہ کرنے والے متعلقہ کتب کے پردۂ تاریکی میں ہونے کے باعث حیرت و استعجاب کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں، چنانچہ ان کتابوں کے تذکرہ کے ساتھ ہی ان مصنّفین کی شہرت کی وجہ سے ان کے حالات زندگی کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے -

گویا علم حدیث کے مطالعہ سے قبل "بستان المحدثین" کا بنظر غائر مطالعہ کرنا ضروری ہے تاکہ نامور محدثین اور ان کی تصانیف کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکیں -

شاہ صاحب کسی محدث کے حالات زندگی تحریر فرماتے ہوئے اس کا حلیہ ، عادات و خصائل، اسکی دینی وعلمی خدمات اور تصانیف کی اہمیت کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے تلامذہ کے مختصر سوانح کا ذکر بھی کرتے ہیں - علاوہ ازیں اس (محدث) کے اچھے اشعار کے ہوتے ، اسکے متعلق اور اسکی تصنیف کی مدح وشان میں کہے گئے کچھ اشعار درج کرتے ہیں پھر اس محدث کی کسی کتاب کے مختلف مستند نسخوں کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ نسخے صاحب تصنیف کے کس کس شاگرد نے تیار کیے اور وہ کہاں کہاں پائے جاتے ہیں -

شاہ صاحب نے بستان المحدثین کی ابتداء موطا امام مالک سے فرمائی ہے - امام مالک کا حلیہ ولباس ، ان کی مجالس حدیث اور موٗطا کے تدریجی انتخاب کے بعد موٗطا کی مدح میں سعدون اور قاضی عیاض کے اشعار درج کیے ہیں ، پھر موٗطا کے سولہ نسخوں اور ان کے امام مالک سے روایت کرکے جمع کرنے والوں کے حالات کا ذکر کیا ہے - یہ سولہ نسخے علامہ یحیی بن یحیی مصمودی ، علامہ عبداللہ بن وہب ، علامہ قعنبی ، علامہ ابن القاسم ، علامہ معن بن عیسی ، علامہ عبداللہ بن یوسف ، علامہ یحیی بن بکیر ، علامہ سعید بن عفیر ، علامہ ابومصعب زہری ، علامہ مصعب بن عبداللہ زبیری ، محمد بن المبارک صوری ، سلیمان بن برد ، یحیی بن یحیی التمیمی ، ابوحذافہ سہمی ، علامہ سوید بن سعید اور امام محمد بن الحسن شیبانی کے ہیں - شاہ صاحب نے ان راویوں کے نسخوں کا ذکر کرتے ہوئے شروع میں ان منفرد احادیث کو تحریر فرمایا ہے ، جو کہ موٗطا کے دوسرے نسخوں میں نہیں پائی جاتیں -

موٗطا اور اس کے سولہ نسخوں کا ذکر کرنے کے بعد مختلف احادیث کے مجموعوں مثلاً مسانید ، صحیح ، سنن ، معاجم ، جامع ، چہل حدیث اور دیگر بے شمار کتب کے اسماء نہایت تفصیل سے بیان کیے ہیں -

" بستان المحدثین " کی پہلی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ شاہ صاحب نے ہر کتاب کا تعارف اس کی پہلی حدیث سے کرواتے ہوئے اسے بعینہ اپنی تصنیف میں نقل کیا ہے اور جن علاقوں میں ان نامور محدثین کرام کی کتب احادیث کی شہرت و مقبولیت نقطہٗ عروج پر پہنچی ، ان کے نام بھی

تحریر فرماتے ہیں جیسا کہ "صحیح عوانہ" کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "در مذہب شافعی بود و مذہب شافعی را اول کسے کہ در اسفرائن آورد"۔[1]

شاہ صاحب کی اس تصنیف کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ کسی کتاب کے مجموعہ حدیث کی تعداد بتانے کے علاوہ جن کتب احادیث میں ثلاثیات موجود ہیں ، ان کی تعداد بھی بتا دی ہے ۔ شاہ صاحب سنن ابی مسلم الکشی ، سنن سعید بن منصور اور مصنف عبدالرزاق کا تعارف کرواتے ہوئے ان میں "ثلاثیات" کی کثرت کے باعث انہیں کتب حدیث میں اعلیٰ و ارفع مقام دیتے ہیں ۔

"بستان المحدثین" کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ شاہ صاحب محدث کے مذہب اور اس کے ذاتی رجحان و میلان کو بھی وہ ظاہر کرتے ہیں تاکہ عام لوگوں کو ان کے مذہب اور رجحان کے بارے میں اندازہ ہو جائے مثلاً" امام نسائی کے متعلق فرمایا "او شافعی المذہب بود چنانچہ مناسک او بران دلالت میکند"۔[2]

اسی طرح امام بیہقی کے مذہب کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ "امام الحرمین در حق او گفتہ است کہ ہیچ شافعی در عالم نیست مگر امام شافعی را بروی منت و احسان ست الا ابوبکر بیہقی کہ منت و احسان او بر شافعی زیرا کہ در تصانیف خود نصرت مذہب او نمودہ و بتائید و نصرت"۔[3]

شاہ صاحب فن معرفت علل حدیث و اسماء الرجال ،علم نحو و فن تجوید اور علم و ادب و شعر میں یگانۂ روزگار محدثین کی صفات عالیہ کو بھی تفصیل سے بیان کرتے ہیں ۔

مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی خود بھی ایک جلیل القدر و نامور محدث اور متبحر و مشہور مفسر تھے ۔ شاہ صاحب کی اس تصنیف کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے علم حدیث ، محدثین کرام کے حالات زندگی اور ان کی تصنیفات کے علمی و عملی کمالات کا بچشم خود مشاہدہ کیا تھا۔

۱- شاہ عبدالعزیز ، بستان المحدثین - ص ۳٦،

۲- ایضاً - ص، ۱۱۱

۳- ایضاً - ص، ۵۰

صاحب الیانع الجنی "بستان المحدثین" کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ "منھا کتابہ البستان المحدثین جمع فیہ علوم الحدیث محرزہ واختصرھا"۔[1] گویا آپ کے اس جامع و مستند مایہ ناز مجموعہ کے علاوہ متعدّد علوم پر مبنی دیگر کتب آپ کی تبحر علمی اور وسعت نظری پر دلالت کرتی ہیں۔ آپ کی تمام تصنیفات مسلمانوں اور پورے عالم اسلام کے لیے ہمیشہ سرمایہ بصیرت بنی رہیں گی۔

شاہ صاحب کی اس گراں قدر تصنیف کے اردو ترجمہ کے فرائض مولانا عبدالسمیع استاذ دار العلوم دیوبند نے سرانجام دیے ہیں۔ یہ ترجمہ متعدّد بار ہندو پاک سے شائع ہو چکا ہے۔

فتاوی عزیزی :

علم دین کے ستون شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی مذہبی اور علمی جواہر ریزوں پر مشتمل فارسی تصنیف "فتاوی عزیزی" کی دو ضخیم جلدیں آپ کے تبحّر علمی کا نچوڑ اور دینی معلومات کا وقیع سرمایہ ہے۔ فقہ و عقائد، تفسیر و تشریح اور تصوف و کلام کے اس مقبول و معروف دینی و علمی مخلوط مجموعے سے پوری ملّت اسلامیہ خصوصاً اہل سنت والجماعت کے تمام طبقات کے علماء، طالبان علم دین اور متلاشیان حق ہر دور میں مستفید ہو سکتے ہیں۔ اہل اسلام آپ کے علمی و مذہبی مقام اور مسلمانان ہند آپ کی دینی و علمی خدمات سے بخوبی واقف ہیں۔ شرعی احکام اور عجیب و غریب مسائل دینیہ کے تحقیقی جوابات پر مشتمل آپ کا یہ بیش بہا علمی خزانہ آپ کی بلند پایہ تبحر علمی کا واضح ثبوت ہے۔ اس تصنیف میں آپ بیک وقت ایک عظیم فقیہ، صوفی، متکلم، مفسّر اور محدث دکھائی دیتے ہیں۔ شاہ صاحب کا اپنے زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں کو درس و تدریس، افتاء و فصل خصومات اور شاگردوں کی تعلیم و تربیت میں مصروف ہونے کے علاوہ غیر ممالک کے مسلمانوں کے وسیع پیمانے پر سوالوں کے جوابات دینا آپ کی تمام علوم ظاہری و باطنی میں کامل مہارت کی ایک پختہ دلیل ہے۔

فتاوی عزیزی تفسیر و تشریح، عقائد، تصوف، خلافت اور فقہ کے موضوعات کے علاوہ چند رسائل پر مبنی ہے۔ شاہ صاحب نے تفسیر و تشریح کے موضوع کے تحت وحدانیت پر مشتمل آیات قرآنیہ،

۱۔ محمد محسن ترہتی، الیانع الجنی، ص، ۷۲

بعض قرآنی دعاؤں میں ربّنا اور بعض میں اللّھمّ کی تخصیص کی وجہ ، انشاءاللہ کہنے سے بنی اسرائیل کی کامیابی اور انشاءاللہ کہنے کے باوجود موسی علیہ السلام کی ناکامی کی وجہ اور ذی القربی وبذی القربی میں حرف " با " کی خصوصیت کے علاوہ قرآن پاک کی چند اور خصوصی آیات کو بیان کیا ہے ۔

قرآن پاک کے بیشتر پاروں کی آیات اللہ تعالی کی وحدانیت کے متعلق ہیں مثلاً پارہ " الم " میں ہے :

" فاینما تولوّا فثم وجہ اللہ ط انّ اللہ واسع علیم " ۔[1]

ایک دوسرے پارہ " قال الملاء " کی یہ آیت بھی اللہ تعالی کی وحدانیت کا ثبوت دیتی ہے :

" وما رمیت اذ رمیت ولٰکنّ اللہ رمی " ۔[2]

اس کے بعد ربّنا اور اللّھم میں واضح فرق یہ بیان کیا ہے کہ اللّھم باعتبار اپنی معرفت تامہ کے اور ربّنا حواریین کی معرفت کے لئے مستعمل ہے ، یعنی اللھم خاص طور پر عارف کامل کے لیے اور ربّنا کا لفظ ہر محتاج کے لیے استعمال ہوتا ہے گویا ہر نبی ، ولی ، عارف اور محتاج کا طریق کار ان الفاظ کے بارے میں مختلف ہے ۔ " بنی اسرائیل نے اپنی گائے ذبح کرنے کے معاملے میں کہا تھا وانّا انشاءاللہ لمھتدون " گویا عربی قاعدے کے مطابق تکمیلی کلام ہونے کے باعث ان کی مراد پوری ہوئی ، اس کے برعکس حضرت موسی نے اپنے معلّم حضرت خضر علیہ السلام سے کہا تھا : ستجدنی انشاءاللہ من الصابرین " گویا اس میں ایک تو حال میں صبر کی نفی ثابت ہوئی اور یہ کہ مستقبل میں صابر لوگوں میں پاؤگے ، دوسرے یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے معلّم کے مقابلہ میں ان کے قول کے خلاف اور فرمانبرداری کے منافی یہ فقرہ کہا تھا ۔ اس لیے آپ کی خواہش پوری نہ ہو سکی " ۔[3]

۱۔ شاہ عبدالعزیز ، فتاوی عزیزی ۔ ج ۲ ، ص ۲۵ ۔

۲۔ ایضاً ۔ ص ، ۲۶

۳۔ ایضاً ۔ ص ، ۲۷

اس فرق کو واضح کرنے کے بعد قربی و بذی القربی کے فرق کو وضاحت سے بیان کیا ہے کہ "سورۃ بقرۃ میں ذی القربی ہے جب کہ سورۃ نساء میں بـذی القربی تو سورۃ بقرۃ میں بنی اسرائیل کا گذشتہ قصہ مذکور ہے جب کہ سورۃ نساء میں تاکید کے لیے "ب" استعمال ہوا ہے"۔[1]

جلد دوم کے اسی باب احادیث کے عنوان کے تحت صحیح بخاری کی احادیث کی تعداد اور بہ ترتیب حروف تہجّی اسماء راویان بیان کیے گئے ہیں ۔ علاوہ ازیں اثنا عشر امیر یا اثنا عشر خلیفہ کی توضیح ، آنحضرت کا اصحاب کہف کو معراج میں عرض اسلام اور ان کے قبول کی بابت بحث ، باغ فدک کا بیان اور اس کے متعلق ایک افتراء کی تردید ، رنگ دو روز کے معنی ، ترکوں کی بعض خرافی رسومات ، بارہ برج کی وجہ تسمیہ ، آسمان ، زلزلہ ، ابر ، برق اور دیوار قہقہہ کی حقیقت بیان کی گئی ہے ۔

پھر جلد دوم میں ہی عقائد کے عنوان کے تحت بداء کے متعلق سیر حاصل بحث ، قیامت میں دیدار خداوندی کی نوعیت ، ابلیس سے سوال و جواب کی نوعیت ، میزان و پل صراط کی حقیقت ، تفضیل اولاد امام آنحضرت کی تشریح ، معراج شریف کا حال روایات کی روشنی میں ، شجرہ بیعۃ الرضوان فرقہ ناجیہ ، گمراہ فرقوں کا بیان ، فضیلت شیخین ، اقتداء بالشیعہ کا مسئلہ ، لزوم کفر اور اپنکار کفر میں فرق ، فضائل ایمان اہل کتاب ، فرقہ امامیہ کے متعلق فیصلہ ، خوارج اور شیعہ میں مناظرات کا وہم اور اس کا ازالہ ، لاعلمی سے کلمۂ کفر کہنا ، اہانت علم و علماء اور احادیث کی رکیک تاویلات کو فصاحت سے بیان کیا گیا ہے ۔

جلد اوّل میں تصوّف کے عنوان کے تحت تصوّف کے متعلق بصیرت افروز بحث کی گئی ہے ۔ اس کے ساتھ ہی مزارات کے آداب زیارت کا ذکر کرنے کے بعد بیعت کے اعتقاد کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلّم کے فعل سے ثابت کیا ہے ۔ اسی طرح طریقہ سہروردیہ ، قادریہ ، چشتیہ ، اور نقشبندیہ کی بنیاد کی وضاحت محققانہ انداز سے کرنے کے بعد مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کے خواب

۱۔ شاہ عبدالعزیز ، فتاوی عزیزی ۔ ص، ۲۷

میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کرنے کے خوابوں کی شرح بیان کی گئی ہے۔ پھر حضرت مجدد الف ثانی کی عبارات میں بعض امور پر اعتراضات کرکے ان کو دلائل سے واضح کر دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں توحید وجودی اور توحید شہودی میں اختلاف آراء کو بیان کرتے ہوئے دونوں توحیدوں کی مزید وضاحت کر دی ہے۔ اس کے بعد شاہ غلام علی اور امام شاہ خان نے شاہ عبدالعزیز کے نام خطوط لکھ کر کچھ مسائل دریافت کیے ہیں۔

اسی جلد میں فقہ کے موضوع کے تحت مسائل نماز، عورتوں کے لیے نماز کے احکام، اعمال کے ثواب میں کمی بیشی، مسائل دعا، مسائل جنازہ، مسائل روزہ، مسائل حج، مسائل نکاح، حرمت متع، مسائل طلاق، مسائل بیع، مسائل رہن، مسائل ہبہ، مسائل رشوت، مسائل سود، اور مسائل متفرقہ پر بحث وتمحیص کی گئی ہے۔

اس کے بعد اسی جلد میں میت اور قبر کے متعلق متعدد مسائل پر روشنی ڈالی ہے یعنی موت کے بعد مردے کی کیفیت، اس کی روح کا حال، معاد جسمانی کی حقیقت اور موت کے بعد ادراک انسانی کا باقی رہنا، پھر قبروں پر پانی چھڑکنا اور پھول وغیرہ رکھنا، میت کی نذر ماننا اور چادر سے قبر پوشی کا حکم، سال کے کسی دن کو زیارت کے لیے مقرر کرنے کا حکم، طواف قبر اور نقل اموات کی حقیقت کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں محرم، تعزیہ محترم، انعقاد مجلس عزا، اہل تعزیہ کی امداد، مرثیہ اور نوحہ خوانی کا ذکر کیا ہے۔ پھر ربیع الاول میں کھانا پکا کر آنحضرت کی روح کو ایصال ثواب پہنچانے میلاد اور عشرہ محرم کی مجلس کا ذکر کرنے کے بعد مختلف امور کی تراکیب کو بیان کیا ہے، مثلاً زیارت قبور کی ترکیب، حفاظت عزت وآبرو کی ترکیب، فراغت رزق کی ترکیب، ادائے قرض کی ترکیب، آفات وبلایات سے محفوظ رہنے کی ترکیب، تسخیر حکام کی ترکیب، دفع بدخوابی کی ترکیب، سفر کی ترکیب اور آسیب وجادو دور کرنے کی ترکیب وغیرہم۔

اس کے بعد دف کے ساتھ سرود وغنا، بلا مزامیر راگ سننا اور قبر پر راگ کے شغل کے مسائل بیان کیے ہیں۔ گویا آپ کی یہ تصنیف آپ کے فتاویٰ اور کچھ رسائل پر مبنی ہے۔ اس کتاب میں رسالہ

استحباب رفع سبابہ در تشہد ، رسالہ نماز زنان ، رسالہ معاد جسمانی ، رسالہ اصول مذہب ابی حنیفہ ، رسالہ غنا ، رسالہ بیع کنیزان ، بیان ماخذ مذاہب اربعہ ، شرح رباعی مولانا شاہ عبدالعزیز بیان محو و اثبات تقدیرات ، رسالہ فیض عام ، رسالہ احکام حج ، رسالہ عزیزیہ اور دیگر فتاوی شامل ہیں ۔

یہ تھا مختصراً شاہ صاحب کا دو جلدوں پر مشتمل دینی و علمی سرچشمہ فتاوی عزیزی " گوکہ الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانا ایک معمولی بات نہیں ہے لیکن آپ نے خصوصاً ان تمام افتاء کو اپنی تصنیف میں اس انداز سے سمو دیا ہے گویا سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے ۔ خوبصورت موتیوں سے مرصّع آپ کا یہ علمی مجموعہ تمام ملّت اسلامیہ کے لیے شمع ہدایت کا کام دیتا رہے گا ۔

مولوی عبدالواجد صاحب مولوی غازی پوری مؤلف تحفۃ الاتقیاء فی فضائل الانبیاء نے اس کی پہلی جلد کا اردو ترجمہ ۲۱ ذی قعدہ ۱۳۲۲ھ میں اور دوسری جلد کا یکم محرم ۱۳۲۳ھ میں " سرور عزیزی المعروف " فتاوی عزیزی " کے نام سے مکمل کیا اور مطبع مجیدی کانپور سے طبع ہوا ۔ بعدازاں صاحب ایجوکیشنل پریس کراچی ، حاجی محمد زکی نے اسکے ترجمہ کو عام فہم ، آسان اور مفید بنانے کے لیے مختلف ابواب اور عنوانات کے تحت تقسیم کر کے ایک ہی جلد میں زیور طباعت سے آراستہ کیا ۔

تحفہ اثنا عشریہ :
============

سراج الہند شاہ عبدالعزیز کی تصنیف " تحفہ اثنا عشریہ " کی تالیف کے اصل مقصد کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس دور کی معاشرتی کیفیت اور مذہبی حالت کو مدّنظر رکھنا اشد ضروری ہے ۔ اگرچہ پہلے باب کے مذہبی حالات کے تحت شیعہ سنّی اختلافات کو تفصیلاً بیان کر دیا گیا ہے لیکن یہاں ان حالات کا مختصراً ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے ۔

مغلیہ سلطنت کے دور انحطاط میں شیعہ و سنّی اختلافات اپنی انتہا تک پہنچ چکے تھے ۔ شیعہ اور اہل سنت احباب ان اختلافات کو مذہبی رنگ سے زیادہ سیاسی ماحول

میں بڑھا چکے تھے ـ گویا خود غرض اور ناعاقبت اندیش سیاسی لیڈروں کی انتہا پسندی کے باعث یہ خلیج اس قدر وسیع ہوگئی تھی کہ اس کا اثر صرف دربار تک ہی محدود نہ رہا بلکہ عوام بھی اس کے مضر اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکے ـ اورنگ زیب عالمگیر جیسے ستی متشدد بادشاہ کے بعد اس کے بیٹے بہادر شاہ اوّل نے شیعہ مذہب کو اختیار کیا ـ بہادر شاہ اوّل کے بعد سید برادران (قطب الملک عبداللہ خان اور امیر الامراء حسین علی خان) کو اپنے عقائد کی تشہیر کا موقع ملا ـ ان دونوں بھائیوں کے بعد فرخ سیر کے عہد میں بھی شیعہ ستی نزاع انتہا تک پہنچ گئے تھے ـ بدمست محمد شاہ رنگیلا تو ویسے ہی اپنی رنگ رلیوں میں کھویا ہوا تھا ـ فرخ سیر کے بعد نجف خان شیعہ کے عہد میں تو اہل سنت لوگوں کے ساتھ بہت برا سلوک کیا جاتا تھا ـ ان حالات میں ہندوستان کے ہر خاندان کے تقریباً ایک دو آدمی ضرور اس مذہب میں داخل ہوگئے تھے ـ شاہ عبدالعزیز کے عہد میں تو آپ کے خاندان کے بے شمار لوگ اس مذہب کے حلقہ بگوش ہو چکے تھے ـ شاہ صاحب کے شاگرد اور رشتہ دار قمر الدین بھی شیعہ مذہب اختیار کر چکے تھے ـ

مرزا نجف کی موت کے بعد اس کی بہن خدیجہ سلطان بیگم ، بھانجے زین العابدین اور اس کی پارٹی کے چار ممتاز افراد ، افراسیاب ، مرزا شفیع ، نجف قلی خان اور محمد بیگ ہمدانی ملکی سیاست پر پوری طرح چھائے ہوئے تھے ـ مغلیہ تنزل کے اسی دور میں مرہٹوں نے شیعہ ستی جھگڑوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا اقتدار وسیع کر لیا تھا ، پھر ہندوستانی سلمانوں کے محسن عظیم شاہ ولی اللہ نے شیعہ اور ستی لیڈروں کو قریب ترلانے کی کوشش کی تھی نتیجتاً پانی پت کے میدان میں شیعہ اور ستی سرداروں نے مع اپنی فوجوں کے مرہٹوں سے مقابلہ کرتے ہوئے فتح و کامیابی کے جھنڈے لہرا دیے تھے ـ اس دوران میں شاہ ولی اللہ نے دو مایہ ناز کتب " ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء اور قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین " تصنیف کیں ـ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے بھی اپنے والد گرامی کے مشن کو جاری رکھنے کے لیے قلمی جہاد کیا اور مندرجہ بالا دونوں کتب کو مشعل راہ سمجھ کر ان سے راہنمائی حاصل کرتے ہوئے اپنی معرکۃ الاراء اور گران قدر کتاب " تحفہ اثنا عشریہ " تصنیف کی ـ

"تحفہ اثنا عشریہ کے بارے میں متعدد کتب میں یہی تحریر کیا گیا ہے کہ شاہ صاحب نے یہ کتاب شیعیت کے رد اور اہل تشیع کے عقائد کے بطلان میں تصنیف فرمائی ہے جو بالکل غلط ہے۔ شاہ صاحب نے سنت نبوی کا بہت گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا ۔ کتب حدیث پر آپ کو مکمل عبور حاصل تھا اور اسوہ محمدی آپ کے مد نظر تھا لہذا ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ نے فرقہ وارانہ فسادات ، منافرت و منافقت اور مخالفت و مخاصمت کو ابھارنے کی بجائے تمام لوگوں میں باہمی اصلاح ، اتفاق ، اخوت اور ہمدردی کے جذبات پیدا کرنے کے لیے یہ قدم اٹھایا تھا ورنہ یہ بات شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی جیسی حقائق انگیز شخصیت ، کہ جو محدثین و مشائخ کا مرجع ہو اور جنہوں نے سیاسی انتشار اور ناسازگار حالات میں دہلی میں سکونت اختیار کرکے تشنگان بادۂ توحید و سنت کو علوم و معارف دینیہ سے سرشار و سیراب کیا ہو ، کے منافی ہے کہ آپ دشمنان اسلام کو تضحیک کا موقع دیں اور لوگوں کو ایک دوسرے کے دشمن اور مخالف بنا دیں ۔

شاہ عبدالعزیز کے خیال میں دونوں فرقوں کے خیالات قرآن پاک پر مبنی ہیں اور قرآن مجید کے متعلق دونوں میں اختلاف بھی موجود نہیں ۔ اس لیے اختلافات محض فروعی اور غیر ضروری رسوم کی پابندیوں سے پیدا ہوگئے ہیں چنانچہ اس دور کے حالات اختلافات اور اسباب کو پیش نظر رکھتے ہوئے شیعوں کے مختلف فرقوں کو ان کے اسلاف کی صحیح تاریخ سے روشناس کروانا ضروری سمجھا تاکہ ان پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے کہ انہوں نے بہت سی غیر ضروری رسوم کو اختیار کرکے اپنے آپ کو ان کا پابند بنا رکھا ہے ، جن کا اصلی مذہب سے کوئی تعلق نہیں اور یہ غیر ضروری رسوم و عقائد خود غرض لیڈروں کے پیدا کردہ ہیں ۔ اس مقصد عظیم کے تحت اپنی تبحر علمی اور تبلیغی مساعی کو کام میں لاتے ہوئے آپ نے یہ گراں قدر کتاب تصنیف کی ۔ شاہ صاحب "تحفہ اثنا عشریہ" کے مقدمے میں اس کتاب کی تالیف کا سبب بیان کرتے ہیں ۔

"غرض از تسوید این رسالہ و تحریر این مقالہ آن است کہ درین بلاد کہ ما ساکن آنیم و درین زمان کہ ما در آنیم رواج مذہب اثنا عشریہ و شیوع آن بحدی اتفاق افتادہ کہ کم خانہ باشد کہ یک دو کس ازان خانہ بآن مذہب متمذہب نباشند و راغب باین عقیدہ نشوند لیکن

اکثرے از طلبہ علم تاریخ واخبار خود عاطل واز احوال اصول واسلاف خود بے خبر وغافل میباشند و ہرگاہ در محافل ومجالس باہل سنت وجماعت گفتگو میںمایند کج مج میگویند وشترگربہ می آرند جستۃ للہ تعالی بتحریر این رسالہ پرداختہ شد "۔[1]

گویا شاہ صاحب نے اپنی اس کتاب میں اہل تشیع کے عقائد اور مختلف فرقوں کی تفصیل بیان کرتے وقت خود ان ہی کی کتابوں سے شہادتیں پیش کی ہیں ۔ اس کے باوجود لوگوں نے اس کتاب سے استفادہ کیے بغیر اس کو طعن وتشنیع کا نشانہ بناتے ہوئے مخالفت کی نظر سے دیکھا ہے ۔

شمس الہند شاہ عبدالعزیز کی یہ معرکۃ الاراء تصنیف اپنے موضوع پر نہایت مدلل و مفصل اور متوازن وواضح ہے ۔ اس کتاب میں شاہ صاحب کا انداز بیان نہایت حکیمانہ اور پر اثر ہے اور اعتدال قائم رکھتے ہوئے ہر مذہب کی کتب کے حوالے دیے ہیں ۔ علمائے محققین اس کتاب کی تعریف میں رطب اللسان اور علمائے مخالفین اسکے دلائل و براہین کے سامنے عاجز ہیں ۔ تحفہ اثنا عشریہ کے تذکرہ میں شاہ عبدالعزیز نے فرمایا کہ ایک شخص نے اس کتاب کی بابت کہا ہے :

" ہذا کتاب لو یباع ذہبا بوزنہ لکان الباع المغبون "۔[2]

شاہ صاحب نے تحفہ اثنا عشریہ " میں فرقہ امامیہ کی پوری حقیقت اور ان کے اعتراضات کے مکمل جوابات مع اشتشہاد واستدلال کے دیے ہیں ۔ شاہ صاحب نے یہ کتاب ہندوستان کے اس طبقے میں شیعیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لیے تحریر فرمائی تھی ۔ ۱۷۶۲ء تا ۱۷۸۲ء کے زمانہ تک شاہ ولی اللہ کے علاوہ آپ کے خاندان میں کوئی بھی شیعہ فرقہ کا شدت سے مخالف نہ تھا بلکہ اس زمانے میں تو شاہ عبدالعزیز صاحب نے " سر الشہادتین جیسی کتاب تصنیف کی تھی ، جسے پڑھ کر یہ اندازہ کرنا مشکل دکھائی دیتا ہے کہ یہ وہی شاہ عبدالعزیز ہیں کہ جو

۱۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ، مقدمہ تحفہ اثنا عشریہ ۔ ص ، ۲

۲۔ شاہ عبدالعزیز ، ملفوظات ۔ ص ، ۷۳

اپنے بھائیوں میں شیعیت کی تردید میں پیش پیش رہے اور بالآخر ان کو راہ راست پر لانے کے لیے "تحفہ اثنا عشریہ" تصنیف کی، جس کے حقائق کا اندازہ لگائیے بغیر شیعہ فرقہ نے شورش برپا کر دی جیسا کہ سرسید احمد خان رقمطراز ہیں کہ :

"اوائل حال میں فرقہ اثنا عشریہ نے شورش کو بلند کیا اور باعث تفرقہ خاطر جہال اہل تسنن کے ہوئے۔ حضرت نے بہ سبب التماس طالبین کمال کے کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" کو غایت شہرت محتاج بیان نہیں۔ بدل توجہ قلوب بصرف اوقات وجمع سرمایہ کثرت ضخامت تصنیف کی کو ہر طالب علم بے مایہ بھی علمائے شیعہ کے ساتھ مباحثہ و مناظرہ میں کافی ہوگیا۔ ثقات بیان کرتے ہیں کہ آپ تصنیف کے وقت عبارت اس کتاب کی اسی طرح سے زبانی ارشاد کرتے جاتے تھے کہ گویا ازبر یاد ہے اور حوالہ کتب شیعہ کے جن کو علمائے فرقۂ مذکور نے شاید بجز نام کے سنا نہ ہوگا، باعتماد حافظہ بیان ہوتے جاتے تھے اور اس پر متانت، عبارت اور لطافت و ظرافت جیسے ہیں، ناظرین پر ہویدا ہیں"۔ [1]

"تحفہ اثنا عشریہ" ۱۲۰۴ھ / ۱۷۹۰ء میں پایہ تکمیل کو پہنچ چکی تھی اور اس کی باقاعدہ اشاعت ۱۲۱۵ھ / ۱۷۹۹ء میں کلکتہ سے ہوئی۔ کسی نے تحفہ کی تاریخ کہی ہے :

"تحفہ را یک فن مداں کہ درد | سوئے ہر معرفت سراغ آمد
سوئے الفاظ معانی اش بنگر | ہست دریا کہ در ایاغ آمد
بسکہ نور ہدایت است و یقین | سال تصنیف او چراغ آمد"۔ [2]

تحفہ اثنا عشریہ کی تصنیف کے دو سال بعد ۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۲ء میں شاہ صاحب کے ایک معاصر حکیم مرزا محمد دہلوی (متوفی ۱۲۳۵ھ / ۱۸۲۰ء) نے تحفہ اثنا عشریہ کے رد میں "نزہت اثنا عشریہ" تالیف کی، جس کا جواب شاہ عبدالعزیز نے "عزۃ الراشدین" سے دیا۔ پھر "عزۃ الراشدین" کا

۱۔ سرسید احمد خان، آثار الصنادید ۔ ص، ۷۱

۲۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، ملفوظات ۔ ص، ۲۳

جواب حکیم باقر علی خان اور دوسرے شیعہ علماء نے تحریر کیا۔ سید دلدار علی (متوفی ۱۲۳۵ھ / ۱۸۲۰ء) نے تحفہ کے رد میں چند کتب ، صوارم الالہیات ، حسام الاسلام ، احیاء السنۃ ، رسالہ ذوالفقار ، کتاب صوارم اور "رسالہ غیبت" لکھے اور ان کے فرزند سید محمد (متوفی ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۷ء) نے تحفہ کے رد میں دو رسالے "البوارق فی بحثۃ الامت" و "طعن السرماح فی مبحث فدک والقرطاس" تحریر کیے ، پھر سید دلدار علی کے شاگرد مفتی سید محمد قلی خان (متوفی ۱۲۶۰ھ / ۱۸۳۵ء) نے تحفہ کے پہلے باب کے رد میں "سیف ناصری" ، دوسرے باب کے رد میں "تقلیب المکائد" ساتویں باب کے رد میں "تشید المطاعن وکشف الضغائن" اور گیارھویں باب کے رد میں "مصارع الافہام" لکھیں۔ مفتی سید محمد علی کے فرزند ارجمند مفتی حامد حسین (متوفی ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۹ء) نے اپنی تمام عمر تحفہ کے رد میں گزار دی لیکن ان تمام کتب اور رسائل کے باوجود کوئی بھی اس کتاب (تحفہ اثنا عشریہ) کے مقام عالی تک نہ پہنچ سکا۔

ملفوظات عزیزیہ میں ہے کہ حسن رضا خان نے تحفہ کا رد لکھنے کے لیے علامہ تفضل حسین خان (متوفی ۱۲۲۵ھ / ۱۸۰۰ء) سے کہا تھا مگر انہوں نے اس کا رد لکھنے سے انکار کر دیا۔ علمائے شیعہ نے تحفہ کے رد پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ شاہ عبدالعزیز کی بلند مرتبہ تبحر علمی اور عظمت و وقار کو مجروح کرنے کی بھی ناقابل یقین اور مذموم کوششیں کی ہیں۔ کبھی تو اس کتاب کو آپ کی تصنیف بھی تسلیم نہ کیا اور یہ الزام تراشی کی کہ اس کتاب کے لکھنے میں دوسرے علماء بھی شامل رہے ہیں یا کبھی خواجہ نصر اللہ کابلی کی کتاب "مواقع موبقہ" کا فارسی ترجمہ کہہ کر "تحفہ" کو مسروقہ کتاب کا نام دیتے ہوئے لوگوں میں غلط فہمی پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی اور پھر اس کی مکمل اور باقاعدہ اشاعت کے بعد اس کتاب میں لوگوں نے تحریفات کرنی شروع کر دی تھیں۔ بہرحال شاہ صاحب نے یہ کتاب خود تحریر فرمائی تھی اور اس میں کسی عالم فاضل کا کوئی عمل دخل نہیں رہا جیسا کہ تحفہ اثنا عشریہ" کے مقدمہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

"دریں رسالہ آنچہ از کتب معتبرہ شیعہ منقول است احتمال افتراء و بہتان
را دراں گنجائش نہ زیرا کہ کتب منقول عنھا از مشاہیر کتب شیعہ و معتبرات

ایشان اند باید کہ بعد مافی نفرماید و نقل را با اصل مطابقت دہد
وازان نترسد کہ اگر صحت نقل ظاہر شود تقبیل آن لازم گردد ،، ؎۱

علاوہ ازین لکھنو مین بہت شد و مد کے ساتھ اس بات پر اعتراض کیا گیا کہ یہ کتاب خواجہ نصراللہ کابلی کی کتاب " صواعق موبقہ ،، کا فارسی ترجمہ ہے ۔ شاہ عبدالعزیز اپنے ایک شاگرد رشید مرزا حسن علی لکھنوی کو اس کتاب کے بارے مین استفسار کرنے پر ایک طویل مکتوب مین بھی تفصیل فراہم کرتے ہوئے لکھتے ہین کہ " تحفہ اثنا عشریہ ،، کی تصنیف کے وقت اہل سنت کی وہ کتب جو مذہب شیعہ کے رد مین ہین اور فرقہ شیعہ کی وہ کتب جو مذہب اہل اہل سنت کے رد مین تالیف ہوئی ہین ، فراہم کین اہل سنت کی اس بارے مین " نواقض الروافض ،، ، " فراقض الرافض ،صواعق محرقہ " اور " شرح تجرید ،، جیسی کتب مدنظر تھین ، جب کہ اس کے متعلق شیعہ مذہب کی کتب " مصائب النواصب " شبہات الاعور " باظہار الحق " اور سفینۃ النجات " مہیا ہوئین اور دوسری طرح کی وہ کتابین بھی سامنے تھین ، جن مین مسئلہ امامت و شروح امامت و موانع امامت مفصل طور پر مذکور ہے ۔ اس بارے مین اہل سنت کی کتب مین سے " شرح مقاصد کی بحث امامت " " شرح مواقف " طوالع الانوار " اور " اربعین " پیش نظر تھین اور شیعہ مذہب کی کتب مین سے تصانیف " علامہ حلّی " ، حدائق موبقہ " جو " صواعق محرقہ " کے رد مین ہے اور " مقدار " بہم پہنچی ۔ تیسری طرح کی وہ کتابین تھین ، جن مین مذہب شیعہ کے تمام مسائل کو رد کیا گیا ہے مثلاً اہل سنت کی کتب " ابطال الباطل " صواعق موبقہ " تالیف نصراللہ کابلی کی اور مذہب شیعہ کی کتب علامہ حلّی کی " منہج الحق " اور قاضی نور اللہ شوستری کی " احقاق الحق " مہیا ہوئین ۔ تینوں طرح کی یہ کتب " تحفہ اثناعشریہ " کی تالیف کے وقت موجود اور مستحضر تھین اور اس وقت " صواعق موبقہ " کی ترتیب نہایت پسند خاطر ہوئی لہذا اسی کی ترتیب کے موافق اس کتاب " تحفہ اثنا عشریہ " کو مرتب کیا ـــ صرف اس وجہ سے کہ " تحفہ اثنا عشریہ " کی ترتیب " صواعق موبقہ " کی ترتیب کے موافق ہے ، یہ نہین کہا جا سکتا کہ " تحفہ اثناعشریہ " ، " صواعق موبقہ کا ترجمہ ہے چنانچہ جس طرح ، مواقف " کو " طوالع " سے اخذ

؎۱ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ، مقدمہ تحفہ اثنا عشریہ ۔ ص ۳۰

کیا ھے اور " مسلم " کو " مختصر الاصول " ابن حاجب سے تو ظاھر ھوا کہ اس طرح " صواعق " اور " تحفہ " میں کیا فرق ھے "۔[1]

تحریفات کے سلسلے میں آپ کے ایک معتقد نے ایک تحریف شدہ اور خلاف عقائد اھل سنت عبارت " تحفہ کے ایک نسخہ میں دیکھ کر اپنی خلش دور کرنے کی غرض سے آپ کی خدمت میں ایک درخواست بھیجی ، جس کے جواب میں شاہ صاحب نے ایک طویل مکتوب تحریر کرتے ھوئے فرمایا :

" رتعریضات در باب معاویہ رضی اللہ عنہ ازین فقیر واقع نشدہ اگر در نسخہ از تحفہ اثنا عشریہ یافتہ شود الحاق کسے خواھد بود کہ بنا بر فتنہ انگیزی و کید و مکر کہ بنائے مذھب ایشان بعض گروہ رفضہ از قدیم برھمین امور است این کار کردہ باشد چنانچہ بسمع فقیر رسیدہ کہ الحاق شروع کردہ اند اللہ خیر حافظا و این تعریضات نسخ معتبرہ البتہ یافتہ نخواھد شد "۔[2]

شاہ صاحب نے اپنی اس کتاب کے آغاز میں اپنا نام غلام حلیم تحریر فرمایا ھے تو آپ کے اس مکتوب سے ، جو آپ نے " تحفہ اثنا عشریہ " کے بارے میں مرزا حسن علی لکھنوی کو تحریر کیا ، پتہ چلتا ھے کہ آپ نے اپنا نام اس لیے پوشیدہ رکھا کہ آپ نے اپنی اس تصنیف پر فخریا خوشی محسوس نہ کی اور نہ ھی اس کی تصنیف سے آپ کا مقصد شہرت حاصل کرنا تھا ۔

تحفہ اثنا عشریہ کی باقاعدہ اشاعت ۱۲۱۵ھ / ۱۷۹۹ء میں کلکتہ سے ھوئی ۔ اور بعد ازان لوگوں نے اس میں تحریف کرنی شروع کر دی تھی پھر سر سید احمد خان نے ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء میں اپنے استاد مولوی نور الحسن صاحب کی مدد سے تحفہ اثنا عشریہ کے دسوین اور بارھوین باب کا اردو ترجمہ " تحفہ حسن " کے نام سے شائع کیا ۔ یہ دونوں باب خلفائے ثلاثہ ام المومنین اور صحابہ کے مطاعن کے جواب اور تولّد و تبرّا کے بیان میں ھیں ۔ غالباً یہ تحفہ اثنا عشریہ کا پہلا جزوی ترجمہ تھا ۔ اس کے بعد یہ کتاب ۱۳۹۵ھ / ۱۹۷۵ء میں سہیل اکیڈمی کراچی سے فارسی میں شائع ھوئی ۔ محمد علی خان ارکاٹی کے لڑکے نے مولوی اسلمی سے عربی زبان میں ترجمہ کروا کر ملک عرب میں بھیجا تھا ۔ اسکے علاوہ

۱۔ شاہ عبد العزیز ، فتاوی عزیزی ، جلد ۱ ، ص ۱۳۰ ، ۱۳۱

۲۔ شاہ عبد العزیز ، مکتوبات ۔ ص ، ۲۶۵ ، ۲۶۶

اردو ترجمہ کے فرائض مولوی سعد حسن خان یوسفی نے سرانجام دیسے ھیں ۔

تحفہ اثنا عشریہ کے ابواب :

شاہ صاحب نے تحفہ اثنا عشریہ کو بارہ ابواب میں تقسیم کیا ھے ۔ پہلے باب کا آغاز اس بات سے کیا ھے کہ شیعہ مذھب کس طرح پیدا ھوا اور کس طرح یہ مختلف فرقوں میں تقسیم ھو گیا چنانچہ اس باب کے شروع میں آپ شیعہ مذھب پر بحث کرتے ھوئے فرماتے ھیں کہ " مذھب شیعہ ابتدائے وجود سے رنگا رنگ شکلوں میں اور طرح طرح کے لباسوں میں رونما ھوتا رھا غرض ھر وقت انوکھی وضع طرز سے دنیا کے سامنے آیا ، یہاں تک کہ عراق و خراسان میں سلاطین صفویہ اس مذھب کی ترویج اور اس کے اصول وقواعد کے ضبط وتحفظ کے لیے کوشش کرتے رھے ۔ علمائے وقت نے بڑی جد وجہد کے ساتھ اس کے اصول وفروغ کی تہذیب واصلاح کرکے ان کو کتابوں اور رسالوں کی شکل میں ترتیب دیا ۔ اس کے بعد اس مذھب کا تغیّر وتبدّل بند ھوا اور ایک حالت پر اس نے قرار پکڑا ۔ یہ تغیر وتبدل اس مذھب کی خصوصیت بن چکی ھے ، برخلاف دوسرے مذاھب کے ، کہ گو وہ آپس میں فروعی مسائل میں ایک دوسرے سے مختلف رھیں لیکن انھوں نے اصول کو کبھی نہیں بدلا اور ارکان مذھب میں تبدیلی کو روا نہ رکھا "۔[1] گویا مذھب شیعہ کے بانیوں نے ھر وقت کے مطابق اپنا خاص مذھب تراشا ھے ۔ اس کے بعد اس کی تفصیل بیان کرتے ھوئے فرماتے ھیں کہ " خلفائے ثلاثہ کے دور میں یہودیوں ، عیسائیوں ، مجوسیوں اور بت پرستوں کے اکثر شہر تائید ایزدی سے صحابہ کرام اور تابعین کے ھاتھوں فتح ھوئے ، بدبخت کافروں میں قتل وقید اور لوٹ مار پڑی اور انھیں انتہائی ذلّت وعار کا منہ دیکھنا پڑا حتّی کہ ان کی بیویاں اور لڑکیاں مسلمانوں کی لونڈیاں بنیں ، مفتوحہ علاقوں کے غیر مسلمانوں پر جزیہ نافذ کیا گیا ۔ اس لیے وہ لوگ دَرپردہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ھوگئے ۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے عہد میں انھوں نے بہت سے لوگوں کو شامل کرکے مکر وفریب سے ایک ایسی جماعت بنائی ، جو مسلمانوں میں کینہ وفساد پھیلانے لگے اور برسوں سے اپنے دل میں موجود خواھشات کو پورا کرنے لگے ----- یہ لوگ چونکہ برملا

---

۱ ۔ شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی ، تحفہ اثنا عشریہ ۔ ص ۳۰

مسلمانون کے خوف سے اپنا مدعا زبان پر نہ لا سکتے تھے ،اس لیے ان لوگون نے خود کو حضرت علی کے محب ظاہر کرنا شروع کیا اور " شیعان علی " اپنا لقب ٹھہرایا ۔ اس طرح اطمینان سے مسلمانون کی صفون مین شامل ہوگئے " ۔[1]

اسی سلسلے مین شاہ صاحب عبداللہ بن سباء کی تخریبی کارروائیون اور سازشون کو بھی بے نقاب کرتے ہین اور بعد ازان اسی باب کے تحت شیعیون کے متعدد فرقون کا ذکر کرتے ہوئے انہین چار اقسام مین تقسیم کرتے ہین ۔ اوّل فرقہ شیعہ اولی یا شیعہ مخلصین ، دوم فرقہ شیعہ تفضیلیہ، سوم فرقہ شیعہ سبیہ یا تبرائیہ ۔ چہارم فرقہ شیعہ غلاۃ ۔ ان چار فرقون کا ذکر کرنے کے بعد فرقہ غلاۃ شیعہ اور ان کے چوبیس فرقون کی تفصیل بیان کرتے ہین ۔ ان مین پہلا فرقہ سبائیہ ہے ۔

" یہ لوگ عبداللہ بن سبا کے ساتھی تھے ۔ انہون نے کہا کہ حضرت علی معبود حقیقی ہین ، یہ بھی کہتے ہین کہ حضرت علی مرتضی شہید نہین ہوئے بلکہ ابن ملجم نے شیطان کو مارا جو آپ کی شکل مین منتقل ہوگیا " ۔[2] فرقہ غلاۃ کا دوسرا گروہ فرقہ مفضلیہ کا ہے ۔ " یہ لوگ مفضل صیرفی کے ساتھیون مین سے ہین اور انہون نے مذہب سبائیہ مین بہ اعتبار دیکھ کر دوسرا طریقہ اختیار کرلیا تھا اور کہا کہ جناب مرتضی کو حق تعالی سے وہی نسبت ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کو حق تعالی سے ہے ---- اور ان کے مذہب کے مطابق نبوّت اور رسالت کا سلسلہ ختم نہین ہوتا " ۔[3] غلاۃ کا تیسرا فرقہ سیرغیہ ہے ۔ " یہ لوگ سیرغ کے ساتھی ہین ۔ ان کا مذہب فرقہ مفضلیہ کی طرح کا ہے لیکن ان کے عقیدے کے مطابق لاہوت کا حلول صرف پانچ ہستیون مین ہوا ہے ۔ وہ آنحضرت کی ذات گرامی حضرت عباس ، حضرت علی ، حضرت جعفر اور حضرت عقیل رضی اللہ عنہم ہین " ۔[4] چوتھا فرقہ بزیغیہ کا ہے ۔ " یہ لوگ بزیغ بن یونس کے ساتھی ہین ۔ یہ فرقہ حضرت جعفر کی الوہیت کا قائل ہے اور کہتے ہین کہ وہ اپنی صورت مین نظر نہین آتے تھے اور بظاہر جس ہستی کو لوگ جعفر کہتے ہین ،

۱۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ، تحفہ اثنا عشریہ ۔ ص، ۳ ، ۲

۲۔ ایضاً ۔ ص، ۱۲

۳۔ ایضاً ۔ ص ، ۱۲

۴۔ ایضاً ۔ ص، ۱۲

وہ ان کی اصلی شکل نہیں تھی۔[1] پانچواں فرقہ کاملیہ ہے ۔ اصحاب کامل سے تعلق رکھنے والے یہ لوگ تناسخ ارواح کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ روح الٰہی جسم آدم علیہ السلام سے تمام انبیاء علیہم السلام کے ابدان میں منتقل ہوتی رہی ۔ یہ لوگ تمام اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ حضرت علی کو بھی (نعوذ باللہ) کافر قرار دیتے ہیں اور انہوں نے حضرت علی کی بیعت بھی نہیں کی تھی۔ اس لیے کہ انہوں نے اپنا جائز حق کیوں چھوڑا۔ چھٹا فرقہ منصوریہ ہے۔ یہ لوگ منصور بن سعید عجلی کے ساتھیوں میں سے ہیں ۔ ان کے نزدیک اللہ تعالی ایک نورانی شخص کی صورت میں ہے اور اس کے سر پر نورانی تاج اور اس کا دل حکمتوں کا چشمہ ہے۔[2] ساتواں فرقہ جناحیہ ہے ۔ یہ فرقہ بھی تناسخ ارواح کا قائل ہے ۔ ان کے نزدیک روح الٰہی حضرت آدم اور شیث علیہما السلام اور تمام انبیاء کے ابدان سے منتقل ہوتی ہوئی پیغمبر آخر الزمان تک آئی اور پھر آپ سے حضرت علی ، حسین ، محمد بن الحنفیہ سے عبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر میں منتقل ہوئی ۔۔۔۔۔ یہ قیامت کا انکار کرتے ہیں اور حرام چیزوں کو حلال جانتے ہیں۔[3] آٹھواں فرقہ بیانیہ ہے ۔ یہ بیان بن سمعان نہدی کے اصحاب ہیں ، خداوند تعالی کو اسی شکل و صورت میں جانتے ہیں اور خداوند تعالی کے حلول کے قائل ہیں۔[4] نواں فرقہ منصوریہ ہے۔ یہ لوگ ابو منصور عجلی کے اصحاب ہیں ۔ ان کے نزدیک رسالت منقطع نہیں ہوئی اور عالم قدیم ہے ۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ احکام شریعت ملا لوگوں کے گھڑے ہوئے ہیں ۔ ان کے خیال میں جنت اور دوزخ کا کوئی وجود نہیں ۔ یہ لوگ حضرت امام باقر کی امامت کے بعد ابو منصور کی امامت کو تسلیم کرتے ہیں۔[5] دسواں فرقہ غمامیہ کا ہے۔ ان کے خیال میں پروردگار عالم موسم بہار میں ابر کے پردہ میں زمین پر اترتا ہے اور دنیا میں گھوم پھر کر آسمان پر چڑھ جاتا ہے ۔ بہار کا اثر اور یہ پھول اور پھل ، غلہ اور سبزہ اسی کے اثر سے ہیں۔[6] گیارھواں فرقہ امویہ ہے۔ یہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ حضرت علی نبوت اور رسالت میں آنحضرت کے ساتھ شریک تھے۔[7] بارھواں فرقہ تفویضیہ ہے

۱۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ، تحفہ اثنا عشریہ ۔ ص، ۱۲۰
۲۔ ایضاً ۔ ص، ۱۲۰
۳۔ ایضاً ۔ ص ۱۲۰
۴۔ ایضاً ۔ ص، ۱۲۰
۵۔ ایضاً ۔ ص، ۱۲۰
۶۔ ایضاً ۔ ص، ۱۲۰
۷۔ ایضاً ۔ ص، ۱۲۰

"ان کا عقیدہ ہے کہ حق تعالیٰ نے دنیا کی پیدائش کے بعد تمام امور دنیا پیغمبر کے سپرد کر دیے تھے اور جو کچھ دنیا میں ہے، اس کو آپ کے لیے حلال اور جائز ٹھہرایا تھا۔ ان میں ایک گروہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام امور دنیا حضرت علی کے سپرد کیے تھے اور بعض لوگ دونوں کے سپرد کرنے کے قائل ہیں"۔[1] تیرھواں فرقہ خطابیہ ہے "یہ ابوالخطاب محمد بن زینب الاخدع الاسدی کے پیروکار ہیں۔ ان کے خیال میں تمام امام خداوند تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ ان کے عقیدہ کے مطابق حضرت علی اور جعفر صادق بھی خدا ہیں۔ حضرت علی کو معبود کبیر اور حضرت جعفر کو معبود صغیر کہتے ہیں اور ابوالخطاب کو پیغمبر مانتے ہیں"۔[2] چودھواں فرقہ معمریہ ہے "یہ فرقہ امام جعفر صادق کی امامت کا قائل ہے اور ان کے بعد ابوالخطاب کو نبی جانتے ہیں اور پھر اس کے بعد معمّر کو، ان کا خیال ہے کہ احکام شرع معمّر کو سونپ دیے گئے ہیں"۔[3] پندرھواں فرقہ غرابیہ ہے "اس فرقے کا خیال ہے کہ حق تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو وحی دے کر حضرت علی کے پاس بھیجا تھا اور انہوں نے اس وحی کو حضرت علی کی بجائے آنحضرت کے پاس پہنچا دیا کیونکہ آنحضرت کی شکل حضرت علی سے بہت ملتی جلتی تھی"۔[4] سولھواں فرقہ ذبابیہ ہے "یہ فرقہ آنحضرت کو نبی اور حضرت علی کو خدا کہتا ہے۔ ان کے خیال میں نبی اور خدا میں مشابہت پائی جاتی ہے"۔[5] غلاۃ کا سترھواں فرقہ ذمیہ ہے "ان کا کہنا ہے کہ حضرت علی معبود ہیں اور انہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کے پاس اپنی طرف دعوت دینے کے لیے بھیجا تھا لیکن اس کے برعکس آپ نے لوگوں کو اپنی طرف دعوت دی لہٰذا یہ لوگ آنحضرت کی برائی کرتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کو ذمیہ کہتے ہیں"۔[6] اٹھارھواں فرقہ اثنینیہ ہے۔ ان لوگوں کے خیال میں محمد اور علی دونوں خدا ہیں اس فرقے میں دو گروہ ہیں۔ بعض محمد کی خدائی کو ترجیح و تقدیم دیتے ہیں، کچھ حضرت علی کی خدائی کو غالب

۱۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، تحفہ اثنا عشریہ۔ ص ۱۲۰

۲۔ ایضاً۔ ص ۱۳۰

۳۔ ایضاً۔ ص ۱۳۰

۴۔ ایضاً۔ ص ۱۳۰

۵۔ ایضاً۔ ص ۱۳۰

۶۔ ایضاً۔ ص ۱۳۰

اور قوی بتاتے ہیں اور یہ گروہ بھی نقتون میں شامل ہے"۔[1] انیسواں فرقہ خمسیہ ہے " یہ لوگ پنجتن کو اللہ کہتے ہیں اور لفظ فاطمہ میں تانیث نہیں لگاتے ۔ ان کا قول یہ ہے کہ پانچوں درحقیقت شخص واحد ہیں کہ ایک ہی روح سب میں حلول کئے ہوئے ہے ۔ ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں "۔[2] بیسواں فرقہ نصیریہ ہے " یہ لوگ کہتے ہیں کہ خداوند تعالی نے حضرت علی اور ان کی اولاد میں حلول کیا ہے ۔ یہ لوگ آئمہ اور خصوصاً حضرت علی کو خدا مانتے ہیں "۔[3] اکیسواں فرقہ اسحاقیہ ہے ۔ " یہ لوگ کہتے ہیں کہ زمین کبھی بھی پیغمبر سے خالی نہیں رہتی ۔ حضرت علی اور آئمہ میں خدا کے حلول کرنے کے قائل ہیں البتہ اس میں اختلاف رکھتے ہیں کہ حضرت علی کے بعد پہلے کس میں حلول کیا ہے "۔[4] بائیسواں فرقہ علبائیہ ہے " یہ علبان ابن ذراع اسدی یا اوسی کے ساتھی ہیں ۔ حضرت علی کو اللہ اور محمد صلی اللہ سے افضل کہتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کی بعثت کی تھی اور ان کی اطاعت خود پر لازم کرلی تھی "۔[5] تیئسواں فرقہ رزامیہ ہے " یہ لوگ سلسلہ امامت کو یوں تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت علی کے بعد محمد بن الحنفیہ ، ان کے بعد ان کے بیٹے ابو ہاشم اور پھر حسب وصیت علی بن عبداللہ اور محمد بن علی سے منصور دوانقی تک اور ابومسلم مروزی میں بھی حلول باری تعالی کے معتقد ہیں "۔[6] چوبیسواں فرقہ مقنعیہ ہے ۔ " یہ لوگ امام حسین کے بعد مقنع کو اللہ مانتے ہیں ۔ ان کے نزدیک خدا چار ہیں ۔ حضرت علی ، حضرت حسن ، حضرت حسین اور ابن مقنع جو دراصل اسماعیل تھا لیکن جب اس نے الوہیت کا دعوی کیا تو غلاۃ میں گنا گیا "۔[7]

مندرجہ بالا فرقہ غلاۃ کے چوبیس فرقوں کا ذکر کرنے کے بعد شاہ صاحب فرقہ کیسانیہ اور اسکے چھ فرقوں ، فرقہ زیدیہ اور اس کے نو فرقوں اور فرقہ امامیہ اور اس کے انتالیس فرقوں کی تفصیل بیان

۱۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ، تحفہ اثنا عشریہ ۔ ص ۱۲۰
۲۔ ایضاً ۔ ص ۱۲۰
۳۔ ایضاً ۔ ص ۱۲۰
۴۔ ایضاً ۔ ص ۱۲۰
۵۔ ایضاً ۔ ص ۱۲۰
۶۔ ایضاً ۔ ص ۱۲۰
۷۔ ایضاً ۔ ص ۱۲۰

کرتے ھیں پھر شیعیون کی دین میں ترقی اور ریاست کی طلبی کے سلسلہ میں کوشش ،غیر ملت والون کو اپنے مذھب کی طرف رغبت دینے اور دعوت مذھب کے آٹھ اسباب کو بیان کرنے کے بعد عبداللہ بن سبا اور اس کی فتنہ انگیزی کا ذکر کرتے ھیں ۔

باب دوم میں شیعون کے مکروفریب ، حیلے بازی ، دھوکہ بازی ،لوگون کو راہ راست سے بہکانے اور بھٹکانے اور اپنے مذھب کی طرف متوجہ کرنے کے ایک سو سات مختلف طریقون کا بیان ھے گویا شاہ عبدالعزیز نے اپنی تالیف " تحفہ اثنا عشریہ " میں شیعہ داعیون کے مختلف طریقون کی تفصیلات بیان کی ھیں اور ابتدائی عہد اسلام کی تاریخ سے لے کر تحفہ اثنا عشریہ کی تالیف کے وقت تک ان کی ان تمام خفیہ دعوتون کو بڑے عمدہ اور خوبصورت انداز میں بے نقاب کیا ھے مثلاً " ان شیعہ علماء نے محض اھل سنت پر لعن طعن کرنے اور ان کے اسلاف صحابہ کرام و تابعین عظام کی عیب جوئی کی غرض سے کتابیں اور رسائل تصنیف کیے ،ان میں افتراء ،بہتان اور جھوٹ کو خوب داد دی اور مسیلمہ کذاب کی روح کو خوش کیا " ۔[1]

پھر شاہ صاحب فرماتے ھیں کہ " یہ لوگ ایک ایسی کتاب جس میں صحابہ پر لعن طعن اور مذھب اھل سنت کا بطلان ھو ، تصنیف کرتے ھیں اور اس کو اھل سنت کے کسی جلیل المرتبہ عالم کی طرف منسوب کر دیتے ھیں ۔ اس کے خطبے میں مصنف کی جانب سے یہ وصیت درج کرتے ھیں کہ ھم نے جو کچھ اس کتاب میں تحریر کیا ھے ،یہ ھمارا اصلی اور پوشیدہ عقیدہ ھے ۔ اس کو ایک محفوظ امانت اور مخفی بھید جان کر راز میں رکھیں اور ھم نے جو دوسری کتابون میں لکھا ھے ،وہ محض ایک ظاھرداری اور زمانہ سازی ھے مثلاً " کتاب " سر العالمین " کو امام غزالی کی طرف منسوب کرتے ھیں ۔ اس طرح انھون نے اور کئی کتابیں اسی قسم کی ترتیب دے کر یہی حرکت کی ھے " ۔[2]

شاہ صاحب فرماتے ھیں کہ اس مضمون کی ایک گھڑی ھوئی حدیث نبی صلی اللہ کی طرف منسوب کرتے ھیں ۔ آپ نے فرمایا کہ شیعان علی سے ان کے کسی چھوٹے اور بڑے گناہ کے بارے میں باز پرس نہیں کی جائے گی بلکہ ان کی برائیاں اچھائیون میں بدل دی جائیں گی اور یہ بھی کہ پیغمبر اسلام

۱۔ شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی ، تحفہ اثنا عشریہ ۔ ص ۲۸۰

۲۔ ایضاً ۔ ص ۳۰۰

XXXXXXXXXXXXX

فرماتے ہیں " اللہ تعالی نے فرمایا کہ " لا اعذب احداً والی علیا و " ان عصانی "۔[1]

گویا شاہ صاحب کے نزدیک ان من گھڑت روایتوں نے بہت سے آزادی پسند لوگوں کو راہ راست سے بھٹکا دیا ہے کیونکہ وہ ان جھوٹی روایتوں کو سند بناتے ہوئے دل کھول کر بدکاریوں کے مرتکب ہوتے ہیں اور خود داد بے حیائی دیتے ہوئے نیکیوں کو برائیوں میں بدل کر رکھ دیا ہے۔

تحفہ کے تیسرے باب میں شاہ صاحب نے اسلاف شیعہ کے حالات اور ان کے سات طبقوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں پہلے گروہ کے لوگ براہ راست عبداللہ بن سبا کے شاگرد تھے۔ دوسرے گروہ کے لوگ حضرت علی کے لشکر میں رہتے تھے لیکن بظاہر مخلص اور بباطن منافق تھے۔ تیسرا گروہ ان لوگوں کا تھا، جو امام حسن کے ہاتھ پر بیعت کرکے امیر معاویہ سے لڑنے کے لیے نکلے اور راہ میں غداری کی۔ چوتھا گروہ ان لوگوں پر مشتمل تھا، جنہوں نے امام حسین کو سینکڑوں خط لکھ کر کوفہ بلایا اور وہاں پہنچنے پر آپ کو دھوکہ دیا حتی کہ شہادت تک نوبت پہنچی۔ پانچواں گروہ ایسا تھا، جو امام زین العابدین سے منحرف ہو کر مختار ثقفی کی نبوت کے قائل ہوگئے تھے۔ چھٹا طبقہ ایسے اصحاب پر مشتمل تھا، جنہوں نے حضرت زید کو ناصبیوں کے قبضہ میں چھوڑ دیا تھا اور آپ شہید ہو گئے تھے۔ ساتویں طبقے میں ایسے لوگ شامل تھے جو آئمہ کرام کی شاگردی کا دعوی کرتے تھے حالانکہ امام ان کو کافر اور کاذب کہتے ہیں۔

تحفہ کے اس باب میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے شیعوں کی مستند کتب اور تصانیف کا اجمالی تعارف بھی کروایا ہے اور ان کتابوں کی روایات اور اسناد پر سخت تنقید کرتے ہوئے ان (کتابوں) کو ناقابل اعتبار ثابت کیا ہے۔

شاہ صاحب نے تحفہ کے چوتھے باب میں شیعوں کی وضع کردہ حدیثوں کی اقسام اور ان کی سندوں کے راویوں کے حالات کو بھی عیاں کر دیا ہے۔ اس باب کے آخر میں " تتمہ باب " کے تحت شاہ صاحب نے شیعوں کے دلائل کے بیان استشہاد واستدلال سے کام لیا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ " شیعوں

۱۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، تحفہ اثنا عشریہ۔ ص، ۱۲۲

کے نزدیک دلیل کی چار اقسام ھیں ۔ کتاب ، خبر ، اجماع اور عقل ۔ ان میں کتاب یعنی قرآن پاک ان کے گمان میں قابل استدلال نہیں کیونکہ اس کے قرآن ہونے پر اسی وقت اعتماد ھو سکتا ھے ، جب کہ یہ امام معصوم کے واسطے سے پہنچے ۔[1] شیعہ مذھب کے مطابق خبر بھی قابل اعتبار نہیں اور نہ ھی اجماع کی کوئی اھمیت ھے ۔ رھی عقل تو اھل شیعہ کے نزدیک امور شرعیہ میں عقل سے دلیل لانا قابل حجت نہیں ۔ علاوہ ازیں شاہ صاحب نے شیعہ عقائد میں شامل چند مسائل کا ذکر بھی کیا ھے ، جو مذھب کے لوگ ، قرآن اور اھل بیت سے مخالفت کے باعث ان پر عائد کرتے ھیں ۔

اس کتاب کے پانچویں باب میں شاہ صاحب نے الٰہیات اور شیعوں کے باطل ایسے عقائد کا ذکر کیا ھے ، جو اھل سنت کے عقائد کے خلاف ھیں ۔

تحفہ کے چھٹے باب میں شاہ صاحب نے انبیاء علیہم السلام پر ایمان اور ان کی نبوت کے بارے میں بحث کرتے ھوئے شیعوں کے پندرہ عقائد قلم بند کیے ھیں ۔ شیعوں کے ان عقائد سے یہ بات ظاھر ھوتی ھے کہ آئمہ کا درجہ یوم قیامت انبیاء سے افضل ھوگا اور یہ کہ حضرت آدم ، آئمہ سے حسد رکھتے تھے ۔ علاوہ ازیں انبیاء کے لیے کذب و جھوٹ جائز ھے بلکہ بلحاظ تقیہ جھوٹ بولنا واجب ھے ، بعض شیعہ کہتے ھیں کہ خاتم النبیین علی بن ابی طالب ھیں اور امام حکم شرعی کو منسوخ یا تبدیل کر سکتا ھے ۔ ان تمام عقائد کا رد شاہ صاحب نے استدلال و استشھاد سے کیا ھے ۔

تحفہ اثنا عشریہ کے ساتویں باب میں شاہ عبدالعزیز نے شیعوں کی امامت اور ان کے چند عقائد پر مفصل بحث کرتے ھوئے شیعہ دلائل کی مدلل تردید کی ھے مثلاً " شیعہ حضرات کا یہ کہنا ھے " امام کے لیے واجب ھے کہ معصوم ھو اور حضرت علی کے علاوہ کوئی معصوم نہیں تو وھی امام ھوں گے نہ کوئی اور ۔ بس یہی مدعا ھے تو اس کا جواب شاہ صاحب اس دلیل سے دیتے ھیں کہ صغری اور کبری ھر دو ناقابل تقسیم ھیں ، صغری اس لیے کہ حضرت امیر نے صراحۃً فرمایا

---

[1] ۔ شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی ، تحفہ اثنا عشریہ ۔ ص ، ۱۲۲

"انما الشوری للمهاجرین والانصار" اور ظاہر ہے کہ مہاجرین و انصار کی جماعت میں جس سے ان کو خلیفہ چنا کوئی معصوم نہ تھا۔[1]

شیعہ فرقہ کا یہ بھی کہنا ہے۔ امام کو چاہئے کہ اس نے کبھی کفر نہ کیا ہو کیونکہ اللہ تعالی نے فرمایا ہے: (لاینال عہدی الظالمین) اور کافر ظالم ہے، پھر فرمایا "والکافرون هم الظالمون" یا ارشاد فرمایا "ان الشرک لظلم عظیم" اور سوائے حضرت امیر کے سب نے بت پرستی کی ہے لہذا آپ کے علاوہ کوئی دوسرا امام نہیں اور آپ امامت کے لیے متعیّن ہوئے۔ اس کا جواب شاہ صاحب یہ دیتے ہیں کہ امامت کی یہ شرط کسی شیعہ و سنّی نے اپنی کتاب کلامیہ میں نہیں لکھی۔ وہاں خلفائے ثلاثہ کی امامت سے انکار کرنے کے سلسلہ میں طائفے شیعہ نے یہ شرط تراشی ہے، نہ کسی آیت میں اس کا ذکر ہے، نہ کسی حدیث میں اس طرف اشارہ ہے۔ ظاہر ہے امور شرعیہ دینیہ میں سے کسی امر دینی میں کفر سابق کا اعتبار نہیں کیا گیا بلکہ ایمان کے بعد سو سال کا بوڑھا کافر اور وہ جس کی ستر پشتیں اسلام میں گذری ہوں، ہر دو برابر ہیں تو اس میں یہ شرط کیوں ملحوظ ہو اور آیت لاینال عہدی الظالمین سے اس جگہ تمسّک کرنا مضحکہ خیز ہے۔[2]

اس کتاب کے آٹھویں باب میں شاہ صاحب نے امور معاد کے بارے میں شیعوں کے سات عقائد بیان کیے ہیں۔ شیعوں کے اکثر فرقے یوم قیامت کے قائل نہیں بلکہ تناسخ پر یقین رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں شاہ صاحب اپنے پختہ دلائل سے انہیں مرعوب کرتے ہیں کہ ارشاد باری تعالی ہے۔ "فاذا هم من الاجداث الی ربهم ینسلون۔ فسیقولون من یعیدنا قل الذی فطرکم اوّل مرّة"۔[3]

اسی طرح شیعہ حضرات عذاب قبر اور قرآن و حدیث میں سوال قبر و حساب وغیرہ پر بالکل یقین نہیں رکھتے اور شیعوں کے نزدیک خواہ گناہ صغیرہ ہو خواہ گناہ کبیرہ، انہیں اللہ تعالی عذاب نہیں دے گا۔ یہ بات بھی ان لوگوں کے من گھڑت عقائد میں شامل ہے۔

۱۔ شاہ عبدالعزیز محدث دهلوی، تحفہ اثنا عشریہ۔ ص، ۲۲۱

۲۔ ایضاً۔ ص، ۲۲۱، ۲۲۲

۳۔ ایضاً۔ ص، ۲۳۶

تحفہ کے نویں باب میں شاہ صاحب نے ان کے احمقانہ ، کفریہ اور شرکیہ مسائل کو بیان کیا ہے ۔ شیعہ حضرات صحابہ کرام ، خلفائے ثلاثہ اور ان چند امہات المومنین کو جو آنحضرت کی محبوب ترین تھیں ، کافر ٹھہراتے ہیں ۔ حضرت عمر پر لعنت بھیجنے کو ذکر اللہ سے افضل گردانتے ہیں ۔ کبار ، مہاجرین وانصار ، خلفائے ثلاثہ اور اکثر عشرہ مبشرہ مثلاً طلحہ ، زبیر ، عائشہ اور حضرت حفصہ پر نماز پنجگانہ کے بعد لعنت بھیجنا پہلا واجب جانتے ہیں اٹھارہ ذالحج کو عید غدیر مناتے ہیں ، جس کو عیدین پر فضیلت دیتے ہیں ۔ اس لیے اس عید کا نام عید اکبر رکھتا ہے ، جو سراسر شریعت کے صریح مخالف ہے ۔ بابا شجاع الدین مجوسی آتش پرست کی عید ، جو ان کے نزدیک ابولولوءٌ قاتل عمر کا لقب ہے ، نو ربیع الاوّل کو مناتے ہیں ۔ اس دن کی بہت تعظیم کرتے ہیں اور بزرگی کا دن سمجھتے ہوئے خیرات بھی کرتے ہیں ۔ اس طرح شیعہ نوروز کا دن مناتے اور ظالم بادشاہوں کے لیے سجدہ کرنا جائز سمجھتے ہیں ۔ علاوہ ازیں اس باب میں شاہ صاحب نے صفت وضو وغسل وتیمم ، مسائل نماز ، روزہ ، اعتکاف ، زکوۃ ، حج ، جہاد ، نکاح ، بیع وتجارت ، رہن ، دین ، غصب وامانت ، عاریت ، لقیط ، اجارہ ، ہبہ ، صدقہ اور وقف ، متعہ ، رضاع وطلاق ، عتاق ، ایمان ونذور ، قضا ، دعوی ، شہادت ، صید وطعام اور فرائض ووصایا پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے اور شیعہ فرقہ کی کمزوریوں اور کفر کو وضاحت سے بیان کیا ہے ۔

دسویں باب کے تحت شاہ صاحب نے فرمایا ہے کہ شیعوں نے خلفائے ثلاثہ ، صحابہ کرام اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کے بارے میں بہت سی غلط روایات کو جنم دیا ہے ، جس کا ذکر انہوں نے اہل سنت کی کتب کے حوالوں سے اپنی کتب میں کیا ہے اور ان کی سند اہل سنت کی کتب سے

ثابت کی ہے ۔ اس ضمن میں ایک سو چھپن وضعی روایات کا ذکر کیا ہے ۔

تحفہ اثنا عشریہ کے گیارھویں باب میں شاہ عبدالعزیز صاحب نے شیعہ مذہب کے خواص و

عادات کا ذکر کرتے ہوئے ان کے اوہام کی پچیس انواع ، ہفوات کی تیس اقسام اور تعصبات کی پچیس قسموں کو بیان کیا ہے اور تیس ہفوات کے بارے میں تفصیلاً بحث کی ہے ۔ اس باب کے آخر میں

شاہ صاحب نے قرآن پاک کی بارہ آیات سے مذہب اہل سنت کی حقانیت ثابت کی ہے اور مذہب اہل سنت کو برحق ثابت کرنے کے لیے شیعوں کی کتابوں اور اقوال اہل بیت سے استدلال فرمایا ہے۔

تحفہ کے بارھویں باب میں تولّد اور تبّرا کے موضوعات زیر بحث لائے گئے ہیں، جو دس مقدموں پر مشتمل ہیں۔ شاہ صاحب نے محبت وعداوت کی اس نازک بحث پر مبنی مقدمات کو شیعہ کے معتبر علماء کے اقوال اور آیات قرآنی کی رو سے ثابت کیا ہے کہ کون محبت کے قابل ہے اور کون عداوت کے لائق۔

یہ تھی شاہ عبدالعزیز کی تحفہ اثنا عشریہ، کہ جس کا رد آج تک بے شمار شیعہ علماء لکھتے آئے ہیں لیکن کوئی بھی اسکے بلند مقام تک نہ پہنچ سکا اور یہ آج بھی دنیا کے تمام مسلمانوں میں ایک عظیم ترین مقام رکھتی ہے۔

السرّ الجلیل فی مسئلۃ التفضیل :

سراج الامت حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اپنی فارسی تصنیف "تحفہ اثنا عشریہ" کے اختتام کے طور پر ایک مختصر اور مستقل فارسی رسالہ "سرّ الجلیل فی مسئلۃ التفضیل" اپنے بعض دوستوں کی خواہش اور فرمائش پر بطور عجالۃ الوقت نہایت مفید انداز میں تحریر فرمایا جیسا کہ اس رسالہ کے آغاز میں ہی شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ :

"چون از تسوید تبییض تحفہ اثنا عشریہ بعون عنایت الہی فراغت حاصل شد بعضے از دوستان صادق و یاران موافق با آرزوی تمام و اشتیاق مالا کلام استدعا نمودند کہ مسئلہ تفضیل را نیز تفصیلے لائق دادہ شود تا دریں مباحث کہ نقل ہر مجلس ومشغلہ ہر محفل اند لفظے باقی نماند بنا براں این رسالہ مختصرہ بطریق عجالۃ الوقت بتحریر آمد کہ مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ و سمیتہا بالسرّ الجلیل فی مسئلۃ التفضیل"۔[1]

۱۔ شاہ عبدالعزیز، سرّ الجلیل فی مسئلۃ التفضیل۔ ص، ۹۰

اس رسالہ میں آپ نے عقلی ونقلی دلائل سے یہ وضاحت فرمائی ہے کہ کوئی چیز کسی چیز سے یا کوئی انسان کسی انسان سے کن وجوہات کی بنا پر افضل ہے چنانچہ معیار فضیلت کے مطابق صحابہ کرام کے حالات کا موازنہ کرتے ہوئے اپنے ٹھوس اور پختہ دلائل سے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ اصول ترجیح اور تفضیل کے لحاظ سے تمام صحابہ کرام میں افضل حضرت ابوبکر صدیق ہی ہو سکتے ہیں۔ خلافت کی ترتیب بھی بعینہ قرآن اور سنت کے اصولوں کے مطابق ہے لہذا اس رسالے کو شاہ صاحب نے گیارہ مقدموں میں تقسیم کیا ہے۔

مقدمہ اوّل میں فضیلت کی پہلی عمومی قسم کے تحت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ بعض اوقات اللہ تعالی کسی چیز کو اس کے کسی سابقہ عمل یا کسی خاص خدمت وعبادت کے بغیر ہی کسی دوسری چیز پر فوقیت دے کر فضیلت عطا فرماتے ہیں اور اپنی مخلوقات مثل انسان و غیر انسان، حیوانات ونباتات وجمادات میں سے جس کو چاہے، اپنی انتہائی وسیع فضیلت میں سے عظیم وبلند مرتبہ سے سرفراز کرتے ہیں مثلاً فرشتوں کی فضیلت، انبیاء علیہم السلام کی فضیلت، آنحضرت کے صاحبزادے ابراہیم کی فضیلت حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کی فضیلت، حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبیحہ کی فضیلت، حرمین محترمین کی فضیلت، مساجد کی فضیلت، حجر اسود کی فضیلت، ماہ رمضان اور روز جمعہ وعرفہ و عاشورہ کی فضیلت، عشرہ ذوالحج کی فضیلت، شب قدر کی فضیلت، نماز فرض اور خاص طور پر نماز عصر وفجر کی فضیلت اور ارکان نماز میں سجدہ کی فضیلت۔

مندرجہ بالا فضیلت کی پہلی قسم کے تمام امور کی افضلیت محض قسمت اور تقدیر الہی پر موقوف ہے، نہ کہ کسی انسان کے عمل وفعل اور کوشش پر۔

فضیلت کی دوسری قسم جزوی ہے صرف اصل عقل کی تین جماعتیں ملائکہ، جنات اور انسان کو ہی نوازا جاتا ہے لیکن آخرکار اس فضیلت کی انتہا بھی پہلی قسم کی فضیلت پر ہوتی ہے۔ پہلی قسم کی فضیلت میں حضرت شارع علیہ السلام کا ارشاد کافی ہوتا ہے لیکن صحابہ کرام، ازواج مطہرات اور بنات مکرمات میں سے جو کسی کو کسی پر فضیلت حاصل ہے تو بعض احادیث سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بات فضیلت کی پہلی قسم میں شامل ہے لیکن احادیث اور آیات قرآنیہ کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات

ظاہر ہوتی ہے کہ یہ فضیلت کی دوسری قسم جزئی میں داخل ہے۔

مقدمہ دوم میں فضیلت جزئی کی سات اقسام کو بیان کیا گیا ہے گویا کسی انسان، ملائکہ اور جنات کے اعمال میں سے ہر ایک عمل کو دوسرے پر سات وجہ سے فضیلت ہو سکتی ہے۔

فضیلت جزئی کی پہلی قسم میں کسی انسان کے عمل کی نوعیت اور اس کا وصف شامل ہے یعنی اگر ایک شخص دشمنوں کے ساتھ جہاد میں مصروف رہتا ہے اور دوسرا نماز روزے میں زیادہ وقت گزارتا ہے تو گویا دونوں انسان اپنے مقصد اور حق کی تکمیل کے لیے بہت کوشش کرتے ہیں لیکن ان میں سے ایک کے عمل کو دوسرے کے عمل پر فضیلت اور فوقیت حاصل ہے۔

فضیلت جزئی کی دوسری قسم نیت عمل کی غرض اور علت ہے مثلاً دونوں شخصوں نے برابر اپنے عمل میں محض رضائے الٰہی کا قصد کیا ہے لیکن اگر ان میں سے ایک آدمی اپنے عمل میں کسی دنیاوی خیال یا ارادے کو شامل نہیں کرتا اور دوسرا آدمی رضائے الٰہی کے مقصد کی تکمیل میں کسی قدر کمی اور کوتاہی کرتا ہے تو اس لحاظ سے پہلے آدمی کا عمل دوسرے آدمی کے عمل سے افضل ہے۔ فضیلت کی تیسری قسم کیفیت عمل ہے مثلاً ایک آدمی کبیرہ گناہوں کا ارتکاب تو کرتا ہے لیکن صغیرہ گناہوں سے بچتا ہے اور دوسرا آدمی بڑی طاعت و عبادت الٰہی میں مصروف رہتا ہے لیکن اس کے باوجود کبیرہ اور صغیرہ گناہوں میں مبتلا رہتا ہے لہٰذا ان دونوں آدمیوں میں سے پہلے آدمی کے عمل کی کیفیت دوسرے آدمی سے بہتر ہے کہ جو کبیرہ و صغیرہ گناہوں کا ارتکاب کرتا رہتا ہے۔

فضیلت کی چوتھی قسم کمیت عمل ہے، مثلاً اگر دو شخص ایک ہی وقت میں اسلام لائے اور ہجرت کی، پھر ان میں سے ایک شخص شہید ہو گیا اور دوسرا غازی تو بعض لوگوں نے شہید کو غازی سے افضل قرار دیا لیکن آنحضرت نے فرمایا کہ پھر غازی کی نمازیں اور روزے کہاں جائیں گے گویا دونوں اپنے اعمال کی وجہ سے افضل ہیں۔ اس لیے شہید کو غازی پر فضیلت نہیں دی جا سکتی۔

فضیلت کی پانچویں قسم زمان عمل ہے، مثلاً فقر و احتیاج اور تنگدستی کی حالت میں اللہ کی راہ میں ایک درہم خرچ کرنا غناء و ثروت کے وقت بہت زیادہ خرچ کرنے سے افضل ہے۔ اس کی تائید میں ارشاد الٰہی ہے۔ "لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح و ٰقاتل اولٰئک اعظم درجۃ من الذین

ازواج مطہرات اس بزرگی کی مستحق ٹھہرتی ہیں کیونکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کی صحبت میں رہنے کے سبب سے وہ صحابہ کرام سے بھی اعلی مقام رکھتی ہیں ۔

مقدمہ ششم میں شاہ صاحب مسئلہ تفاضل یعنی بعض چیزوں کی بعض پر فضیلت رکھنے کی وضاحت کرتے ہیں کہ مقابلہ صرف ان دو چیزوں میں ہو سکتا ہے جو ایک ہی ترازو میں تولی جاتی ہوں لیکن دونوں چیزیں فرق ہوں ، یہ کہا کہ ناقہ صالح علیہ السلام بہتر ہے یا رمضان المبارک ، بالکل غلط ہوگا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ مکہ مکرمہ بہتر ہے یا مدینہ منورہ ناقہ علیہ السلام بہتر تھی یا آنحضرت کی ناقہ عضباء تو بجا ہوگا ۔ اس طرح آنحضرت کے بیٹے ابراہیم کی فضیلت صدیق اکبر کے مقابلہ میں کوئی معنی نہیں رکھتی ۔

مقدمہ ہشتم میں شاہ صاحب میں سیادت اور فضیلت و امامت میں فرق کی وضاحت کرتے ہیں کہ سیادت ، سرداری ہے اور فضیلت ، اپنے اعمال کی بنا پر افضل ہونا ۔ نبی اکرم کی اولاد آپ کی شرافت اور بزرگی کے باعث سادات کہلاتی ہے لیکن ان کی فضیلت ان کے اعمال پر منحصر ہے اور حضرت عمر بن الخطاب اپنی امامت و خلافت کے باوجود عمرو بن العاص کی اطاعت کرتے تھے ۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عمرو بن العاص اپنے اعمال کی بنا پر عمر بن الخطاب سے افضل تھے لہذا آپ نے عمرو بن العاص کی اطاعت کو واجب سمجھا ۔

مقدمہ نہم میں صحابہ کرام میں سے بعض کی بعض پر فضیلت کا بیان ہے لہذا صحابہ کرام میں سے افضل وہ اصحاب ہیں ، جنہوں نے ابتدائے اسلام میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا اور پھر وہ حضرات جنہوں نے ہجرت سے پہلے بیعت عقبہ میں پہلی مرتبہ شرکت کی ، اس کے بعد جو عقبہ ثانیہ میں بیعت سے مشرف ہوئے ، پھر جو غزوہ بدر میں شریک ہوئے اور وہ جو اس غزوے کے بعد دوسرے بعد کے غزوات میں شامل ہوئے کیونکہ ان حضرات کے قلوب کا پاک صاف ہونا قرآنی آیات سے ثابت ہے جیسے " قال اللہ تعالی فانزل السکینۃ الی اخر " ۔

مقدمہ دہم میں اعمال کے لحاظ سے افضل و مفضول کی تحقیق کرنے کے بعد حضرت ابو بکر صدیق کو افضل ثابت کیا ہے کیونکہ حضرت ابو بکر کامل عالم ، فقیہہ اور قاری تھے اور آپ کو

تمام اوصاف مثلاً علم قرات ، جہاد ، زہد ، تقویٰ و پرہیزگاری ، خشیت ، صدقہ ، عشق ، اطاعت خدا و رسول اور حسن سیاست وغیرہ میں بہت بلند مقام حاصل تھا۔

گیارھویں مقدمے میں حضرت عثمان غنی اور حضرت علی کے فضائل کا مقابلہ و موازنہ کیا گیا ہے - حضرت عثمان کی قراتٔ قرآن ، لوگوں کو نسخہ قرآن پر جمع کرنا ، معاملات جہاد میں لشکر اسلام کی مدد کرنا اور بے دریغ مال خرچ کرنے پر فضیلت حاصل ہے جب کہ حضرت علی کو ان کے فتاویٰ ، اجتہاد اور روایات احادیث کے علاوہ جہاد میں دست بدست طعن و ضرب کے سبب بہت بلند درجہ حاصل ہے گویا دونوں اصحاب اپنی فضیلتوں کے باعث بہت عظیم الشان مقام کے حامل ہیں -

رسالہ سرّ الجلیل گیارہ مقدمات پر مبنی ہے ، جس میں ایک کی دوسرے پر فوقیت و فضیلت کو ان کے اعمال کے ذریعے ثابت کیا گیا ہے - اس کتاب کے آخر میں شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ یہ کتاب گویا تحفہ اثنا عشریہ کا تتمّہ ہے - اس رسالے کے اردو ترجمہ کے فرائض مفتی محمد شفیع صاحب نے سر انجام دیے ہیں -

ملفوظات شاہ عبدالعزیز:

خاتم المفسرین و محدثین شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا شمار ان مقدس مشائخ و علماء میں ہوتا ہے ، جو مدت سے مسلمانوں کے انتشار اور مسلم حکومت کے زوال کو دور کرنے کے لیے اپنی تبلیغی مساعی اور اظہار حق میں مصروف رہے - علاوہ ازیں آپ عالم شباب میں نہایت اداسی کی حالت میں ہدایتی اور بے چینی کے متعلق اپنے چچا شاہ اہل اللہ کو دل سوز خطوط لکھتے رہے اور کبھی موقع و محل کو مدّنظر رکھتے ہوئے تصنیف و تالیف کی صورت میں اپنے احساسات و خیالات کا اظہار فرماتے - " ملفوظات عزیزیہ" بھی اسی نوعیت کا شاہ صاحب کے ارشادات کا مجموعہ ہے - اس مجموعہ میں آپ کے وہ تمام اقوال و ارشادات جمع کیے گئے ہیں جو آپ نے اپنے مریدین و حاضرین کی مجلس میں

ان کے استفسارات کے جوابات میں ان کی راہنمائی اور اصلاح کے لیے ارشاد فرماتے اور ان مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا یا پھر آپ خود اپنے شاگردوں کی ہدایت و تربیت کے لیے کسی مسئلہ کو اہم سمجھتے ہوئے سلجھا دیتے ۔

ابتدائے زمانہ سے یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ صوفیاء و مشائخ کے ان اقوال و ارشادات کو ان کے مریدوں میں سے کوئی مرید قلم بند کر لیتا ہے ۔ شاہ عبدالعزیز کے ملفوظات بھی دہلی سے باہر رہنے والے کسی مرید نے جمع کیے ہیں لیکن اصل کتاب جو ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء میں مطبع مجتبائی میرٹھ سے چھپی ہے ، اس پر کسی جامع کا نام درج نہیں البتہ اس نے کتاب کے آغاز میں تحریر کیا ہے کہ " میں ۱۲ رجب ۱۲۳۳ھ بروز شنبہ کو شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ آپ کو احباب و اعزاء کا سلام پہنچایا ، حضرت (شاہ صاحب) نے جسمانی و روحانی و اہلی و مالی خیر و عافیت کا استفسار کرنے کے بعد میرے مشاغل کے متعلق معلوم فرمایا ۔ اسی دن میں نے ملفوظات لکھنے کی اجازت حاصل کی ، پھر ۱۷ رجب ۱۲۳۳ھ سے ملفوظات کا سلسلہ شروع کر دیا "۔[1]

" نسیم احمد فریدی امروہی کی رائے میں یہ ملفوظات سترہ رجب ۱۲۳۳ھ کو جمع کرنے شروع کیے گئے ۔ چند شوال ۱۲۳۳ھ کے آغاز میں شاہ رفیع الدین کا انتقال ہوا اور پھر اس مجموعہ ملفوظات کے آخر میں ان کے مرض اور وفات کے کچھ واقعات ہیں۔ چند صفحات کے بعد ملفوظات ختم ہو جاتے ہیں "۔[2]

اگرچہ نسیم احمد صاحب نے واضح طور پر شاہ رفیع الدین کو جامع ملفوظات قرار نہیں دیا لیکن یہاں جامع ملفوظات عزیزی سے ان کی مراد شاہ رفیع الدین کی ذات اقدس ہے تو حقیقتاً شاہ رفیع الدین دہلی کے باہر قیام پذیر نہیں تھے اور پھر شاہ رفیع الدین کی وفات کے احوال کا ذکر کرنے کے بعد کل ملفوظات کا ایک تہائی حصہ ابھی اور باقی رہ جاتا ہے،

۱- شاہ عبدالعزیز ، ملفوظات ، ص ۱

۲- الرحیم ،جولائی ۱۹۶۷ء ،ص ۱۱۵

نہ کہ صرف چند صفحات - یہ ملفوظات مختلف معلومات کا بیش بہا خزانہ ہونے کے باعث شہرت دوام کا مقام رکھتے ہیں - یہ ملفوظات کسی خاص موضوع کے متعلق نہیں بلکہ تاریخی واقعات ، تحقیقی نکات ، علمی بیانات ، رموز طریقت و بیعت و ارادت ہر گفتگو ، علم و عمل کے متعلق مسائل ، حدیث و تفسیر کے کچھ پہلو ، نکاح و طلاق اور صوم و صلوۃ کے احکام ، اپنے والد ماجد و بعض مشاہیر کی غزلیں اور موقع و محل کے ابیات کے علاوہ بےشمار نوادرات کا ایک مختصر مگر دلچسپ انسائیکلو پیڈیا ہے - اب مختصراً آپ کے چند ملفوظات ملاحظہ ہوں :

(۱) ارشاد شد : " باعتبار سورۃ آخر سورۃ اذا جاء کہ آنرا سورۃ نصر و فتح میگویند است جز پیغام اجل آنحضرت محمدؐ بود جہت آنکہ چون انواع نصرت بحضرت رشید و آنچہ مطلب از بعثت بود بحصول انجامید حالا بیا ارشاد شد کہ آنحضرت مصداق خبر خلافت حضرت آدم و متمم آں از چہار نوع بود " -[۱]

(۲) مہدی عرض داشت کہ مسمی مدار بخش قوال جوان خوشرو و خوشگو و خشخو مریدان مرید از جہت محبت و خلوص کہ وارد استدعای غزل حضور کردہ است ارشاد شد از غزل والد ماجد و بعضے ازان خود برادر دہ خواہم داد غزل از والد ماجد

من نہ دانم بادہ ام یا بادہ را پیمانہ ام — عاشق شوریدہ ام یا عشق یا جانانہ ام

مبتلائے حیرتم جان گویمت یا جان جان — اصطلاح شوق بسیار است من دیوانہ ام

--- ---

ای امین ہر ستم نام تجدد تہمت است — در ازل پیش از زمان تعمیر شد میخانہ ام " -[۲]

(۳) " ارشاد شد کہ بعض امورات کہ بعد تجربہ معلوم میشود یکی آنکہ مطالعہ کتب

۱- شاہ عبدالعزیز ، ملفوظات ، ص ، ۲

۲- ایضاً - ص ، ۱۰

خوب آنکس میکند که نحو خوب یاد دارد و در مناظره کسے غالب می آید که اصول خوب یاد میدارد و فکر دجادہ نشستہ تنہا کسیکہ منطق خوب یاد دارد ، ارشاد شد عالم پختہ چہار چیز درست باشد مطالعہ و درس و تحریر و تقریر و مناظرہ درست داشت باشد بازار " ۔[۱]

(۴) در جواب سائلی ارشاد فرمود کہ نیت روزہ رمضان شریف و روزہ نفل و روزہ نذر غیر معین تا دو پاس روز است مگر نیت قضائی روزہ و روزہ نذر معین از شب می باید ار " ۔[۲]

(۵) " مهدی عرض کرد اگر حافظ بعد ختم تراویح ختم دیگر کند ادای سنت میشود یا نہ فرمود آرای میشود ادہا کہ جائز دمیدانند مؤلفت اند مهدی عرض کرد کہ ناسخ منسوخ در حدیث چرا میرهن نکردہ اند ارشاد شدہ صحیح معلوم کرد پس چرا در عمل بشبہ منسوخیست یا تاویل هائی دیگر عمل نکنند " ۔[۳]

(۶) شخصی پرسید کہ قصیدہ غوثیہ از تصنیف حضرت است ارشاد شد کہ کلام خام میشود غالباً کہ از آنحضرت نباشد مگر مضمون قصیدہ در فخر و مدح البتہ از آنحضرت است " ۔[۴]

طوالت کے خوف سے بچتے ہوئے صرف مندرجہ بالا چند ملفوظات پر اکتفا کرنا مناسب ہوگا ۔ ملفوظات عزیزی " کو اگرچہ ۱۲۳۳ھ میں شاہ عبدالعزیز کی زندگی کے آخری عرصہ میں جمع کیا گیا لیکن یہ باقاعدہ ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء میں مطبع مجتبائی میرٹھ سے طبع ہوئی اور دو سال بعد یعنی ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء میں مطبع هاشمی میرٹھ سے اس کا اردو ترجمہ شائع کیا گیا ، جس کے مترجم مولوی عظمت الہی بن مولوی محمد هاشم تھے ۔ اب دوسر ی مرتبہ ۱۲۷۷ھ/۱۹۶۰ء میں پاکستان هسٹاریکل سوسائٹی سے اس کا اردو ترجمہ چھپا ہے ، جس کے مترجمین مولوی محمد علی قریشی لطفی اور مفتی انتظام اللہ شہابی ہیں ۔

۱۔ شاہ عبدالعزیز ، ملفوظات ۔ ص ، ۲۵

۲۔ ایضاً ۔ ص ، ۶۳

۳۔ ایضاً ۔ ص ، ۹۱

۴۔ ایضاً ۔ ص ، ۹۸

وسیلۃ النجات :

فخر المحدثین مولانا شاہ عبدالعزیز کا یہ رسالہ " وسیلۃ النجات " آپ کے احباب میں سے کسی کے سوال کا جواب ہے جیسا کہ آپ نے اس رسالہ کی ابتداء میں فرمایا ہے :

" سبب تالیف شخصے از آشنایان کہ بمذہب تشیع الفت داشت استدعا نمود کہ چند کلمہ در بیان دلائل حقیقت فرقہ ناجیہ باید نوشت بحکم الدین النصیحۃ اجابت آن مسئول کردہ آمد واین رسالہ را وسیلۃ النجات نامیدہ شد "۔[1]

اس رسالے میں شاہ صاحب نے نصوص قرآنی کو بنیاد بنا کر فرقہ ناجیہ اہل سنت والجماعت کو ثابت کیا ہے۔ علاوہ ازیں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اپنے دور میں پیش آنے والے شیعہ و سنی مسائل پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے دلائل وبراہین سے اہل سنت والجماعت کی حقانیت کو ثابت کیا ہے، تاکہ طالبان راہ نجات اس پر عمل کریں اور باطل مذہب سے دست بردار ہو جائیں۔ شاہ صاحب سے اس موضوع پر تبصرہ کرنے والے کا مختصر سوال یہ ہے کہ " اہل سنت کے نزدیک ان کا مذہب برحق اور قرآن وحدیث کے موافق ہے۔ شیعہ کی سب کتب باطل اور افتراء ہیں اور اہل سنت اپنے مذہب کی نسبت اہل بیت کی طرف کرتے ہیں بلکہ ہمارا مذہب اہل بیت کا مذہب ہے اور شیعوں کا دعوی بھی یہی ہے کہ ہمارا مذہب قرآن پاک کے موافق اور طریق کار امام جعفر صادق کا طریقہ ہے اور اہل سنت کی کتب قابل اعتبار نہیں، اس سلسلے میں آیات قرآنی سے وضاحت کرنی چاہیئے۔

شاہ صاحب اس کے جواب میں رقمطراز ہیں کہ کسی مذہب کو مستحکم اور راسخ دیکھنے کے بعد اسے حق سمجھو، پھر اس مذہب کی کتب دیکھنے کے بعد اس پر پورے طور پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ البتہ کسی باطل مذہب کو دیکھنے کے بعد اس کی کتب کو ضائع کر دو کیونکہ ایسا مذہب اہل بیت کا نہیں، بلکہ شیطان کا ہے۔ اہل سنت مذہب کی بنا تو خلفائے اربعہ کے ایمان وتقوی و

1۔ شاہ عبدالعزیز، وسیلۃ النجات۔ ص ۲۰۲

صلاح و راستی پر ہے اور چاروں خلفاء کے بعد ان اصحاب رسول کے عدل و انصاف پر جو خلافت کو حسب معمول چلانے کے ساتھ ساتھ اہل بیت کی خدمت بجا لاتے تھے ۔ اس کے برعکس مذہب شیعہ کی بنا اس بات پر ہے کہ وہ حضرت علی کے علاوہ خلفائے ثلاثہ کے کفر و نفاق کے قائل ہیں ۔ ان لوگوں کے نزدیک صحابہ کرام کا ایمان کفر و نفاق پر مبنی ، ان کی ہجرت ریاست کے حصول کے لیے اور ان کا جہاد وعبادت ریا وطمع ولالچ کی غرض سے تھا حالانکہ یہ سب کچھ اللہ کی راہ میں تھا ۔ اس کی دلیل میں آپ مختصراً چند آیات کا حوالہ دیتے ہیں ۔ قولہ تعالی

" والسابقون الاولون من المهاجرين والانصار والذين اتبعوهم باحسان رضی الله عنهم ورضوا عنه " ۔[1]

پھر فرمایا :

" اعد لهم جنت تجری من تحتها الانهار " ۔[2]

گویا ان آیات سے اس بات کی وضاحت کر دی کہ مہاجرین وانصار میں سابقین اولین کی قربانیوں کے بدلے میں اللہ تعالی نے ان سے خوش ہوکر ان کے لیے جنت کا وعدہ دے دیا کہ جس میں وہ ہمیشہ خوش رہیں گے ۔ ان کے ایمان اور ہجرت کی جزا کے بعد ان کے جہاد کے سلسلے میں واضح طور پر فرما دیا ۔

" اذن للذين يقاتلون بانهم ظلموا وان الله على نصرهم لقدير " ۔[3]

پھر فرمایا :

" يا ايها الذين امنوا اذ لقيتم الذين كفروا زحفا فلا تولوهم الادبار " ۔[4]

گویا مظلوم مہاجرین کو کفار کے مقابلہ میں لڑنے کی اجازت دینے کے بعد انہیں یہ نصیحت کی کہ

۱۔ شاہ عبدالعزیز ، وسیلۃ النجات ۔ ص، ۲۰۳

۲۔ ایضاً ص، ۲۰۳

۳۔ ایضاً ۔ ص، ۲۰٦

۴۔ ایضاً ۔ ص، ۲۰۷

ایمان لانے کے بعد تم کافروں کے مقابلہ میں پیٹھ مت پھیرنا کیونکہ کامیابی وکامرانی اللہ کے ہاتھ میں ہے لہذا فرمایا :

" لقد نصرکم اللہ ببدر وانتم اذلۃ " ۔[۱]

گویا دشمن کے مقابلہ میں میدان بدر میں انہیں فتح عطا کی ، پھر ارشاد الہی ہے ۔

" ثم انزل اللہ سکینۃ علی رسولہ وعلی المؤمنین " ۔[۲]

گویا اپنے رسول اور مومنین پر سکون نازل فرمانے کے بعد ان لوگوں پر عذاب نازل فرمایا ، جنہوں نے کفر کیا ۔

مندرجہ بالا آیات کے علاوہ متعدد قرآنی آیات کا حوالہ دے کر تمام شیعہ وسنی اختلافات کو واضح کرتے ہوئے سنی مذہب کو مذہب حق یعنی " فرقہ ناجیہ " قرار دیا ہے ۔

شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فارسی رسالہ " فضائل صحابہ واہل بیت " کے مجموعہ رسائل میں شائع ہو چکا ہے ۔ اس کے اردو ترجمہ کے فرائض مولوی حکیم عبدالغفور نے سرانجام دیئے ہیں ۔ شاہ صاحب کی تصنیفات میں مندرجہ بالا کتب مشہور اور موجود ہیں ۔ آپ کی تصنیفات میں عربی زبان میں تحریر کردہ ایک مختصر رسالہ " میزان المنطق " بھی ہے ، جو ابھی تک زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکا ۔ علاوہ ازیں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے علم بلاغت کے موضوع پر گیارہ ابواب پر مبنی ایک مختصر رسالہ " میزان البلاغت " تحریر فرمایا تھا جو کافی عرصہ تک مجموعہ کتب میں مخفی رہنے کے باعث منظر عام پر نہ آ سکا ۔ بالآخر شیخ محمد بشیر الدین بن قاضی حافظ نے اس رسالے کو ذخیرۂ کتب سے نکال کر تعلیقات وحواشی سے مزین کرنا چاہا لیکن دیگر علمی وادبی مصروفیات کے باعث یہ کام فاضل دہر اور عالم زمانہ مولانا عزیز الرحمن کے سپرد کیا ، جنہوں نے چند ایام میں اسے علماء وفضلاء اور ہر خاص وعام کے استفادہ کے لیے مفید حواشی وتعلیقات سے زینت بخشی ۔ بعد ازاں قاضی محمد بشیر الدین نے اس کی تصحیح کر کے اسے

---

۱ ۔ شاہ عبدالعزیز ، وسیلۃ النجات ۔ ص ، ۲۰۷

۲ ۔ ایضاً ۔ ص ، ۲۰۸

" المجالۃ النافعۃ والعجالۃ الراضۃ المسمی بہ میزان البلاغت " کے عنوان سے باہتمام خاص مطبع مجتبائی میرٹھ سے ۱۳۱۲ھ میں شائع کیا ۔

آپ کی دیگر تصنیفات میں میزان المقاصد ، نظام المقاصد ، میزان الکلام ، اعجاز البلاغت ، فیما یجب حفظ لہ للناظر ، رسالہ فی الانساب ، رسالہ تحقیق الرؤیا ، رسالہ فیض عام رسالہ اصول مذہب حنفی ، حاشیہ علی القول الجمیل ، حاشیہ علی میر زاہد قطبیہ ، حاشیہ علی الصدرا ، حاشیہ علی میر زاہد مع جلال ، حاشیہ میر زاہد شرح مواقف ، حاشیہ علی المقدمۃ السنیۃ فی انتصار الفرقۃ السنیۃ ، شرح ارجوزۃ الاصمعی ، التخمیس علی قصائد وقطعات ابیہ اور شرح علی قصیدۃ البردۃ بھی شامل ہیں ۔ یہ تمام تصنیفات آپ کے علمی وادبی دقائق کا زبردست مجموعہ ہیں ۔ علاوہ ازیں قرائن و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا کچھ ذخیرہ تالیف غفلت احباب وارباب اور انقلاب زمانہ کی دستبرد ہوگیا ہے ۔

عزیز الاقتباس فی فضائل اخیار الناس :

شمس الہند حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اپنے عربی رسالے " عزیز الاقتباس فی فضائل اخیار الناس " میں خلفائے اربعہ (حضرت ابوبکر صدیق ، حضرت عمر بن الخطاب ، حضرت عثمان غنی ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ) اور اہل بیت کے فضائل پر مبنی احادیث رسول کا ذکر نہایت محققانہ انداز میں کیا ہے ۔ شاہ صاحب کے اس چھوٹے سے رسالے پر سرسری اور اجمالی نظر ڈالنے سے اس گوہر نایاب کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا بہت آسان ہے ۔ شاہ صاحب نے خلفائے اربعہ کے فضائل میں جن مشہور احادیث شریف کو بیان کیا ہے ، ان میں سے چند ایک کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے ۔ مثلاً حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ رسول پاک کا ارشاد گرامی ہے ۔

" ابوبکر وعمر سیدا کہول اہل الجنۃ من الاولین والاخرین الا النبیین والمرسلین ، رواہ احمد والترمذی " ۔[1]

۱۔ شاہ عبدالعزیز ، عزیز الاقتباس فی فضائل اخیار الناس ۔ ص ، ۱۲۶

اس حدیث سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تمام امت سے افضل مقام رکھتے ہیں پھر حضرت عثمان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ

"عثمان ابن عفان ولیّی فی الدنیا والاخرۃ رواہ یعلی" ۔[1]

گویا رسول پاک نے حضرت عثمان کو دنیا اور آخرت میں دوستی کا عظیم الشان درجہ عطا فرمایا ہے۔ اس کے بعد حضرت علی کے بارے میں ارشاد گرامی ہے کہ :

"یا علی انت اخی فی الدنیا والاخرۃ" ۔[2]

گویا حضرت علی کو دنیا اور آخرت میں بھائی کے جلیل القدر رشتے سے نوازا ہے ۔ ایک اور جگہ شاہ صاحب حضرت علی کے بارے میں حدیث رسول بیان فرماتے ہیں کہ :

"یا علی انت منّی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الّا انہ لا نبیّ بعدی

رواہ الترمذی" ۔[3]

اس حدیث شریف میں بھی رسول پاک نے حضرت ھارون اور حضرت موسیٰ کے رشتہ اخوت کی مثال بیان کرتے ہوئے آپ کو درجہ اخوت دیا ہے اور جو قربت منزلت، کمال اتحاد ، بے تکلفی اور اختلاط حضرت ھارون کو موسیٰ کے ساتھ تھا ، بعینہ اس کا ذکر اپنے اور حضرت علی کے درمیان کیا ہے ۔ لیکن بعد ازاں یہ وضاحت فرما دی کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا ۔ ایک دوسرے مقام پر حضرت عثمان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ آنحضرت کا ارشاد گرامی ہے :

"لیدخلن بشفاعۃ عثمان سبعون الفا قد استوجبوا النّار الجنّۃ

بغیر حساب رواہ ابن عساکر" ۔[4]

اس حدیث شریف سے بھی رسول پاک کے نزدیک حضرت عثمان غنی کے بلند مقام پر فائز ہونے کی وضاحت ہوتی ہے کہ آپ کے بلند مرتبہ اور اعلیٰ مقام کے باعث ستر ھزار آگ کے

---

۱ ۔ شاہ عبد العزیز ، عزیز الاقتباس فی فضائل اخبار الناس ۔ ص، ۱۲۷

۲ ۔ ایضاً ۔ ص، ۱۲۷

۳ ۔ ایضاً ۔ ص، ۱۲۷

۴ ۔ ایضاً ۔ ص، ۱۵۰

مستوجب لوگ بغیر حساب کتاب کے جنت میں داخل کیے جائیں گے ۔

ایک اور مقام پر چاروں خلفائے کرام کے بارے میں مشترکہ طور پر ارشاد فرمایا :

"ارأف امتی بامتی ابوبکر و اشدّهم فی دین اللہ عمر
واصدقهم حیاءً عثمان واقضاهم علی رواہ ابو یعلی" ۔[1]

یہ سب بسبب اس کے فرمایا کہ حضرت عمر ، رسول پاک کی صورت جلالیہ ، حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان آپ کی صورت جمالیہ تھے اور حضرت علی ، حضرت عمر کے ہم رنگ تھے نیز حضرت علی کو آپ نے درجہ اخوت بھی دیا تھا ۔

شاہ صاحب خلفائے اربعہ کے فضائل میں احادیث شریفہ بیان کرنے کے بعد اہل بیت کے فضائل کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ رسول پاک کا ارشاد گرامی ہے ۔

"ان الحسن والحسین هما ریحانتا ی من الدنیا رواہ الترمذی" ۔[2]

گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے نواسوں حضرت حسن اور حضرت حسین جوانان بہشت کے سرداروں کو دنیا میں باغ کے دو پھولوں کی شکل ظاہر کرتے ہیں ۔ اس کے بعد حضرت فاطمہ کے متعلق رقمطراز ہیں کہ آپ نے فرمایا :

"احبّ اهلی الیّ فاطمة : رواہ الترمذی" ۔[3]

حضرت فاطمہ کا ذکر کرنے کے بعد امت محمدیہ کے بارے میں فرمایا کہ رسول پاک کا ارشاد گرامی ہے ۔

"اثبتکم علی الصراط اشدکم حبًا لاهل بیتی واصحابی :
رواہ عدی والفردوس" ۔[4]

گویا اہل بیت سے محبت رکھنے والے پل صراط پر زیادہ ثابت قدم ہوں گے ۔

۱۔ شاہ عبدالعزیز ، عزیز الاقتباس فی فضائل اخبار الناس ، ص ، ۱۵۲

۲۔ ایضاً ۔ ص ، ۱۶۰

۳۔ ایضاً ۔ ص ، ۱۶۳

۴۔ ایضاً ۔ ص ، ۱۶۹

مندرجہ بالا احادیث شریف پر مبنی رسالے کا فارسی ترجمہ شاہ عبدالعزیز کے تلمیذ خاص مرزا حسن علی لکھنوی نے کیا ہے۔ پھر زمانے کی ضروریات کے مطابق ان احادیث کو آسان بنانے کے لیے اردو ترجمہ اور حواشی کے فرائض مولوی نظام الدین کیرانوی نے سرانجام دیے ہیں اور اس پر نظر ثانی فرمانے والے حکیم عبدالغفور مرحوم ہیں۔ ۱۹۰۲ء میں پہلی مرتبہ اس رسالے کی اشاعت ظہیر الدین سید احمد ولی اللہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اب یہ رسالہ "مجموعہ رسائل فضائل صحابہ و اہل بیت" میں شامل کرکے طبع کر دیا گیا ہے۔

سرّ الشہادتین :
==========

جلیل القدر اور مقتدر عالم مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اپنے اس مستند و مختصر عربی رسالے میں حضرت امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کے فضائل اور شہادت کے دردانگیز اور پرملال واقعات پر نہایت موثر انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اگرچہ واقعہ کربلا اور شہادت امام حسین پر بھرپور مبالغہ اور رنگ آمیزی سے بے شمار کتب و رسائل لکھے گئے ہیں لیکن شاہ عبدالعزیز نے اپنی اس قابل قدر تصنیف "سرّ الشہادتین" میں مستند احادیث اور مسلم الثبوت اصلی واقعات پر مبنی حالات کو نہایت لطیف پیرایہ میں بیان کرتے ہوئے حقائق کی وضاحت کر دی ہے۔ شاہ صاحب نے یہ مقبول و معروف رسالہ اپنے معتقدات کے مطابق اور بلا تفریق و امتیاز تحریر فرمایا ہے۔

اس رسالے کا آغاز شاہ صاحب نے محبوب خدا آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی فطرت میں یکجا خوبیوں سے کیا ہے کہ آپ کو حضرت آدم اور داؤد علیہما السلام کی طرح خلافت، حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح ملک، حضرت یوسف علیہ السلام کی مثل حسن اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح خلعت عطا ہوئی اور اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح آپ سے ہم کلام ہوئے۔ علاوہ ازیں آپ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح عابد اور جناب نوح علیہ السلام کی طرح شاکر تھے گویا آپ کے وسیع علم، مکمل عرفان، قوت فیصلہ و فتویٰ اجتہاد و احتساب اور کمالات قرأت کے علاوہ بے شمار خوبیوں کو بیان کیا ہے اور میدان جہاد میں آپ کو درجہ شہادت نہ ملنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس طرح

عوام کی نظر میں اسلام کی قوت شکستہ اور دین ناکارہ ہو جاتا ۔

پھر شہادت کی دو قسمیں بیان کی ہیں ۔ ایک شہادت خفی اور دوسری شہادت جلی ۔ پہلی قسم کی شہادت حضرت امام حسن پر واقع ہوئی جب کہ حضرت امام حسین علیہ السلام اعلانیہ شہید کیے گئے ۔

شہادت کی اقسام کا ذکر کرنے کے بعد امام حسن اور حسین کو فرزندان رسول قرار دے کر اس کی دو دلیلیں بیان کی ہیں ۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ نواسہ بمنزلہ فرزند کے ہوتا ہے اور دوسری دلیل یہ کہ آنحضرت نے ان کو بیٹا بنایا تھا ، جس کی تائید میں شاہ صاحب یہ روایت پیش کرتے ہیں :

" ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال هما ابنای و روی احمد فی مسندہ عن ابی اسحق السبیعی عن هانی ابن هانی عن امیر المومنین علی کرم اللہ وجهہ قال لما ولد الحسن رضی اللہ تعالی عنہ جاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال ارونی ابنی ما سمیتموہ ۔ قلت سمیتہ حربا قال بل هو حسن فلما ولد الحسین قال ارونی ابنی ما سمیتموہ قلت حربا قال بل هو حسین فلما ولد الثالث قال ارونی ابنی ما سمیتموہ قلت حربا قال بل هو محسن ثم قال انی سمیتهم باسماء ولد هارون شبر و شبیر و مشبر "[1]

ان دو دلیلوں کا ذکر کرنے کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ امام حسن اور حسین علیہما السلام کمالات رسول کے آئینہ دار تھے ۔ اس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ یہ دونوں آنحضرت کی طرح سیادت مطلقہ کے مالک تھے ، جس کی تائید میں یہ حدیث پیش کی جاتی ہے ۔

" فقد اخرج النسائی والرویانی والضیاء عن حذیفہ وابو یعلی ------ وابن عساکر عن عائشۃ وابن عمرو ابن عباس وانس رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الحسن والحسین سید اشباب اہل الجنۃ "[2]

---

۱ ۔ شاہ عبدالعزیز ، سرّ الشہادتین ۔ ص ، ۷-۸

۲ ۔ ایضاً ۔ ص ، ۹

دوسری دلیل یہ بیان فرماتے ہیں کہ یہ دونوں شہزادے اپنے جد سے صورت میں مشابہ تھے گویا اپنے نانا کی مکمل تصویر تھے ۔ اس دلیل کی تائید میں شاہ صاحب حضرت انس کی یہ روایت پیش کرتے ہیں :

"فقد اخرج البخاری عن انس قال لم یکن احد اشبه بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم من الحسن بن علی علیہما السلام وقال فی الحسین ایضاً کان اشبههم برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" ۔[1]

ان دلائل کا ذکر کرنے اور امام حسن کی شہادت خفی کا واقعہ بیان کرنے کے بعد امام حسین کی شہادت جلی کا ذکر کیا ہے کہ آپ کی شہادت تاریخ اسلام کا مشہور ترین واقعہ ہے اور اس واقعہ کو بسط و تفصیل سے احادیث کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت امام حسین کی شہادت سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جبرائیل اور دوسرے ملائکہ نے خداوند تعالی کی طرف سے بذریعہ وحی اس ہولناک واقعہ کی اطلاع دی جو مشہور اور متواتر ہے ۔ روایت ہے ۔

"اخرجه ابن سعد والطبرانی عن عائشة رضی اللہ عنها ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اخبرنی جبرائیل ان ابنی الحسین یقتل بعدی بارض الطف و جاءنی بهذه التربة" ۔[2]

شہادت امام حسین کے بارے میں اور بھی بہت سی احادیث بیان کی ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اپنے عزیز ترین نواسے حضرت امام حسین کی شہادت کے بارے میں آپ نے جو ارشاد فرمایا تھا ، بعینہ پورا ہوا اور اس کی تائید میں ابن عباس یہ روایت پیش کرتے ہیں ۔

"اخرج احمد والبیهقی عن ابن عباس رضی اللہ تعالی عنهما قال رایت النبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم فی النوم ذات یوم نصف النهار اشعث اغبر بیده قارورة فیها دم ۔ فقلت ما هذه قال دم الحسین علیہ السلام واصحابه لم ازل [illegible] التقطه منذ الیوم فاحصی ذلک الوقت قد قتل ذلک الیوم" ۔[3]

---

۱ ۔ شاہ عبدالعزیز ، سرّ الشہادتین ۔ ص، ۲۰

۲ ۔ ایضاً ۔ ص، ۲۵، ۲۶

۳ ۔ ایضاً ۔ ص، ۳۲، ۳۳

شہادت کے بارے میں احادیث کا ذکر کرنے کے بعد وہ تمام عبرت انگیز واقعات اجمالاً پیش کیے ہیں جن کا ظہور شہادت کے بعد ہوا جیسا کہ شاہ صاحب نے فرمایا :

"اخرج البیہقی وابونعیم عن بصرۃ الازدیۃ قالت لما قتل الحسین مطرت السماء دماً فاصبحنا و حبابنا وجرارنا وکل شئ لنا ملآن دما "۔[1]

اس کے بعد شاہ صاحب نے ایک اور قول تحریر فرمایا ہے :

"قد اخرج البیہقی عن جمیل بن مرۃ اصابوا ابلاً فی عسکر الحسین یوم قتل فنحروھا و طبخوھا فصارت مثل العلقم فما استطاعوا ان یسیغوا منھا شیئاً "۔[2]

یہ تھا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا چند صفحات پر مشتمل عربی رسالہ " سر الشہادتین " یہ رسالہ سب سے پہلے ہندوستان سے مطبع مجتبائی سے ترجمے کے ساتھ ہی طبع ہوا تھا ۔ اس کے بعد ایک اور نسخہ ۱۳۰۹ھ / ۱۸۹۱ء میں نولکشور پریس سے اور پھر ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء میں مولوی خرم علی بلہوری کے ترجمہ کے ساتھ مطبع مجتبائی سے شائع ہوا ۔ ۱۲۵۶ھ / ۱۸۷۲ء میں ایک اور نسخہ فارسی ترجمہ وشرح کے ساتھ " تحریر الشہادتین " کے نام سے شائع ہوا ۔ اس کے فارسی ترجمہ وشرح کے فرائض مولانا سلامت اللہ صاحب نے سرانجام دیے ۔ پاکستان میں مولانا مفتی سید طیب آغا صاحب قبلہ نے بھی یہ رسالہ مع اردو ترجمہ کے شائع کیا ۔ بعد ازاں سید کاظم رضا صاحب نے پنجاب نیشنل پریس لاہور سے شائع کیا گویا اب تک اس مختصر رسالے کے بے شمار ترجمے شائع ہو چکے ہیں ۔

شاہ عبدالعزیز کی عربی خدمات :
==================

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے عربی زبان میں یگانۂ روزگار اور فرید عصر ہونے کے باعث عربی عبارت بہت عمدہ اور خوبصورت انداز میں تحریر فرمائی ہے ۔ شاہ صاحب نے انتہائی ذہانت و ذکاوت اور فہم وفراست کی وجہ سے پانچ سال میں قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد گیارہ برس کی عمر میں اپنے

۱۔ شاہ عبدالعزیز ، سر الشہادتین ۔ ص، ۳۲

۲۔ ایضاً ۔ ص، ۳۲-۳۳

قابل قدر اور متبحر اساتذہ سے عربی زبان کی ابتدائی کتب پر مکمل عبور حاصل کر لیا تھا ۔ جوامع الکلم پر دلچسپی کے باعث اکثر حدیث کی کتب کا بغور مطالعہ فرماتے ۔ علمی وسعت اور معتقدانہ فطرت کے علاوہ مشہور عرب شعراء کے کلام کے مطالعہ میں دلچسپی رکھنے کی وجہ سے انشاء عربی پر قادر تھے اور نہایت فصیح و بلیغ ، پر معنی اور دلچسپ عربی نظم و نثر تحریر فرماتے تھے ۔ یہی نظم و نثر علم و ادب کی جان اور ادیبوں کی روح ہے ۔ آپ نے شیخ احمد کے مناقب حیدریہ پر تقریظ اور شاہجہان آباد کی تعریف میں قصائد بھی لکھے ہیں ۔ علاوہ ازیں آپ کو اردو ، عربی اور فارسی کے ستر ہزار اشعار یاد تھے اور کبھی کبھی خود بھی شعر کہتے تھے ۔ انہی اشعار پر مبنی آپ کا دیوان شاہجہان آباد میں موجود ہے ۔ شاہ صاحب عربی اشعار کے بارے میں فرماتے ہیں ۔

" میں عربی شعر پہلے کہتا تھا ۔ بیس پچیس سال سے ترک کر دیا ہے ۔

عربی تصانیف تو ہمارے خاندان میں ہیں "۔[1]

شاہ صاحب کے اس قول سے آپ کے علمی تبحر ، جودت طبع ، کمال ادب ، فضل و کمال اور ذہنی استعداد کا پتہ چلتا ہے ۔ شاہ صاحب کی عربی تصانیف کے علاوہ آپ کے منظوم مکتوبات کا وہ ذخیرہ ، جو آپ نے اپنے چچا شاہ اہل اللہ کے نام تحریر کیے تھے ، ان سے آپ کے عربی زبان میں فطری شوق اور خداداد قابلیت کے عروج کا پتہ چلتا ہے ۔ اپنے چچا شاہ اہل اللہ کے نام جو خطوط تحریر فرماتے ہیں ، ان میں اپنے زمانے کے سیاسی حالات پر اپنے تاثرات و احساسات کا اظہار فرماتے ہوئے مرہٹوں اور سکھوں کے حملوں کا ذکر نہایت حسن خوبی سے کرتے ہیں ۔

شاہ صاحب نے اپنے چچا شاہ اہل اللہ کی طرف مندرجہ ذیل خط کے ایک حصے میں ظالم و ستمگار سکھ اور مرہٹہ اقوام کی غارت گری ، تباہی و بربادی اور چیرہ دستیوں کو واضح کیا ہے ۔ فرماتے ہیں :

جزی اللہ عنا قوم سکھ و مرہٹ　　　　عقوبۃ شرّا جلا غیر آجل

۱۔ شاہ عبدالعزیز ، ملفوظات ۔ ص ، ۲۳

فقد قتلوا جمعا کثیرا من الوری   وقد اوجروا فی اهل شاه وجاهل

لهم کل عام نهبة فی بلادنا   یخوضون فیها بالضحی والا صائل

فهل بعد هذا من معاذ لعائذ   وهل من مغیث یتقی الله عادل

آپ کے مندرجہ بالا خط کے چند اشعار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ صاحب اپنے ملک کے مذہبی حالات کے علاوہ سیاسی حالات سے بھی باخبر تھے ۔ اسی وجہ سے آپ مسلمانان ہند کی تباہی و بربادی پر افسوس کا اظہار فرماتے ہیں ۔ شاہ صاحب نے شاہ اهل اللہ کے خط کے جواب میں نظم ونثر سے آراستہ ایک خط تحریر فرمایا ہے ، جس میں اپنے پرآشوب دور کے سیاسی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے دشمنوں (سکھ اور مرہٹہ) کے تباہ وبرباد اور فنا ہونے کا ذکر کیا ہے ، مثلاً* فرماتے ہیں :

افناهم الله عن هذه الدیار فهم   شر الاعادی وهم من جنسة غول

فوضت امری وامر الناس جمعهم   الی الله وان الحفظ مامون

مندرجہ بالا اشعار میں شاہ صاحب بڑے اپنے دیار میں دشمنوں کے گروہوں کے شر سے تنگ آچکے ہیں اور خداوند تعالی سے ان کے فنا ہونے کی دعا کرتے ہیں ۔ اسی نظم ونثر پر مبنی خط کے آخر میں فرماتے ہیں :

" وآخر دعونا ان الحمدلله رب العالمین ثم طلب العافیة والمعافاة فی هذه الایام التی هی ایام الفتن ومواسم المحن عافانا الله تعالی وایاکم من سائر البلاء ورزقنا الله وایاکم مایتمنی من الخصب والرخاء امین " ۔

شاہ صاحب ان ہی حالات کے بارے میں ایک اور خط تحریر فرماتے ہیں ، جس میں سکھ قوم کے ہاتھوں ملک کی تباہی وبربادی کا ذکر کرتے ہیں مثلاً :

ثم ان البلاد فاسدة   عن ایادی المشئوم والظلام

فهر خان علیک ماقدمت   قوم سکھ کایت التوشام

ان اشعار میں بھی سکھوں کے ہاتھوں ہندوستان اور مسلمانان ہند کی تباہی وبربادی کی داستان

بیان کی ہے - علاوہ ازیں شاہ عبدالعزیز نے اپنے جلیل القدر عمّ محترم شاہ اہل اللہ کے نام عربی میں متعددّ خطوط تحریر فرمائے ہیں جو آپ کے بلند پایہ فضل و کمال ، علمی تبحر اور سیاسی شعور کا واضح ثبوت ہیں - شاہ صاحب نے ہندوستان میں صرف علمی و دینی خدمات ہی انجام نہ دیں بلکہ مسلمانوں کے روشن مستقبل کے لیے اپنی دور رس نگاہوں سے ملکی سیاست کا بغور مشاہدہ کرتے رہے اور انہی احساسات و جذبات کا اظہار اپنے چچا اہل اللہ کی طرف عربی منظوم و منثور خطوط کی صورت میں کرتے رہے - شاہ صاحب کے صرف یہی عربی خطوط نہیں بلکہ آپ نے نظم و نثر پر مبنی ایک خط مولوی محمد عثمان کشمیری کی طرف بھی تحریر فرمایا ہے ، جس میں حدیث و تفسیر کی کتابوں کو موضوع بحث بنایا ہے -

شاہ صاحب نے دہلی کے وصف میں بھی قصائد تحریر فرمائے ہیں ، جن میں دہلی کی علمی عظمت و شان و شوکت کا اظہار نہایت فخر سے کرتے ہیں - فرماتے ہیں :

"آن البلاد اتادهی سهدة   وانها درة ولكل كالصدف

سكانها جبال الارض قاطبة   خلقا وخلقا" بلا عجب ولا صلف

بها مدارس لوطاف البصير بها   لم تفتح عنه الا على المصحف

كم مسجد زخرفت فيها مارشة   لو قابلت شموس الضحى تنكسف

شاہ صاحب نے مندرجہ بالا اشعار میں دہلی کو دین اسلام کا سرچشمہ و منبع اور عظیم مسلمانوں کا عظیم الشان گھر قرار دیا ہے -

شاہ صاحب نے شیخ احمد بن محمد انصاری الیمنی الشروانی کی کتاب "مناقب حیدریہ" پر عربی زبان میں تقریظ بھی تحریر فرمائی ہے ، جس کے کچھ اشعار مندرجہ ذیل ہیں -

وفی نظمه لطف وحسن سلامة   يذلّ لديه كل نظم ومسجد

فدام على مر الدهور علاؤه   يزيد على الاكياس طرا ومزيد

ان اشعار میں شاہ صاحب شیخ احمد صاحب کی کتاب کی تعریف کسقدر خوبصورت الفاظ میں کرتے ہیں

کہ یہ کتاب زمانے گزرنے اور طفوف ہونے کے باوجود بھی لوگوں کے علم میں اضافہ کرتی ہے ۔ اس لیے کتاب کی معیاری نظم کی عظمت و بلندی کے سامنے تمام دوسری نظمیں انکساری کے ساتھ سجدہ ریز ہوتی ہیں ۔

شاہ صاحب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں اپنے عربی قصائد یادگار چھوڑے ہیں ، جن میں قصیدہ میمیہ بہت مشہور ہے ۔ جس کے چند شعر ملاحظہ ہوں :

فمن لی بعد ما وهنت عظامی — اذا اشتد البلاء سواک حامی

وان اک ظالماً عظمت ذنوبی — محبتک سیدی ماحی الاثام

فقد اعطیت مالم یعط خلق — علیک صلاۃ ربک بالسلام

مندرجہ بالا قصائد ، منظوم ومنثور عربی مکتوبات کے علاوہ آپ کی عربی تصانیف میں عزیز الاقتباس فی فضائل اخیار الناس ، سر الشہادتین اور میزان البلاغت خاص طور پر مشہور ہیں ۔ آپ کی مولفات عربیہ نہ صرف ہند و پاک بلکہ بلاد عرب میں بھی معروف ومقبول ہیں ۔ ان کے علاوہ بھی آپ کی بے شمار عربی خدمات ہیں ، جن میں سے بیشتر تو زمانہ کی دست برد سے محفوظ نہیں رہیں ۔

شاہ صاحب کی عربی زبان میں خاص قسم کی انشا و پختگی ، فصاحت و بلاغت اور رونق موجود ہے ۔ آپ کی عربی نظم ونثر میں ابداع و اصلیت پائی جاتی ہے ۔ آپ نے اپنی عبارتوں میں زیادہ تر جوامع الکلم النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز گفتگو کی پیروی بھی کی ۔ آپ نے اس پرآشوب اور پرفتن دور میں اپنے عربی مکتوبات و تصنیفات اور قصائد و تقاریر سے علم وفضل کے دریا بہا دیے ۔ شاہ صاحب اپنی تقاریر سے مسلمانوں کو اسلام کے دفاع کی ترغیب دلاتے رہے ، جب کہ ہند کی ملت اسلامیہ روبہ زوال تھی ۔

اللہ تعالی نے شاہ صاحب کو عربی زبان میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ تحریر و تقریر کی بھی صلاحیت بخشی تھی ۔ اسی لیے عربی زبان میں تحریر کے ساتھ تقریر و خطابت کا ملکہ بھی پیدا ہوگیا تھا ۔ شاہ صاحب دہلی کے کوچہ چیلان میں ہفتہ میں دو دفعہ تقریر کرتے تھے ۔

آپ کے بعض منظوم ومنثور عربی خطبات بھی موجود ہیں ، جن میں ایک منظوم خطبہ معراج کے متعلق اور دوسرا وضو اور نماز کی فضیلت کے ثواب وبیان میں ارشاد فرمایا ہے ۔ مثلاً فرمایا:

•کما قال اللہ تعالی بقولہ یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ ولا تموتن الا وانتم مسلمون ٥ واعلموا انّ اللہ تعالی فرض علیکم خمس صلوت فی اللیل والنھار وامرکم بھا فظتھا بالیقین ٥ وقال اقیموا الصلوۃ ولا تکونوا من المشرکین وورد فی الخبر عن سید البشر ٥ الصلوۃ عماد الدین فمن اقامھا ۔ فقد اقام الدین ومن ترکھا فقد ھدم الدین ۔

شاہ صاحب اپنی تقاریر وخطبات میں ہمیشہ لوگوں کو دین کی طرف متوجہ ہونے کی تاکید وتلقین کرتے اور قرآن پاک واحادیث شریف سے مثالیں دے کر اپنے قول کی وضاحت کرتے تاکہ مسلمانوں کے ذہنوں میں اسلام کے عقائد راسخ ہو جائیں اور دنیا وآخرت میں کامیاب وکامران ہوں۔

باب — پنجم

شاہ عبدالعزیز بحیثیت محدث ، مفسّر ، فقیہہ ، خطیب ، صوفی اور متکلم

(الف) ہندوستان میں علم حدیث ، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور علم حدیث -

(ب) شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی بحیثیت مفسّر

(ج) ہندوستان میں علم فقہ ، شاہ عبدالعزیز بحیثیت فقیہہ -

(د) شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی بحیثیت خطیب ، صوفی و متکلم -

ھندوستان میں علم حدیث :

سلطان محمود غزنوی کے عجم سے ھندوستان وارد ھونے پر مذاھب اسلامی کے دو فرقے سنّی اور شیعہ بھی ھندوستان میں نمودار ھوئے ۔ بعدازاں ھندوستان سے مختلف ادوار میں طلب حدیث کے لیے تین مایہ ناز بزرگ ملّا طاھر رحمۃ اللّٰہ علیہ" صاحب مجمع بحار الانوار" شیخ عبدالحق محدث دھلوی اور شاہ ولی اللّٰہ عرب تشریف لے گئے اور وھاں کے جیّد علماء سے سند حدیث حاصل کی ۔ اگرچہ قاضی القضاۃ اور شیخ الاسلام عبدالحق محدث دھلوی نے ھندوستان کے لوگوں میں حدیث کا ذوق شوق پیدا کرنے کے سلسلے میں اپنی پوری قوت صرف کی لیکن آپ کے عہد میں فقہ و منطق کے عام ھونے کے باعث علم حدیث کو زیادہ فروغ حاصل نہ ھو سکا اور حدیث رسول کنج کس مپرسی میں چلی گئی ۔ شاہ جہان اور عالمگیر کی علم پروری کی وجہ سے آپ قضا اور افتا کے مناصب پر فائز رھنے کے باعث درس حدیث کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے ۔ آپ کے بعد اس امر کی تلافی کے لیے اللّٰہ تعالیٰ نے اس عمارت کے ایک مضبوط اور پائدار ستون شیخ عبدالرحیم کو پیدا کیا ، جنھوں نے علم حدیث کی بنیادوں کو مضبوط دیواروں سے استوار کیا ۔

شیخ صاحب نے پرانی دھلی میں "مدرسہ رحیمیہ" کے نام سے ایک اسلامی درسگاہ قائم کی ، جہاں تشنگان علم حدیث دور دراز کے علاقوں سے جوق در جوق اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے آنے لگے ۔ اب لوگوں میں علم حدیث کے حاصل کرنے کی تحریک پیدا ھوئی لیکن یہ تحریک عظیم الشان دریا میں تموّج پیدا نہ کر سکی کیونکہ بارھویں صدی ھجری کے اختتام پر تمام دنیا میں عموماً اور ھندوستان میں خصوصاً دین اسلام ضعف اور انتشار کا شکار ھو چکا تھا ۔ قرآن اور حدیث کی تعلیم کا خاتمہ ھونے کے باعث تقلید شخصی فرض سمجھی جاتی تھی ۔ بدعتوں کا روز بروز غلبہ ھونے کی وجہ سے مسلمانوں میں باھمی میل جول پیار و محبت ، اخوت اسلامی و انسانی ھمدردی اور قدر و منزلت کے جذبات دلوں سے ختم ھو چکے تھے ۔ گمراھی و ضلالت کے باعث اسلام کا نام و نشان باقی نہ رہا تھا ۔ یہی وجہ تھی کہ شیخ صاحب اپنی کوششوں میں مکمل طور پر کامیاب نہ ھو سکے ۔

آپ کے بعد آپ کے قابل فخر بیٹے ، مسلم الثبوت اور فخر روزگار محدث شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کی روحانی واخلاقی اصلاح کے لیے اس کار خیر کو سرانجام دینے کا بیڑا اٹھایا اور تقلیدی بندھنوں سے آزاد ہوکر مجتہدانہ شان وشوکت کے ساتھ مفید تصانیف مثلاً موطا امام مالک کی دو شرحیں المسوّی (عربی) اور المصفّیٰ (فارسی) میں متعدد مضامین تحریر فرمانے کے علاوہ ان دونوں کا ضمیمہ الانصاف سے ، نکلو العقد الجید فی احکام الاجتہاد اور تقسہ اپنی لاجواب اور غیر مسبوق کتاب "حجۃ اللہ البالغۃ" سے کیا ۔ علاوہ ازیں "الدرّ الثمین فی مبشرات النبی کریم ؐ النوادر من الحدیث اور چہل حدیث بھی تصنیف کیں ۔

شاہ صاحب نے علم حدیث کی ترویج واشاعت میں پیش پیش رہ کر طالبان علم کو ندائے عام دی اور خصوصاً بلاد اسلامیہ کو اسلامی علوم کے باریک و دقیق مسائل کے سرچشموں سے سیراب کیا کہ جس کی خنکی ، شادابی اور تروتازگی سے پورا ہندوستان سرسبز وشاداب ہوگیا۔

شاہ صاحب ایک قابل ولائق ، فرید عصر ، یگانۂ روزگار محدث اور بصیرت افروز حکیم تھے ۔ آپ نے حدیث وقرآن کے حقائق کو سمجھنے اور سمجھانے میں متقدمین کی یاد تازہ کر دی ۔ شاہ صاحب شرح حدیث ، معانی حدیث ، توضیح مطالب اور فہم وفراست میں اپنی نظیر آپ ہیں ۔

شاہ عبدالعزیز اور علم حدیث :

شاہ ولی اللہ کے نامور ومشہور اور لائق وفائق فرزند اکبر خاتم المحدثین حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز نے تیرہ سال کی عمر میں تمام علوم کی تحصیل سے فراغت کے بعد سماعت حدیث کے لیے اپنے والد بزرگوار کی درسگاہ رحیمیہ" میں شمولیت کی ۔ آپ کے والد ماجد نے آپ کی ذہانت و حافظہ اور فہم وفراست کو جانچنے کے بعد فرط مسرّت سے آپ کو علوم حدیث کا درس دینا شروع کیا ۔ آپ نے اپنی فطری لیاقت اور خدا داد قابلیت سے علم حدیث کے دشوار گزار مراحل تھوڑے ہی عرصے میں طے کرلیے حتیٰ" کہ تمام طلباء آپ کی اس ذکاوت و ذہانت پر متحیر ہو گئے ۔ اس دوران میں اگر آپ کے سامنے کوئی مشکل اور دقیق مسئلہ پیش کیا جاتا

تو آپ فوراً اسے حل کر دیتے - والد ماجد شاہ ولی اللہ سے سند حدیث کی اجازت حاصل کرنے کے بعد رسمی طور پر ان کے بہترین دوستوں اور جید علماء شاہ محمد عاشق پھلتی اور خواجہ محمد امین ولی اللہی سے بھی اجازت حاصل کی - والد بزرگوار (شاہ ولی اللہ) کی وفات کے بعد اس مدرسہ کا بار گران آپ کے ناتوان کندھوں پر آ پڑا ۔ چنانچہ آپ نے مسند علم و فضل پر متمکن ہوتے ہی نہایت تندہی و جانفشانی سے مروجہ علوم کے علاوہ حدیث و تفسیر کے علوم کا درس دینا شروع کیا -

والدماجد کے انتقال کے بعد آپ تقریباً بارہ سال تک علوم حدیث و تفسیر کی درس و تدریس میں مصروف رہے - علم دین کی انتہائی اشاعت سے اکثر علمی سوسائٹیوں اور ادبی حلقوں میں اصول حدیث پر پرزور مباحثے ہونے لگے - علوم فلسفہ و منطق کے ساتھ ساتھ علوم حدیث و تفسیر بھی روز افزوں ترقی پر تھے - شاہ عبدالعزیز کی حقائق انگیز شخصیت اپنے دور کے محدثین و مشائخ کا مرجع و ماخذ ہے ، جن کے تلامذہ کا سلسلہ آفاق گیر ہے - آپ نے اپنے پرفتن دور میں حدیث و قرآن کی تشہیر کے لیے جو کارہائے نمایاں سر انجام دیے ، ہندوستان اس کے احسان کے بوجھ سے کبھی بھی سر نہیں اٹھا سکتا - صاحب اتحاف النبلاء آپ کے خاندانی علوم و معارف کے رواں دواں و صاف و شفاف چشموں اور تازگی بخش نہروں کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ :

" شاہ عبدالعزیز بن الشیخ الاجل ولی اللہ المحدث الدہلوی بن عبدالرحیم العمری رضی اللہ عنہم الاساتذہ و امام الجہابذہ ، بقیۃ السلف ، حجۃ الخلف ، خاتم المفسرین والمحدثین بالدیار الہندیۃ ----- خاندان ایشان خاندان علوم حدیث و فقہ حنفی ست خدمت این علم شریف چنانکہ ازین اہل بیت بوجود آمدہ درین کشور از خاندان دیگر معلوم و معہود نیست تخم عمل بالحدیث درحقیقت پدر ایشان درین سرزمین کاشتہ اند و ایشان آن را برگ و بار بخشیدہ ورنہ در بلاد ہند جز فقہ حنفی ہیچکس علم حدیث و تمسک بدان در علم و عمل نمی شناخت "[1] -

---

۱- نواب صدیق حسن خان ، اتحاف النبلاء - ص ۲۹۶ ، ۲۹۷

ہندوستان میں اس وقت تمام محدثین کا سلسلہ شاہ عبدالعزیز کے واسطہ سے ہی امام شاہ ولی اللہ پر منتہی ہوتا ہے ۔ اگرچہ آپ درس و تدریس کے وقت فقہ و متعلقات فقہ کی طرف زیادہ دھیان دیتے تھے لیکن ان کی نسبت حدیث نبوی کی آب یاری غیر معمولی توجّہ اور انہماک سے کی اور دیگر علوم آپ کے درس میں بطور ذیل کے تھے گویا تمام علوم متداولہ میں آپ کے مقام عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ متعدّد نامور علماء آپ کی درسگاہ سے فیض یاب ہو کر نکلے جیسا کہ صاحب اتحاف النبلاء لکھتے ہیں کہ :

" شاہ عبدالعزیز در وقت خود مرجع علماء و مشائخ بودند درسگاہ ایشان در جمیع علوم متداولہ و غیر متداولہ از فنون عقلیہ و نقلیہ فوق الوصف ست در کثرت حفظ و علم تعبیر و رویا و سلیقہ وعظ و انشا و تحقیقات دقائق علوم مذاکرہ و مباحثہ باخصوص ممتاز اقران بودند و معتقد فیہ موافق و مخالف " ۔[1]

شاہ عبدالعزیز نے ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے لیے تاریخ کی گراں قدر یادگار خدمات سرانجام دیں ۔ شاہ ولی اللہ کے بعد آپ کے قابل قدر اور باعث فخر عالم و فاضل جانشین کے عہد میں تعلیم و تربیت اور نشر و اشاعت کا سلسلہ اس حد تک ترقی کر گیا کہ پورے ہندوستان کے علمی و مذہبی حلقوں کا تعلق براہ راست یا بالواسطہ شاہ عبدالعزیز کی بلند پایہ ذات گرامی سے تھا۔

شاہ عبدالعزیز کی اس عظیم الشان درسگاہ کے تربیت یافتہ تلامذہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد پورے اطراف ہند میں پھیل گئے تھے ۔ انہوں نے ہندوستان اور اس کے دیگر مشہور شہروں میں اشاعت علوم دین کے لیے درسگاہیں قائم کیں ۔ اس طرح ہند کے تمام علمی حلقوں کا تعلق اس خاص علمی مرکز کے ساتھ ہوتا تھا ، گویا کتاب و سنت کا یہ چراغ آپ کی ذات مبارک سے روشن تھا ۔ اس زمانے کے ایک عالم نے اس لیے سیاحت کی کہ اسے علم حدیث کا کوئی ایسا استاد ملے جو شاہ عبدالعزیز کا شاگرد نہ ہو مگر ہند میں اسے ایک مدرس بھی ایسا

۱۔ نواب صدیق حسن خان ، اتحاف النبلاء ۔ ص ۲۹۷

دہیں ملا۔ یہ سب کچھ شاہ عبدالعزیز جیسے قابل و فاضل اور جلیل القدر جانشین کی تعلیم وتربیت اور اشاعت وتبلیغ کے باعث تھا ۔

شاہ عبدالعزیز کے درس و تدریس کی بادشاہت سمرقند و بخارا اور مصرو شام تک پھیلی ہوئی تھی ۔ ہندوستان کے کسی علاقے یا شہر میں کوئی شخص ہی ایسا ہوگا کہ جس نے آپ کے خاندان سے باطنی استفادہ نہ کیا ہو یا جسے شاگردی کا فخر حاصل نہ رہا ہو بلکہ آپ کی مقدس ذات کے فیضان سے نہ صرف دہلی بلکہ ہند کے گوشہ گوشہ میں علوم حدیث و تفسیر کا چرچا ہو گیا تھا ۔ اس دور کے بڑے بڑے علماء آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنا باعث افتخار سمجھتے اور فضلاء آپ کی گران قدر ، مایہ ناز اور شاہکار تصنیفات پر کامل بھروسہ رکھتے تھے ۔

سرزمین ہند کے باشندوں کے علاوہ باہر کے ملکوں سے وہاں آنے والے لوگوں نے بھی آپ سے استفادہ کیا۔آپ خصوصاً غواص حدیث نبی اور تفسیر کلام الہی میں مصروف و منہمک رہتے تھے۔ شاہ صاحب تمام علوم عقلیہ اور فنون نقلیہ میں فرید عصر شمار ہوتے تھے ۔ صاحب علم و عمل لکھتے ہیں :

• آپ منقول میں کلام اللہ اور حدیث سے دلیل پیش کرتے تھے اور معقول میں جو ثبوت مناسب سمجھتے ، خواہمخواہ یونانیوں میں سے افلاطون ، ارسطو اور متکلمین سے فخر رازی وغیرہ کے اقوال کی تائید بغیر میں مبتلا نہیں ہوتے تھے اور اپنی تحقیقات کو فن معقول میں صاف صاف بیان کر دیتے تھے ، وہ کسی کی رائے کے موافق ہوں یا نہ ہوں "۔[1]

شاہ ولی اللہ کے بعد آپ کی اولاد و احفاد نے ان امور الہی کو بڑی تندہی سے سرانجام دیا جیسا کہ نواب صاحب رقمطراز ہیں ۔

• و کذاہا ولادہ الامجاد و اولاد اولادہ اولی الارشاد المشمرین لنشر ھذا العلم

۱۔ وقائع عبدالقادر خانی ، علم و عمل ۔ ج ۔۲ ، ص ۲۲۶ ۔

من ساق الجد و الاجتهاد ۔ فعاد بھم علم الحدیث غضاً طریاً بعد ما کان شیئاً فریاً وقد نفع اللہ بھم و بعلومھم کثیراً من عبادہ المومنین و نفی بسعیھم المشکور من فتن الاشراک والبدع و محدثات الامور فی دین مالیس یخاف علی احد من العالمین فھولاء الکرام قد رجحوا علم السنۃ علی غیر ھا من العلوم و جعلوا الفقہ کالتابع لہ و المحکوم و جاد تحدیثھم "۔[1]

شاہ عبدالعزیز کو علوم نقلیہ اور فنون عقلیہ پر کامل عبور ہونے کے ساتھ ساتھ متعدد علوم و فنون پر بھی بڑی دسترس حاصل تھی لیکن اس کے باوجود طبیعت کا میلان ورجحان حدیث نبوی کی طرف زیادہ تھا ۔ علم حدیث سے انتہائی شغف کی بناء پر آپ نے اپنی عمر کا آخری اور بیشتر حصہ احادیث نبوی کی تحقیق وتدوین ، اس کی اشاعت وتبلیغ کے لیے وقف کر دیا تھا اور علم حدیث کی خدمت ہی آپ کا اولین نصب العین تھا ۔ آپ کی درسگاہ میں حاضر ہونے والے طالبان حق کے لیے آپ کی تلقین و ارشاد کا اکثر حصہ اتباع اور احیائے سنت تھا ۔ کلام الہی کی تفسیر اور احادیث کی روشنی میں اس کے معنی کی توضیح وتشریح کو اپنا مقصد حیات سمجھتے اور نہایت تاکید سے لوگوں کو اس طرف متوجہ کرتے تھے ۔ بلاد ہند میں علم وعمل کی سیادت ان پر اور ان کے بھائیوں پر منتہی ہوتی ہے جیسا کہ سر سید احمد خان فرماتے ہیں :

"علم حدیث وتفسیر بعد آپ کے تمام ہندوستان سے مفقود ہوگیا ۔ علمائے ہندوستان کے خوشہ چین اسی سرگروہ علماء کے خرمن کمال کے ہیں اور جمیع کملاء اس دیار کے چاشنی گرفتہ اسی زبدہ ارباب حقیقت کے فائدہ فضل وافضال کے "۔[2]

موصوف نے علم کی تحصیل اپنے والد بزرگوار اور ان کے خلفاء سے کی ۔ ان کے حاصل کردہ علوم حدیث وفقہ وتفسیر کی سندیں ان کی تصانیف میں مذکور ہیں ۔ آپ کے ان علوم سے بہت سی خلقت نے استفادہ کیا ۔ انہی علوم کی بدولت آپ کو بڑے بڑے القاب سے نوازا گیا ۔ مولانا عبدالحئی لکھنوی

۱۔ نواب صدیق حسن خان ، الحطۃ فی ذکر صحاح ستۃ ۔ ص، ۱۶۱

۲۔ سر سید احمد خان ، آثار الصنادید ۔ ص، ۵۲

موصوف کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں :

" الشیخ الامام العالم الکبیر، العلامۃ المحدث عبدالعزیز بن ولی اللہ بن عبدالرحیم العمری الدھلوی سید علمائنا فی زمانہ وابن سیدھم لقبہ بعضھم سراج الھند وبعضھم " حجۃ اللہ " ۔[1]

دلی کے آخر الذکر اور کثیر المنافع مدرسہ رحیمیہ کے بانی شاہ عبدالرحیم کے بعد اس درسگاہ کے سرپرست آپ کے گرامی قدر بیٹے شاہ ولی اللہ اور پھر اس عظیم الشان مدرسہ کی آغوش میں پرورش پانے والی مایہ ناز ہستی شاہ عبدالعزیز نے اس کی کمزور جڑوں کو مزید مضبوط کر دیا۔ شاہ عبدالعزیز کے ساتھ ساتھ اس مدرسہ سے فیض یاب ہونے والے آپ کے تینوں بھائی، بھتیجے، نواسے اور بے شمار علماء وفضلاء کرام تھے۔ آپ کے بعد اس مدرسہ کی مسند پر متمکن ہونے والے بھی بہی گرامی قدر علماء وفضلاء تھے، جنہوں نے سراج الہند شاہ عبدالعزیز کی زیر نگرانی رہ کر علم کی انتہائی بلندیوں کو چھولیا تھا اور آپ کے بعد وہ بجا طور پر اس مقام عالی کے مستحق تھے، جن کے سرچشمہ فیض کی بدولت حدیث نبوی کے برکات تمام گوشہ ہائے ہند میں پھیلے اور آج بھی اس مدرسہ کی مٹی ہوئی یادگار دھلی میں قائم ہے۔

علامہ رشید رضا مصری ہندوستان میں حدیث نبوی کا منبع و مصدر شاہ ولی اللہ اور آپ کے خاندان کو قرار دیتے ہیں۔

شمس الہند شاہ عبدالعزیز نے سرزمین ہند میں اپنی مساعی جمیلہ کو بروئے کار لاتے ہوئے حدیث وتفسیر کی درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور ہدایت وارشاد سے مسلمانوں کی اصلاح کی اور فتنوں کا سدباب کرتے ہوئے مسلمانوں کی دینی، تعلیمی اور ثقافتی حالت کو بہتر بنا کر عظیم انقلاب بپا کر دیا ورنہ اس سے قبل سوائے معقولات کی کتابوں کے لوگ قرآن وحدیث کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتے تھے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں :

۱۔ سید عبدالحئی لکھنوی، نزھۃ الخواطر۔ جلد ۔ ۷ ، ص ۲۶۸

۳۰

"تیس سال سے دین کا کچھ چرچا ہے ورنہ صبح سے شام تک بجز معقولات کے ، کوئی حدیث و تفسیر کی کتابیں کھول کر بھی نہیں دیکھتا تھا ، نہ کوئی پڑھاتا تھا اور نہ ہی اس کے متعلق مسائل دریافت کرتا تھا ، نہ ہی کوئی حق کا طالب تھا ۔ اب الحمدللہ اس کا بہت رواج ہوگیا ہے "۔[۱]

مولانا محمد اشرف علی تھانوی نے شیخ محمد تھانوی شاگرد شاہ محمد دہلوی سے نقل کیا ہے ۔ "انہوں نے شاہ عبدالعزیز کی نسبت فرمایا کہ "ان کو چھ ہزار احادیث کے متن یاد تھے "۔[۲]

مولانا شاہ عبدالعزیز نے علم حدیث میں دو مشہور کتب "بستان المحدثین " اور "عجالہ نافعہ" تصنیف کیں ۔ آپ کی یہ دونوں کتب علوم حدیث کا ذخیرہ ہونے کے باعث نہایت مقبولیت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں ۔ "بستان المحدثین " حدیث کی مشہور کتب اور ان کے مولفین کے حالات و تعارف پر مشتمل ہے ۔ دوسرا رسالہ "عجالہ نافعہ" اصول حدیث کے متعلق تحریر فرمایا ہے ۔ شاہ صاحب نے "عجالہ نافعہ فی اصول حدیث " میں تمام اقسام احادیث جوامع ، مسانید ، معاجم ، اجزاء اور اربعین حدیث کا تفصیلاً ذکر کیا ہے ۔ علاوہ ازیں جہاں تک مسانید کا تعلق ہے ، یہ مشہور آئمہ کرام کی اپنی تالیفات نہیں کیونکہ انہوں نے انہیں بذات خود تصنیف نہیں کیا بلکہ ان کے بعد میں آنے والے لوگوں نے ان کی روایات کو جمع کرنے کے بعد ان کا نام مسند فلاں بن رکھ دیا جیسے مسند امام اعظم کو قاضی القضاۃ ابوالمؤید محمد بن محمود بن محمد الخوارزمی نے تالیف کر کے ۶۷۲ھ میں رواج دیا اور اس میں مسانید امام ابو حنیفہ کو جمع کیا ۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے فرمایا ہے کہ جب انہوں نے طبقات اور ترتیب کتب حدیث کی وضاحت فرمائی تو اس سلسلے میں موطا اور صحیحین کو طبقہ اولی و اعلی میں شمار کیا ۔

---

۱ ۔ شاہ عبدالعزیز ، ملفوظات ۔ ص ، ۹۱

۲ ۔ اشرف علی تھانوی ، افاضات الیومیہ من الافادات القومیہ ۔ ج ۔ ۱ ، ص ، ۲۶۳

شاہ عبدالعزیز نے "بستان المحدثین" میں یہ فرمایا ہے کہ تقریباً ایک ہزار آدمیوں نے امام مالک کے زمانے میں ان کی موطا کو روایت کیا اور محدثین، صوفیاء کرام، فقہاء، امراء، ملوک اور خلفاء نے امام مالک سے تبرکاً ان کی سند حاصل کی۔ اس کے بے شمار نسخوں میں آج عرب ممالک میں سے صرف چند ایک نسخے مشہور ہیں، جن میں سے علماء کے مختلف گروہوں نے یحییٰ بن یحییٰ المصمودی الاندلسی کے نسخے کو رواج دیا۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ہمارے بزرگ اور سردار شاہ ولی اللہ نے تمام امور وعلوم پر بحث و مباحثہ کے علاوہ یحییٰ بن یحییٰ کی روایت سے موطا پر دو شرحیں المسوی اور المصفیٰ تحریر فرمائیں، ان دونوں شرحوں میں امام مالک کے اقوال کو حذف کرنے کے ساتھ ساتھ بعض جگہ ان کے لغات کو بھی حذف کر دیا باوجودیکہ ضبط اور اتقان کے لحاظ سے مسوّیٰ اہم اور بلند پایہ شاہکار ہے۔

شاہ عبدالعزیز کی مندرجہ بالا دونوں کتب احادیث کا ذکر اس مقالے کے چوتھے باب میں تفصیل سے کر دیا گیا ہے۔ حدیث کی ان شاہکار کتب کے علاوہ آپ کی تحقیق و تنقید احادیث بڑے پیرائے میں عمدہ ہے اور یہ مایہ ناز تصنیف خصوصاً ختنین و محدثین کے لیے قابل فخر ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی نے ہندوستان کے دینی و علمی میدان میں طالبین دین کی راہنمائی کرتے ہوئے بہت بلند مقام حاصل کر لیا تھا لیکن آپ کے بعد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی گران قدر تصنیفات سے مسائل دینیہ اور احکام شرعیہ کرامت مسلمہ پر روز روشن کی طرح واضح کر دیا یہاں تک کہ شاہ ولی اللہ کی وفات کے بعد آپ کے جلیل القدر بیٹے شاہ عبدالعزیز نے اپنی علمی خدمات اور مذہبی تعلیمات سے تشنگان حدیث نبوی کو علوم و معارف دینیہ سے سرشار و سیراب کیا چنانچہ چودھویں صدی تک ہندوستان میں علوم اسلامیہ کی طرف مکمل رجحان کے اضافے کے باعث فن حدیث میں ہندی مسلمانوں کا حقیقتاً کوئی عرب ملک شریک و ثانی نہیں بن سکا۔

المختصر خاتم المحدثین شاہ عبدالعزیز کی حدیث نبوی اور اتباع سنت کے سلسلے میں انتہائی کوششوں پر اہل ہندوستان اور امت مسلمہ جتنا بھی فخر کریں، کم ہے۔

شاہ عبدالعزیز بحیثیت مفسّر :

سراج الہند شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے عہد میں ہندوستان میں چند مروّجہ کتب سے عربی اور فارسی کی معمولی تعلیم دی جاتی تھی۔ عربی علوم کے باوجود لوگ قرآن پاک اور اس کی تفسیر کی طرف بالکل توجّہ نہیں دیتے تھے۔ قرآن پاک کا مطالعہ صرف مریضوں کے علاج معالجے کے لیے کیا جاتا تھا چنانچہ علمی انحطاط کے اس دور میں اللہ تعالی نے ان لوگوں کی بداعمالیوں کے استحصال اور تبلیغی خدمات کے لیے شاہ عبدالعزیز جیسی نامور شخصیت کا انتخاب کیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں ہندوستانیوں نے شاہ صاحب کی مسلسل کوششوں سے قرآن پاک کی طرف توجّہ دینی شروع کی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی اس شدید رغبت اور میلان ورجحان سے وہاں بے شمار مدارس و مکاتب کا وجود عمل میں آیا جیسا کہ شاہ عبدالعزیز ملفوظات میں فرماتے ہیں کہ : "تیس سال سے دین کا کچھ چرچا ہے ورنہ صبح سے شام تک بجز معقولات کے حدیث و تفسیر کی کتابیں کوئی کھول کر بھی نہیں دیکھتا تھا، نہ کوئی پڑھاتا تھا اور نہ اس کے متعلق مسائل دریافت کرتا تھا، نہ ہی کوئی حق کا طالب تھا۔ اب الحمدللہ اس کا بہت رواج ہوگیا ہے"۔[1]

شاہ صاحب اپنے جلیل القدر والد گرامی کی مسند علم پر متمکن ہونے کے بارہ سال بعد تک تفسیر و حدیث اور درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اس دوران میں آپ نے اپنی انتھک علمی و تبلیغی جد و جہد سے لوگوں میں اصلاحی روح پھونکی حتّی کہ جب آپ آشوب چشم کے مرض میں مبتلا ہونے کے باعث بینائی سے محروم ہوگئے تو مجبوراً آپ نے مدرسہ کا کام اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے سپرد کر دیا مگر آپ نے تصنیف و تالیف اور فتاوی و وعظ کا کام برابر جاری رکھا۔ ملفوظات میں فرماتے ہیں کہ " جب سے آشوب چشم

۱۔ شاہ عبدالعزیز ، ملفوظات ۔ ص، ۹۱

کی شکایت پیدا ہوئی ہے ، اس فن کی کتابوں کا پڑھنا پڑھانا چھوٹ گیا ہے اور میں نے کتابیں اپنے چھوٹے بھائی کو دے دی ہیں - پھر یہ شعر پڑھا :

ما انچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم

الا حدیث دوست کہ تکرار می کنیم

یعنی سوائے قرآن پاک اور حدیث شریف کے اب کسی کی مزاولت نہیں ہے" -[1]

اگرچہ شاہ صاحب نے بے شمار عوارض کے باعث مسند درس و تدریس اپنے بھائیوں کے سپرد کر دی تھی لیکن خود بھی اپنی عمر کے آخری وقت تک تفسیر حدیث اور دوسرے علوم و فنون کی طرف مکمل توجہ دیتے رہے - اس سلسلے میں شاہ صاحب کی معرکۃ الاراء اور مایۂ ناز تصنیف تفسیر عزیزی ہے ، جو اپنی نظم قرآنی اور تفسیری نکات کے باعث تمام تفاسیر سے افضل مقام رکھتی ہے - شاہ صاحب بذات خود اپنی اس تفسیر پر فخر و انبساط محسوس کرتے ہیں - اس وقت ہمیں شاہ صاحب کے سوا تین سپاروں کی تفسیر ملتی ہے ، جس میں شروع کے سوا سپارے سے کچھ زائد اور آخری دو سپارے شامل ہیں لیکن فتاوی عزیزی میں متعدد مقامات پر تفسیر فتح العزیز کے حوالے سے مختلف سورتوں کی آیات بیان کی گئی ہیں ، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے پورے قرآن پاک کی تفسیر لکھی تھی - آپ نے یہ تفسیر آشوب چشم کے علاوہ مختلف عوارض میں مبتلا ہونے کے بعد شیخ مصدق الدین عبداللہ کی خواہش پر املا فرمائی تھی - تفسیر عزیزی کا تفصیلاً" ذکر اس مقالے کے چوتھے باب میں کر دیا گیا ہے -

اگرچہ شاہ صاحب نے پورے قرآن پاک کی تفسیر املا فرمانے کے بعد اس کا نام فتح العزیز رکھا ، جو آج کل دستیاب نہیں ہے لیکن بعد ازاں مختلف فتاوی کا جواب تفسیر فتح العزیز کے حوالے سے دیا ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے پورے قرآن پاک کی تفسیر املا فرمائی تھی چنانچہ فتاوی عزیزی جو متلاشیان حق کے لیے افادیت کا بہترین سرچشمہ و ماخذ ہے ، کی جلد دوم میں پارہ سیقول ، تلک الرسل ، لن تنالوالبر ، سبحان الذی ، اقترب للناس ، قال الملاء ، امن خلق السموت

۱- شاہ عبدالعزیز ، ملفوظات - ص ۹۷

قد افلح المومنون ، قال فما خطبکم اور مالی لا اعبد الذی کا حوالہ دیتے ہوئے مختلف افعال و امور اور حالات و واقعات کا ذکر نہایت خوبصورت پیرائے میں کیا ہے ، جس میں خدائے بزرگ و برتر کی وحدانیت ، غزوات اور حلال وحرام میں فرق بیان کیا ہے اور بے شمار آیات کی دوسری تفاسیر مثلاً مدارک التنزیل اور تفسیر مظہری وغیرہم کی روشنی میں وضاحت کی ہے - علاوہ ازیں ان آیات کے تفسیری نکات ، قواعد وگرامر کی رو سے بھی بیان کیے ہیں -

المختصر شاہ صاحب کی قرآن پاک کی فارسی تفسیر علمی وادبی لحاظ سے نہ صرف ایک مثالی تفسیر ہے بلکہ اپنے موضوع کے لحاظ سے حرف آخر بھی ہے -

ہندوستان میں علم فقہ :

ہندوستان میں قرآن وحدیث کا چرچا محمد بن قاسم کے عہد سے شروع ہوا - غوری وغزنوی عہد حکومت کے دوران میں کچھ لوگ خراسان اور ماوراء النہر سے فقہ و اصول فقہ کے علاوہ دوسرے علوم بھی ساتھ لائے - بعد ازاں مغلیہ دور میں بھی ہندوستان میں انہی علوم کے علماء وفقہاء کی علمی جلالت شان کی صدائے بازگشت سنائی دیتی تھی - روہیلے اگرچہ تورانیوں کی طرح حنفی تھے- تورانیوں پر فقہاء کی بہ نسبت صوفیاء کا اثر غالب تھا لیکن روہیلوں پر فقہاء کی گرفت زیادہ سخت تھی - حدیث سے بعد اور فقہ حنفی پر جمود جو تورانیوں کے عہد میں تھا ، اس میں روہیلوں کے عہد میں مزید شدّت پیدا ہوگئی - مولانا عبدالحئی نے غیاث الدین تغلق کے عہد کا ، جو تورانی علماء کے اثر واقتدار کا دور ہے ، ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ "نظام الدین بدایونی سماع کا ذوق رکھتے تھے - علماء کو اس پر اعتراض تھا - معاملہ غیاث الدین تغلق تک پہنچا - اس نے شیخ نظام الدین اور فقہاء و قضاۃ کو مناظرہ کے لیے بلایا - شیخ نے وہ احادیث پیش کیں ، جن سے سماع کی اباحت ہوتی تھی - فقہاء نے انہیں رد کر دیا اور کہا کہ ہمارے ملک میں فقہی روایات احادیث پر مقدم ہیں اور بعض نے کہا کہ ہم ان احادیث کو سننا نہیں چاہتے کیونکہ ان سے شافعی نے تمسک کیا ہے اور وہ ہمارے مذہب کے دشمن ہیں "-[1]

۱- سید عبدالحئی لکھنوی ، الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند - ص، ۱۲

اس واقعہ سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس دور کے علماء کا فقہ میں کس درجہ غلو اور حنفیت میں کس حد تک شدّت تھی - روہیلوں کی شدید اور جامد حنفیت کے اس عالم پر "صاحب الیانع الجنی" رقمطراز ہیں -

"کانوا اشد قوم عصبیۃ لما یتحلونہ من آراء فقہائھم رحمہم اللہ تعالیٰ واشد الناس جمود علیھا" - [1]

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسی غلو اور شدت کو دور کرنے اور راہ حق سے بھٹکے ہوئے لوگوں کے لیے مغلیہ سلطنت کے عالمگیری عہد سے چار سال قبل ایک ممتاز اور جلیل القدر شخصیت شاہ ولی اللہ کو حق کا پیغامبر بنا کر بھیجا - شاہ صاحب سے قبل حافظ امان اللہ بنارسی اور قاضی محبّ اللہ بہاری نے فقہ و اصول فقہ پر بلند پایہ کتب اور حواشی تحریر کیے - عالمگیری عہد میں شاہ صاحب کے والد بزرگوار شیخ عبدالرحیم نے اس دور کے ممتاز علماء اور بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ مل کر آٹھ سال کی محنت شاقہ اور دو لاکھ روپے کے اخراجات سے فقہ حنفی کی ایک مبسوط اور مکمل کتاب "فتاویٰ عالمگیری" کی تدوین و تالیف کی - پھر شاہ ولی اللہ نے "تفہیمات الہیۃ" اور "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" جیسی بلند پایہ، معرکۃ الاراء اور شاہکار کتب تصنیف کرکے عوام کے فقہی جمود کو توڑنا چاہا چنانچہ شاہ صاحب تفہیمات میں رقمطراز ہیں :

"تم اہلِ فقہاء کے استحسانات میں ڈوب گئے ہو - کیا تمہیں یہ معلوم نہیں کہ حکم وہ ہے، جو اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہو" - [2] پھر فرمایا :

"میں ان لوگوں سے کہتا ہوں ، جنہوں نے اپنا نام فقہاء رکھ چھوڑا ہے اور جو تقلید جامد اختیار کیے ہوئے ہیں کوئی کی کوئی حدیث اگر صحیح اسناد سے ان تک پہنچتی ہے اور فقہائے متقدمین کی ایک جماعت اسے اختیار بھی کر چکی ہے لیکن اس حدیث سے انہیں صرف یہ چیز روک دیتی ہے کہ

۱- محمد محسن ترہتی ، الیانع الجنی ، ص ۸۳

۲- شاہ ولی اللہ ، تفہیمات الہیۃ - ج - ۱ ، ص ۲۸۳

جس کی وہ تقلید کرتے ہیں ، اس بنا پر اسے صحیح نہیں سمجھتے ۔ میں اہل ظاہر سے کہتا ہوں جو ان فقہاء کے منکر ہیں اور حاملین علم کا نمونہ اور اہل دین کے امام ہیں ، یہ سب حماقت ، سخافت رائے اور ضلالت میں مبتلا ہیں ۔ حق ان دونوں کے بین بین ہے"۔ [۱]

شاہ صاحب عملاً حنفی اور درساً حنفی و شافعی تھے ۔ آپ کا یہ عظیم کارنامہ آپ کی مجتہدانہ نظر ، سلیم الخیالی اور جامعیت پر دلالت کرتا ہے ۔

شاہ عبدالعزیز بحیثیت فقیہہ :

شاہ ولی اللہ کے سب سے بڑے بیٹے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے ، جو دماغی قابلیت اور علمی لیاقت میں مشہور تھے، علم فقہ اپنے ذہین و فطین اور نکتہ رس خسر مولانا نور اللہ سے حاصل کیا ۔ آپ علم حدیث ، تفسیر اور فقہ میں شہرہ آفاق تھے ۔ بیشتر فقہی مسائل میں آپ نے اپنے والد بزرگوار کی پیروی کرتے ہوئے ان ہی کے مسلک کو اختیار کیا چونکہ اس دور کے متعدد مسائل فقہ شافعی سے بھی حل ہوتے تھے ، اس لیے سنت سے موافقت کے معیار ترجیح کے مطابق ان فقہی مسائل میں مذہب شافعی کو بھی ترجیح دی جاتی جیسا کہ شاہ عبدالعزیز ملفوظات عزیزی میں فرماتے ہیں کہ :

" قواعد کلیہ کی مطابقت کے اعتبار سے حنفی مذہب بہتر ہے اور قواعد و تنقیح حدیث کے اعتبار سے شافعی مذہب بہتر ہے"۔ [۲]

شاہ ولی اللہ سے پہلے اور خود ان کے زمانے میں غلط قسم کے تصوّف کی وجہ سے بدعات کی کثرت اور حنفیت پر جمود کا دور تھا لیکن شاہ صاحب آئمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام ، اس کے مذہب سے وابستگی اور مشتمل فرقہ بندی کے قائل نہیں تھے اور اسی بات کی انہوں نے تشہیر کی ۔

۱۔ شاہ ولی اللہ ، تفہیمات الہیہ ، ج ۱ ، ص ۲۷۶ ، ۲۷۷

۲۔ شاہ عبدالعزیز ، ملفوظات ۔ ص ۱۱۶

ان خیالات سے ایک طبقہ تو بالکل متاثر نہ ہوا ۔ جس طبقے نے اثر لیا ، وہ دو گروہوں میں تقسیم ہوگئے ۔ ایک گروہ نے بدعات کو ترک کر کے حنفیت پر قائم رہتے ہوئے حدیث رسول کی طرف بھرپور توجہ کی ، یہ دیوبندیت تھی ۔ شاہ عبدالعزیز ، ان کے بھائی اور متبعین اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں ۔ دوسری جماعت نے ترک بدعات کے ساتھ ساتھ حنفیت اور تقلید کو بھی ترک کر دیا ، یہ شاہ اسمٰعیل شہید اور ان کے پیروکار ہیں ۔ باوجود شاہ ولی اللہ کے طریق کار سے اختلاف کرنے کے یہ دونوں گروہ شاہ صاحب کو اپنی طرف منسوب کرتے ہیں ۔ اس سلسلے میں امیر شاہ خان نے شاہ اسمٰعیل شہید کا ایک واقعہ نقل کیا ہے ، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ " جب شاہ شہید نے رفع یدین شروع کیا تو مولوی محمد علی صاحب اور مولوی احمد علی صاحب نے جو شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگرد اور ان کے کاتب تھے ، شاہ صاحب سے عرض کیا کہ آپ انہیں سمجھائیں تاکہ یہ رفع یدین چھوڑ دیں ۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے فرمایا کہ میں تو ضعف کی وجہ سے اس سے مناظرہ نہیں کر سکتا ، تم میرے سامنے اس سے مناظرہ کر لو ۔ تم میں سے جو غالب آگیا ، اس کے ساتھ ہو جاؤں گا ۔ پھر دوسرے موقع پر شاہ عبدالعزیز صاحب نے شاہ عبدالقادر سے کہا کہ تم سمجھانا ۔ انہوں نے مولوی محمد یعقوب صاحب کے ذریعہ کہلوایا کہ رفع یدین چھوڑ دو ورنہ خواہ مخواہ فتنہ ہوگا ۔ شاہ شہید نے کہا کہ اگر عوام کے فتنہ کا خیال کیا جائے تو اس حدیث کے کیا معنی ہوں گے کہ " من تمسک بسنتی عند فساد امتی فلہ اجر مأۃ شہید " شاہ عبدالقادر نے جب یہ سنا تو فرمایا کہ یہ اس وقت ہے جب سنت کے مقابلہ میں خلاف سنت ہو اور حنفیوں کے مسلک میں یہاں سنت کا مقابل خلاف سنت نہیں بلکہ دوسری سنت ہے " ۔[1]

اس واقعہ سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں ، ایک یہ کہ شاہ صاحب کی طرح شاہ عبدالعزیز شاہ عبدالقادر ، مولوی محمد یعقوب اور شاہ عبدالعزیز کے دوسرے تلامذہ یا کم از کم مولوی محمد علی اور احمد علی رفع یدین نہ کرتے تھے گویا رفع یدین کے معاملہ میں شاہ صاحب کا خاندان عموماً

۱۔ اشرف علی تھانوی ، امیر الروایات ۔ ص ۱۵۵ ، ۱۵۶

حنفی مذھب پر عامل تھا ۔ دوسرے یہ کہ رفع یدین کی سنت پر عمل کرنے سے فتنہ کا خوف تھا ، اسی لیے شاہ عبدالعزیز نے نہایت خوبصورتی سے مناظرہ سے دامن بچایا اور مولوی محمد علی نے بھی مناظرہ نہ کیا ۔ شاہ عبدالقادر خوف فتنہ کے سوا ، رفع یدین کے خلاف کوئی علمی دلیل پیش نہ کر سکے ۔

شاہ عبدالعزیز نے فتنوں کے اس دور میں جب کہ مغلیہ سلطنت دم توڑ رہی تھی ، نہایت سرگرمی و جانفشانی اور اپنی قابل قدر مساعی جمیلہ سے شرک و بدعت کے فتنوں کو دور کر کے فقہ کو سنت کے تابع اور محکوم بنایا اور حدیث کا درس اس طرح دیا کہ اہل روایت کو خوش کرنے کے ساتھ ساتھ اہل درایت کو بھی اس کا مشتاق بنا دیا ۔ تدریس میں فقہ و متعلقات فقہ کا التزام اگرچہ زیادہ تھا مگر حدیث پر اس سے زیادہ گہری نظر تھی ۔

ھندوستان میں علوم قرآن وحدیث وفقہ کی خدمت کا سہرا شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ اوران کی اولاد پر ہی منتہی ہوتا ہے جیسا کہ صاحب اتحاف النبلاء لکھتے ہیں :

" خاندان ایشان خاندان علوم حدیث وفقہ حنفی ست خدمت این علم شریف چنانکہ ازین اہل بیت بود بوجود آمدہ درین کشور از خاندان دیگر معلوم ومشہور نیست تخم عمل بالحدیث در حقیقت پدر ایشان درین سرزمین کاشتہ اند وایشان آنرا برگ وباز بخشیدہ ورنہ در بلاد ھند جز فقہ حنفی ھیچکس علم حدیث وتمسک بدان در علم وعمل نمی ساخت "۔[۱]

استاذ الاساتذہ ھند اور جماعت دیوبند کے پیشوائے اعظم حضرت شاہ عبدالعزیز نے فقہ سے متعلق قانون سازی اور فتاوی وغیرہ کے فیصلوں کے فرائض نہایت سرگرمی سے انجام دیے ۔ آپ نے احکام شریعت ، اسرار معرفت اور اپنی دینی بصیرت کو بروئے کار لاتے ہوئے معاشرہ کو درپیش سماجی ، سیاسی واجتماعی مسائل کو حالات وزمانہ کے تقاضوں کے تحت حل کیا ۔ شاہ صاحب نے اپنے فتاوی میں فقہ سے متعلقہ معاملات وعبادات (خرید وفروخت ، عاریت ، امانت و خیانت)

۱۔ نواب صدیق حسن خان ، اتحاف النبلاء ۔ ص ۲۹۷

مناکحات (نکاح ، طلاق ، عدت ، نسب ، ولایت ، وصیت ، وراثت) عقوبات (قتل ، چوری ، تہمت ، قصاص ، تعزیرات ، خوں بہا) مخاصمات (عدالتی مسائل ، اصول محاکمہ ، قانون مرافعہ) حکومت و خلافت (قومی و بین الاقوامی معاملات ، صلح و جنگ کے احکام وزارت ، محاصل کے علاوہ مسائل نماز ، روزہ ، حج ، مسائل بیع ، رھن ، ھبہ ، سود اور بے شمار مسائل متفرقہ پر فتوے دیے ھیں ۔ گویا آپ نے اپنے علمی تبحر اور درس دگاھوں کے پیش نظر کتاب و سنت و فقہ کی اشاعت و تبلیغ کے سلسلے میں عظیم الشان قومی اور مذھبی خدمات سرانجام دی ھیں ۔

دینی علوم میں فقہ کی گرم بازاری صرف شاہ صاحب کے عہد کی خصوصیت نہیں بلکہ عہد نبوی سے لے کر آج تک جن مسلم حکومتوں میں اسلامی شریعت ملکی قانون کی حیثیت سے رائج رھی ھے ، وھاں فقہ کا عمل دخل بدستور رھا ھے ۔ فقہی مذاھب کے وجود میں آنے سے قبل کوئی خاص فقہی مسلک یا قانون نہیں تھا بلکہ فقہی ذخائر مدون ہونے پر مختلف فقہی مکاتب فکر وجود میں آگئے تو ان کے متبعین اور پیروکاروں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف تعصب پیدا ہوتا گیا ۔ سیاسی تحفظ کی خاطر اصحاب اقتدار اپنے اپنے مسلک کی فقہ کو اپنی سلطنت میں ملکی قانون کی حیثیت سے رائج کرتے رھے ۔ قلمرو ھند میں اصحاب اقتدار اور عوام کی غالب اکثریت بھی حنفیوں کی تھی ۔ اس لیے غزنویوں کے عہد حکومت سے لے کر مغلیہ سلطنت کی دیواروں کے بوسیدہ اور پھر مسمار ہونے تک ملکی قانون حنفی فقہ کے مطابق ھی رھا اور پھر عہدہ قضا پر بھی صرف حنفی علماء فائز کیے جاتے تھے ۔

شاہ عبدالعزیز بحیثیت خطیب :

شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی محدث ، مفسر اور فقیہہ ہونے کے ساتھ ساتھ وعظ و تقریر میں بھی ملکہ رکھتے تھے ۔ آپ کی سلجھی ہوئی معجزانہ تقریر میں بلا کا جادو تھا ۔ آپ کی شیریں بیانی کا ہر موافق و مخالف پر یکساں اثر ہوتا تھا ۔ صاحب اتحاف النبلاء رقمطراز ھیں کہ :

" درکثرت حفظ وعلم ، تعبیر رؤیا و سلیقۂ وعظ و انشا وتحقیقات خفائق علوم و مذاکرہ و مباحثہ باخصوص ممتاز واقران بودند ومعتقد فیہ موافق ومخالف تمام عمر در تدریس افتاء وفصل خصومات ووعظ وتربیت مریدان وتکمیل شاگردان گسذرانید " ۔[1]

شاہ صاحب ہفتہ میں دو مرتبہ منگل اور جمعہ کے دن دھلی کے کوچہ چیلان کے ہوائے مدرسے میں وعظ فرمایا کرتے تھے ، جس میں تین چار ہزار سامعین کا مجمع ہوتا تھا ۔ خاندان کے تمام لوگ بھی اس درس میں شامل ہوتے تھے ۔ علم وفضل کے اس سرتاج کے مواعظ حسنہ سے مستفیض ہونے کے لیے خواص وعوام جمع ہوجاتے تھے ۔ علمائے کرام تفسیر بیضاوی ، تفسیر نیشاپوری ، تفسیر کشاف اور دیگر مشکل تفاسیر کو سمجھنے کے لیے اس مجلس کو رونق بخشتے حتی کہ مخالفین گھروں سے یہ ارادہ کر کے نکلتے کہ وعظ کے دوران میں کسی مسئلے میں اعتراض کریں گے لیکن آپ کے عجیب وغریب طرز بیان سے کسی میں مزاحمت کی گنجائش نہ ہوتی تھی ۔ آپ کی تقریر سے غیر مسلم مسلمان ہوجاتے اور شکوک واوھام والے قوت اعتقاد حاصل کرتے ۔ وعظ ختم ہونے تک مجلس پر مکمل سکوت اور خاموشی چھائی رہتی ۔

شاہ صاحب اپنے وعظ میں نکات قرآن مجید کو اس طرح بیان کرتے کہ جیسے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہو ۔ آپ کی اس سحرآمیز اور جادوبھری تقریر سے ہر مذہب وملت کا آدمی متاثر ہوتا اور خوشی ومسرت محسوس کرتا تھا ۔ صاحب آثار الصنادید آپ کی اس خوبی کے بارے میں فرماتے ہیں :

" ہفتہ میں دوبار مجلس وعظ منعقد ہوتی تھی اور شائقین صادق المعتقدت وصافی نہاد خواص وعوام سے مہر وطفخ سے زیادہ جمع ہوتے تھے اور طریقہ رشد وھدایت کا استفاضہ کرتے " ۔[2]

---

١ ۔ نواب صدیق حسن خان ، اتحاف النبلاء ۔ ص ، ٢٩٦

٢ ۔ سرسید احمد خان ، آثار الصنادید ۔ ص ، ٧١

گویا شاہ صاحب میں تقریر و خطابت کی صلاحیتیں اوائل عمر سے ہی موجود تھیں۔ سینکڑوں تشنگان علوم دین اور طالبان حق ملتن کا سفر طے کرکے آپ کی فصیح و بلیغ، موثر، دلچسپ، شستہ و منجھی ہوئی محفل وعظ و تبلیغ میں بہت شوق سے حاضر ہوتے اور مطمئن واپس جاتے۔ شاہ صاحب کسی اہم اور مشکل بحث کو اس طرح آسانی اور خوبی سے بیان کرتے کہ بڑے بڑے علماء و فضلاء دنگ رہ جاتے۔ ملفوظات کے ایک قول سے آپ کی مقبول و معروف تقریروں کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ " غازی الدین حیدر بلا منصب و جاگیر مجھے طلب کرے، میں جانے کو تیار ہوں بشرطیکہ تعرض نہ کرے اور انشاءاللہ خلقت الٰہی کو بڑی ہدایت ہوگی۔ میں اپنی تقریروں میں مناسب تبدیلی کرکے ان کو زیادہ مفید بنا دوں گا اور ایسے انداز کی تقریریں کروں گا جو عوام میں مقبول ہوں گی، لوگ فریفتہ ہوں گے اور مذہب حق اختیار کریں گے۔ پھر فرمایا کہ میں اپنے قتل سے ذرا بھی خائف نہیں ہوں مگر اس طرح کہ جس خدمت کی انجام دہی میں موت کی آرزو ہے، کسی بہانے اس کام میں شہادت نصیب ہو "۔[1]

شاہ صاحب نے دربار دہلی میں اپنی آمد و رفت کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا، اس لیے کہ نواب اودھ غازی الدین حیدر اور ان کے دادا و پردادا اپنے اس خاندانی منصب وزارت پر فخر کرتے تھے لہٰذا مندرجہ بالا قول میں وہ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کو لوگوں تک پہنچانے اور علوم دین کی اشاعت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں، اس لیے وہ دربار میں واضح تقریر کرکے پیش نظر کام کو ادھورا چھوڑنا پسند نہیں فرماتے۔ شاہ صاحب کے اس قول سے واضح ہوتا ہے کہ متعصب امراء و وزراء بھی آپ کی بات کو بلا تردد تسلیم کرتے ہیں۔

شاہ صاحب جب وعظ و تقریر کے لیے کھڑے ہوتے تو اس قدر خوبصورت اور دلنشین انداز سے تقریر کرتے کہ اعتراض کرنے والے کو تقریر میں لاجواب کر دیتے۔ صاحب کمالات عزیزی فرماتے ہیں کہ

۱۔ شاہ عبدالعزیز، ملفوظات عزیزی۔ ص، ۵۱

"عشرہ محرم الحرام کو حضرت مولانا صاحب وعظ فرمایا کرتے تھے - ہزارہا آدمی جمع ہوتے تھے اور اہل تشیع کے ہاں بھی اس وقت کتاب اور مرثیہ بند ہو جاتا تھا - ایک شخص نے سوال کیا کہ جب حضرت امام حسین علیہ السلام اور یزید کا مقابلہ تھا ، حق تبارک تعالی کس طرف تھے - حضرت نے فرمایا کہ میزان عدل پر تولتے تھے کہ حضرت امام علیہ السلام کا صبر اس مردود کے ظالم پر غالب آیا" -[1]

شاہ صاحب کی موثر وعظ و تذکیر نے اہل دہلی کی کایا پلٹ کر رکھ دی تھی - اپنی تقاریر میں قرآن پاک کی تفسیر اور احادیث کی روشنی میں اس کے معانی کی تشریح و توضیح بیان فرمایا کرتے تھے جیسا کہ ملفوظات عزیزی میں فرماتے ہیں کہ " منگل کے روز میں نے قل ھو اللہ کی تفسیر میں بیان کیا تھا کہ اللہ اس ذات کا نام ہے جو تمام صفات کمالیہ کا جامع ہو اور وہ ذات حق سبحانہ ہے - حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ اسم اعظم یہی ہے ، بشرطیکہ کہنے والے کے دل میں سوائے اللہ کے کچھ نہ ہو - پھر عرض کیا کہ بندہ کو بہ نسبت دوسرے ناموں کے زیادہ تر اسی نام سے سکون و طمانیت قلب حاصل ہوتا ہے" -[2]

شاہ صاحب جب تقریر کا آغاز کرتے تو مجلس میں موجود تمام حاضرین درس آپ کی پرمغز اور شستہ وعظ سے جھومنے لگتے اور ان پر وجد طاری ہو جاتا - خود شاہ صاحب ملفوظات میں فرماتے ہیں کہ " والد ماجد کے درس وغیرہ میں تحریر و تقریر اکثر مرقص ہوتی تھیں - ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت کی تقریر بھی مرقص ہوتی ہے کہ عوام اس کو سن کر جھومنے لگتے ہیں - حضرت نے فرمایا کہ جو چیز فانی ہے ، وہ اگر اچھی ہے تو کیا کیونکہ ناپائیدار کی تعریف ہی کیا" -[3]

۱- مولوی ظہیر الدین ، کمالات عزیزی - ص، ۹، ۱۰۰

۲- شاہ عبدالعزیز ، ملفوظات - ص، ۲۰۵

۳- ایضاً - ص، ۸۲

شاہ صاحب سال میں ایک مرتبہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اپنے آبا واجداد کے مزارات پر فاتحہ خوانی کے لیے تشریف لے جاتے۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد قرآن شریف یا مثنوی کا وعظ فرماتے اور وعظ کے بعد چنے، الائچی کے دانے یا کچھ اور تقسیم فرماتے۔

شاہ صاحب جوانی کے زمانے سے ہی متعدد امراض کا شکار ہو چکے تھے۔ اشتداد مرض سے تکلیف وکرب میں اضافہ ہوتا گیا حتّٰی کہ اس بے چینی اور اضطراب کی حالت میں وعظ کا دن آیا۔ ہزاروں لوگوں کا مجمع تھا اور آپ کی وعظ ونصیحت برابر جاری تھی۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی واعظ وخطیب ہونے کے علاوہ صوفی اور متکلم بھی تھے۔ آپ کے فتاویٰ میں تصوّف کے بے شمار مسائل وامور کا حل موجود ہے۔ آپ نے طریقہ قادریہ، چشتیہ اور نقشبندیہ کی بنیاد کی تحقیق اور سیر قدمی، سیر نظری، طریقہ جذب اور طریقہ سلوک وغیرہ کی تشریح بیان کی ہے۔ توحید وجودی اور توحید شہودی کی تشریح اور ان میں اختلاف آراء کو بھی واضح کیا ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار مسائل کو سلجھایا ہے۔ شاہ صاحب علم تصوّف کے متعلق ملفوظات میں فرماتے ہیں کہ "علم تصوّف نہایت دقیق علم ہے، جس کو یہ علم حاصل ہوگیا، اس کے سامنے کتاب صدرا وغیرہ کی کچھ حیثیت نہیں"۔[1]

اسی طرح ملفوظات میں ہی تصوف کے مختلف رسائل کا ذکر کرتے ہوئے شیخ حسن ظاہر کی کتاب مفتاح الفیض کو علم سلوک میں بہتر تصنیف بتایا ہے گویا دوسرے علوم کے علاوہ شاہ صاحب علم تصوّف میں بھی یگانہ روزگار تھے اور اس سلسلے میں آپ نے بے شمار خدمات سرانجام دیں۔ شاہ صاحب ایک ماہر زاہد صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ متکلم بھی تھے۔ آپ کی شاہکار تصنیف/تحفہ اثنا عشریہ میں کئی جگہوں پر کلامی مباحث موجود ہیں۔

۱- شاہ عبدالعزیز ، ملفوظات - ص، ۲۶

باب ــ ششم

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی سیاسی تحریک کا پس منظر

اور ان کی مساعی جمیلہ

(الف) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی سیاسی تحریک کا پہلا دور۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تحریک جہاد کا سیاسی پس منظر ، شاہ عبدالعزیز کے عہد میں تربیت وتحریک جہاد ، سید احمد شہید کی تحریک جہاد ۔

(ب) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی سیاسی تحریک کا دوسرا دور: تحریک جہاد کے لیے الصدرالحمید شاہ محمد اسحاق کی مساعی جمیلہ ۔

شاہ عبدالعزیز کی تحریک جہاد کا سیاسی پس منظر

امام المحدثین ، صوفی درویش اور عہد ساز شخصیت شاہ ولی اللہ نے ابتری ، بدنظمی اور خونریزی کے پرفتن و پرآشوب دور میں اپنی سیاسی تحریک اور تجدیدی مساعی کا آغاز کیا ۔ شمال و جنوب میں مرہٹوں اور سکھوں کا طوفان ، دہلی پر نادر شاہ کا حملہ ، پانی پت میں احمد شاہ ابدالی کا مرہٹوں کو شکست دینا اور بنگال میں انگریزی فوجوں کا سراج الدولہ کو موت کے گھاٹ اتار کر غیروں کی شہنشاہیت کا پرچم لہرانا سلطنت مغلیہ کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو بجھانے کی سب سے بڑی وجوہات تھیں ۔ ان حالات میں مغلیہ سلطنت کو بحال کروانا ایک مشکل ہی نہیں ، ناممکن امر تھا لہذا اس دوران میں شاہ صاحب معاشرے و ملت کو ضلالت و گمراہی کے گہرے غار میں گرنے سے بچانے کے لیے تصنیف و تالیف میں مصروف رہے ۔ حکیم الہند شاہ ولی اللہ نے اس زمانے کی دفتری زبان فارسی میں بیسیوں کتب تصنیف کیں اور ان میں اپنی دعوت کے اصول و مسائل کو ایک ہی جگہ قلم بند نہ کیا بلکہ اصل لوگوں کی دست برد سے بچانے کے لیے انہیں مختلف کتب میں پھیلا کر بیان کیا ۔ اس وقت تمام دنیا میں عموماً اور ہندوستان میں خصوصاً اسلام پر ضعف و کمزوری کے آثار بہت حد تک نمایاں تھے ۔ اپنے وطن کی تباہی و بربادی اور دوسرے ممالک کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس تباہی کی اصل وجہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ پر چھایا ہوا فرسودہ اور بے کار نظام ملوکیت اور شہنشاہیت ہے ۔ لہذا سب سے پہلا کام فک کل نظام یعنی سیاسی اور سماجی زندگی کے ہر ایک شعبہ میں ہمہ گیر انقلاب برپا کرنا ہے ۔ چنانچہ آپ کی سیاسی تحریک کا اصل مقصد مذہب کی روح اور عدل و انصاف تھا ۔ آپ اپنی ہمہ گیر تحریک کے تحت مسلمانوں کو غیر مسلموں کے اقتدار اور ان کے بے پناہ مظالم سے نجات دلانا چاہتے تھے ۔ آپ نے اپنی تجدیدی دعوت میں زندگی کی وسعت پذیری اور ہمہ گیری کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا ، جس کے طرز فکر کا دار و مدار عام مسلمانوں پر تھا ۔ حکیم الامت

شاہ ولی اللہ ہندوستان کی مرکزیت اور وحدت کو بحال رکھنے کے لیے ہندوستان کی ساری قلمرو ایک بادشاہ ، ایک قانون اور ایک سیاسی نظام کے تحت دیکھنے کے خواہش مند تھے یعنی عدل و انصاف قائم کرنے والی جمہوری حکومت ۔ شاہ صاحب اپنے مجوزہ نظام میں اکبر ، جہانگیر شاہجہان اور اورنگ زیب کے زمانے کی مرکزیت اور سلطنت ہند کے اقتدار اعلی کو بحال دیکھنا چاہتے تھے لیکن جاٹوں ، سکھوں ، مرہٹوں ، نوابان اودھ اور روہیلوں کی بغاوتوں نے اس کسی مرکزیت کو تباہ کر دیا تھا لہذا اس لا مرکزیت کے سیلاب کو روکنے کے لیے شاہ صاحب نے ایک نیا دستور حیات پیش کیا اور اس کے ساتھ ساتھ تربیتی مراکز قائم کرکے ایک دفعہ ہندوستان کا تصوّر پیش کیا ۔ اس تصوّر کی تکمیل آپ کے خلفاء اور خصوصاً جانشین اکبر شاہ عبدالعزیز نے سرانجام دی ۔

شاہ ولی اللہ نے بارہ برس کے مطالعہ کے بعد اپنے اصلاحی پروگرام کے دو اصول متعیّن کیے ۔ ایک تو قرآن حکیم کی حکمت عملی یعنی انسانوں کی عملی زندگی قرآنی تصوّرات و احکامات کی آئینہ دار ہو ۔ اس زمانے کے سلطانوں کی مذہبی زبان عربی تھی اور عام پڑھے لکھے لوگوں کی زبان فارسی تھی چنانچہ شاہ ولی اللہ نے سب سے پہلے قرآن پاک کا اس زمانے کی دفتری زبان فارسی میں ترجمہ کیا تاکہ کلام الٰہی کو زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں ۔ اس پر جاہ پرست علماء اس قدر برافروختہ ہوئے کہ تلواریں میانوں سے نکال آئیں اور فتح پوری کی جامع مسجد میں تلواروں اور دیگر ہتھیاروں سے مسلح ہوکر آپ پر قاتلانہ حملہ کیا لیکن آپ غیر معمولی جوش کی حالت میں ایک پتلی لکڑی ہاتھ میں لیے اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے اس خونی مجمع کو چیرتے ہوئے نکل گئے ۔

شاہ صاحب نے قرآن پاک کے اس فارسی ترجمہ کے حواشی میں وہ تمام چیزیں جمع کر دی ہیں ، جو ان کی دعوت تجدید میں اساس کا حکم رکھتی تھیں ۔ سب سے پہلی بات یہ کہ مکّہ معظمہ میں ایک مستقل اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آ چکا تھا ۔ گو اس زمانہ میں تشدّد اور لڑائی کی اجازت نہیں ملی تھی ۔ سورۂ رعد کے آخری حصّے میں :

"اولم یروا انا ناتی الارض ننقصها من اطرافها واللہ یحکم لا معقب لحکمہ وھو سریع الحساب"

کے معنی کی وضاحت فرماتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ اسلام کی عظیم الشان حکومت سرزمین عرب میں روز افزوں ترقی پر تھی اور دار الحرب کا دائرہ اثر آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا ۔ دار الحرب کے دائرہ اثر کے کم ہونے سے مراد عرب کے مختلف قبائل مثلاً اسلم ، غفار ، جہینہ ، مزینہ اور بعض دیگر قبائل کا حلقہ بگوش اسلام ہونا ہے ۔ یہ واقعہ ہجرت سے قبل کا ہے ۔ الغرض شاہ صاحب کے نزدیک مکّہ میں اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آ چکا تھا ۔ یہ حکومت عدم تشدد کے اصولوں پر عامل تھی ۔ شاہ صاحب نے بھی اسی نظام مکّی کی تقلید کرتے ہوئے اپنی انقلابی تحریک کو جاری رکھا ۔ آپ نے تصوّف کے خاص طریقہ کی بیعت کو اپنے سیاسی نظام کی اساس بنایا لہٰذا آپ نے اپنی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے عدم تشدد کی راہ اختیار کی اور ان ہی اصولوں پر اپنی جماعت تیار کی ۔ شاہ صاحب طوائف الملوکی کے اس دور میں اگر چاہتے تو ہمدردی نوع انسانی کی خاطر دیگر جنگ جو سرداروں کی طرح تلوار ہاتھ میں لے کر فوج بھرتی کر کے کسی علاقہ پر قابض ہوجاتے لیکن آپ تشدد کے قائل نہ تھے کیونکہ اس سے پارٹی کا نصب العین "ہمہ گیر انقلاب" پایہ تکمیل کو نہ پہنچتا بلکہ آپ ایسی فوجی قوت سے جس کی تربیت جہاد کے اصول پر ہوئی ہو ، انقلاب کے حامی تھے ۔ اسی لیے آپ نے اپنی زندگی میں ہی اصلاحی نظریات کے مطابق تربیتی مراکز قائم کیے تاکہ اس میں ایسے سرفروش مجاہد تربیت حاصل کریں جو اپنی ذات اور ذاتی مفادات کو ختم کر کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کو اپنی زندگی کا مقصد بنائیں لہٰذا آپ اپنے اس مقصد عظیم میں کامیاب رہے ۔ آپ کے بعد آپ کے جانشین اعظم شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے حکومت چلانے کے لیے آدمی تیار کر لیے ۔

قرآن پاک کی حکمت عملی کے بعد آپ کے اصلاحی پروگرام کا دوسرا اصول اقتصادیات میں توازن اور مساوات کی اہمیت واضح کرنا تھا ۔ اس سلسلے میں آپ نے اقتصادیات و معاشیات کے مسائل پر اپنی شاہکار کتب حجۃ اللہ البالغہ اور بدور بازغہ میں "ارتفاقات" کے عنوان سے جو اصول بحث

گیے ہیں ، اگر کوئی مسلم حکومت انہیں اپنا دستور اساسی بنا لے تو اس کی مملکت یقیناً اقتصادی بے چینی اور طبقاتی کشمکش سے بڑی حد تک محفوظ رہ سکتی ہے۔ ان ہی ابواب ارتفاقات میں مالیات حکومت، نظام عدل ، فوج ، پولیس حتّٰی کہ بلدیات وغیرہ کی تنظیم کا نقشہ بھی پیش کر دیا ہے۔ مثلاً " حجۃ اللہ البالغہ " میں ارشاد فرماتے ہیں کہ " اگر کسی قوم میں تمدن کی مسلسل ترقی جاری رہے تو اس کی صنعت و حرفت انتہائی کمال پر پہنچ جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر حکمران جماعت آرام و آسائش اور زینت و تفاخر کی زندگی کو اپنا شعار بنا لے تو اس کا بوجھ قوم کے کاریگر طبقات پر بڑھ جاتا ہے۔ انسانیت کے اجتماعی اخلاق اس وقت برباد ہوتے ہیں ، جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کیا جائے۔ اس وقت وہ گدھوں اور بیلوں کی طرح روٹی کمانے کے لیے کام کریں گے۔ انسانیت پر ایسی مصیبت نازل ہو تو خداوند تعالی انسانیت کو اس سے نجات دلانے کے لیے کوئی راستہ ضرور الہام کرتا ہے یعنی ضروری ہے کہ قدرت الٰہیہ انقلاب کے سامان پیدا کرکے قوم کے سر سے ناجائز بوجھ اتار دے چنانچہ قیصر وکسری کی حکومت نے یہی وتیرہ (آرام و آسائش ، رفاہیت بالغہ) اختیار کر رکھا تھا۔ اس مرض کے ازالے کے لیے امّیین (عربون) میں رسول کو پیدا کیا گیا۔ فرعون کسی ملوکت اور قیصر وکسری کی تباہی اس اصول پر لوازم نبوت سے شمار ہوتی ہے"۔[1]

آپ کے اس قول سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ انسانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے اقتصادی نظام کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اقتصادی نظام کے درست اور متوازن ہونے کے نتیجے میں انسانی اجتماع کے اخلاق اعلی بنیادوں پر تعمیر ہوں گے۔ اخلاق کی یہ تعمیر و تکمیل ہونے کے بعد اسے جنّت کا مستحق قرار دے گی اور انسانی اجتماع کو اس ارتقائی منزل پر چلانا انبیاء اور ان کے متبعین یعنی صدیق اور حکیم کا کام ہے ، جن کے ذریعے انسانیت کے مجموعی مسائل حل ہو جاتے

۱۔ شاہ ولی اللہ ، حجۃ اللہ البالغہ ۔ جلد اوّل ۔ باب اقامۃ الارتفاقات واصلاح رسوم ۔ ص، ۱۰۴، ۱۰۵

ہیں ۔ شاہ صاحب کے نزدیک اقتصادی توازن کے یہی معنی ہیں ۔ ہندوستان کے بلند مرتبہ سپوت حضرت شاہ ولی اللہ کے نظریہ کے مطابق اقتصادی عدم توازن نے مذہب کے سو ہلاک قلموں کو مسمار کیا ہے پر لہذا سوسائٹی کی اقتصادی اصلاح ، مذہبی واخلاقی عظمت اور روحانی کمالات کا سب سے پہلا زینہ ہے ۔ روحانیت اور فلسفہ اخلاق کے بہترین ماہر شاہ ولی اللہ سوسائٹی کی اقتصادی اصلاح کو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا اہم جز قرار دیتے ہیں ۔

حکیم الہند شاہ ولی اللہ اپنے اس لائحہ عمل کو ایک مدلل شکل میں اپنی قوم کے ارباب فکر کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے اور اس منصب کے لیے حدیث وفقہ میں مجتہدانہ کمال کے حصول کی خاطر حرمین تشریف لے گئے ۔ دو سال کے قلیل عرصے کے قیام کے دوران میں اعلی علمی کتابوں اور جلیل القدر اساتذہ سے استفادہ کیا ۔ شاہ صاحب نے جمعہ کی رات ۲۱ ذیقعد ۱۱۴۴ھ /۱۷۳۱ء میں مکہ معظمہ میں یہ الہامی خواب دیکھا تھا کہ " ملک الکفار مسلمانوں کے شہروں پر قابض ہو گیا ہے " اس خواب کا مشاہدہ آپ کو ہند میں یوں کروایا گیا کہ لال قلعہ پر مرہٹوں نے قبضہ کر لیا پھر آپ نے خواب میں یہ بھی دیکھا تھا کہ میں قائم الزمان ہوں یعنی اللہ تعالی کے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک ذریعہ بنایا گیا ہوں " ۔[1]

تیس سال بعد ۱۱۷۴ھ میں معرکہ پانی پت میں اس خواب کی تعبیر عمل میں آئی ۔ شاہ ولی اللہ کے خاص عقیدت مند نواب نجیب الدولہ اور ان کے رفقاء کار نے آپ کے مشورے سے آپ کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی چنانچہ پانی پت میں احمد شاہ ابدالی کی کامیابی نے دہلی کے سیاسی افق کو مرہٹوں کے بڑھتے ہوئے خطرات سے محفوظ کر دیا ۔

شاہ ولی اللہ جیسے حقیقت شناس عالم اور بلند مرتبہ سپوت ہند نے جمہوری روایت اسلامی کے برخلاف شہنشاہی طرز حکومت کے نفاذ اور اجتہاد کے اختتام پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے

۱۔ شاہ ولی اللہ ، فیوض الحرمین ، ص، ۸۸ ، ۸۹

قرآن پاک اور احادیث شریف پر مبنی اخلاقی و روحانی اصول کے تابع انقلابی تحریک کا آغاز کیا ۔ اس سلسلے میں حکیم الہند نے اپنا ایک نصب العین متعین کیا اور اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک مرکزی جمعیت بنائی ۔ اس جمعیت کے نمایاں ارکان مولانا محمد عاشق صاحب ، مولانا نور اللہ بڈھانوی ، مولانا محمد امین کشمیری ، حضرت شاہ ابو سعید ، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور مولانا مخدوم لکھنوی صاحب تھے گویا حزب ولی اللہ ایک مسلم پارٹی کی صورت میں منظر عام پر آئی ۔ اس پارٹی کے علمی وعملی تربیت کے مراکز مختلف مقامات پر تھے ۔ سب سے پہلا اور بڑا مرکز دہلی تھا ، جس کو چار چاند لگانے والی شاہ ولی اللہ کی ذات ستودہ صفات تھی ۔ دوسرا مرکز رائے بریلی کا مشہور دائرہ "شاہ علم اللہ" کے نام سے مشہور تھا ۔ یہ علمی وعملی مرکز اودھ کے علاقہ میں تقریباً نصف صدی پہلے سے تعلیم و تربیت کا سرچشمہ بنا ہوا تھا ۔ سلطان ٹیپو کی روحانی وابستگی بھی اسی مرکز سے تھی ۔ اس مرکز میں کام کرنے والے نسبی لحاظ سے تو شاہ علم اللہ سے وابستہ تھے لیکن علمی وعملی لحاظ سے شاہ ولی اللہ کے تربیت یافتہ و مستفید تھے ۔ اس تربیت گاہ کے علماء و فضلاء حضرت شاہ محمد واضح ، حضرت شاہ ابو سعید ، حضرت سید محمد معین اور حضرت سید محمد لقمان نے حضرت شاہ ولی اللہ سے استفادہ کیا ۔ ان دو مراکز کے علاوہ تیسرا مرکز نجیب آباد ، چوتھا مدرسہ ملّا محمد معین ٹھٹھہ سندھ اور پانچواں اودھ کے دار الحکومت لکھنؤ میں تھا ، جس میں شاہ ولی اللہ کے شاگرد رشید مولانا مخدوم لکھنوی تقریباً نصف صدی تک مسلمانان ہند کو مستفیض کرتے رہے ۔

شاہ صاحب نے ملوکیت ، شاہ پرستی اور اجارہ داری کے بدنما داغ کو دامن اسلام سے دھونے کے لیے مکمل اور ہمہ گیر انقلاب کا چراغ روشن کیا تھا اگرچہ اس مقصد کے لیے مجاہدین اسلام کو تربیت دینے کے لیے مختلف مقامات پر تربیتی حلقے قائم کیے لیکن شاہ صاحب کا انقلابی فکر ، اعلی درجہ کی انشا پردازی اور سحر آفرین قوت تحریر کے باوجود نشر و اشاعت سے محروم تھا ۔ انشاء اور صحافت کی یہ طاقت صرف آپ کی کتابوں تک محدود ہو کر رہ گئی ، جس کی نشر و اشاعت

تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد ہو سکی اور ان حالات میں نشر و اشاعت کا ذریعہ تقریریں اور تعلیم و تربیت کے مندرجہ بالا حلقے تھے ۔ طوائف الملوکی اور دن رات کے قیامت خیز ہنگاموں کے باعث شاہ صاحب کو اپنے انقلابی منشور کو یکجا مدوّن و مرتب کرنے کا موقع نہ ملا ۔ ان تمام حالات کے باوجود شاہ صاحب کی یہ جماعت ایک مسلم پارٹی کی صورت میں ظاہر ہوئی ۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اس تحریک کے تین امام ، امام شاہ ولی اللہ ، امام شاہ عبدالعزیز ،امام محمد اسحاق اور ایک امیر سید احمد شہید مقرر ہوئے ۔ اس کے بعد شاہ ولی اللہ کی وفات ١٧٣١ءتا ١٧٦٢ء سے امام عبدالعزیز کی امامت کے فرائض کا آغاز ہو جاتا ہے ۔

شاہ عبدالعزیز کے عہد میں تربیت و تحریک جہاد :

شاہ ولی اللہ کی وفات ١١٧٦ھ /١٧٦٢ءکے بعد آپ کے بڑے فرزند شاہ عبدالعزیز کو آپ کا جانشین تسلیم کیا گیا ۔ شاہ ولی اللہ کے عہد میں ہندوستان کی سسکتی ہوئی سلطنت آخری سانس لے رہی تھی لیکن شاہ عبدالعزیز کے عہد میں مکمل طور پردم توڑ گئی ۔ شاہ ولی اللہ کے عہد میں انگریز بنگال اور مدراس پر قابض ہو چکے تھے ۔ شاہ عبدالعزیز کے عہد میں اکتوبر ١١٧٨ھ /١٧٦٢ء میں بکسر کی لڑائی میں شاہ عالم ثانی انگریزوں کے ہاتھ آگیا تھا ۔ بادشاہ نے ایک معاہدے کے تحت تمام قلمرو کی نظامت کمپنی کے سپرد کر دی اور عملاً یہ قرار پایا کہ خلق خدا کی ، ملک بادشاہ سلامت کا اور حکم انگریز کا ۔ شاہ عالم ثانی کے بعد اکبر ثانی کے عہد میں ایک طرف تو دہلی سے کلکتہ تک کے علاقوں پر انگریزوں کا معنوی تسلط ہو گیا اور دوسری طرف دکن میں مرہٹے اور پنجاب میں سکھ زور پر تھے ۔ اس سیاسی انتشار کے ساتھ مذہبی و اخلاقی لحاظ سے ہندوستان کفرستان بن چکا تھا ۔ رسومات شرک و بدعت مشہور و نامور علماء کے گھروں میں کھلم کھلا ادا کی جاتی تھیں ۔ بیواؤں کا نکاح ثانی حرام اور خلاف شرع سمجھا جاتا تھا ۔ محفل غنا و مزامیر و اختلاط امارد ، عبادات اور تزکیہ نفس میں شمار کیے جاتے تھے ۔ قرآن پاک صرف مریضوں کی جھاڑ پھونک کے لیے استعمال

کیا جاتا تھا ۔ حدیث و سنت کی قدر ومنزلت دلوں سے اٹھتی جا رہی تھی ۔ مسلمانوں میں ہمدردی، اخوت اسلامی میل جول اور پیار و محبت مفقود ہوگیا تھا۔ بلند آواز سے اذان کہنا اور گاؤ کشی جرائم کبیرہ میں داخل تھی ۔ گائے کے ذبح کرنے والے کو پھانسی کی سزا ہوتی تھی اگر یہی ضلالت و گمراہی تھوڑے عرصے تک برقرار رہتی تو اسلام کا کوئی نام لینے والا بھی باقی نہ رہتا ۔ شاہ صاحب نے مندرجہ بالا برائیوں سے معاشرے کو پاک کرنے کے لیے پبلک جلسوں اور عام اجتماعات سے تقریروں کے ساتھ ساتھ قوم کی علمی ، اخلاقی ، روحانی اور جسمانی تربیت کی اور اپنے والد بزرگوار کے مقصد اعلی کی تعمیر کے لیے اپنے کام کو نہایت حکمت عملی اور خوش تدبیری سے پایہ تکمیل تک پہنچایا ۔

شاہ ولی اللہ نے مسلمانان ہند کے نئے ہندوستان کے تصوّر کے لیے جس فکری انقلاب کا آغاز کیا ، شاہ عبدالعزیز نے اس تصوّر کو عام مسلمانوں کے لئے عام فہم بنایا ۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے اپنے علوم و افکار کا تعارف صرف دھلی کے اعلی طبقے سے کروایا تھا لیکن شاہ عبدالعزیز نے قوم کے متوسط طبقے کو بیدار کرکے انہیں شاہ ولی اللہ کی زبان اور ان کے طور طریقوں پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی ۔ شاہ صاحب خود دھلی میں شاہ ولی اللہ کے تربیتی مرکز کے تربیت یافتہ تھے پھر اسی مدرسہ سے شاہ محمد اسحاق اور حضرت سید احمد شہید کے علاوہ بے شمار لوگ تربیت پا کر اطراف ہند میں پھیل گئے ۔ شاہ ولی اللہ کے زمانہ میں اودھ کے مدرسہ لکھنؤ کی سرپرستی کے فرائض مولانا مخدوم لکھنوی سرانجام دیتے رہے تھے لیکن شاہ عبدالعزیز کے عہد میں آپ کے شاگرد رشید میرزا حسن علی صغیر محدث اور مولانا حسین احمد ملیح آبادی جیسے علماء وفضلاء نے شاہ عبدالعزیز کے حلقہ درس سے فیض یاب ہوکر لکھنؤ میں عرصہ تک دین اسلام کی اس شمع کو جلا ئے رکھا ۔ شاہ عبدالعزیز جیسے قابل وفاضل جانشین کی تعلیم وتربیت اور نشر و اشاعت کے باعث ہندوستان کے تمام علمی حلقوں کا تعلق براہ راست آپ کے علمی مرکز سے قائم ہوگیا تھا ۔ شاہ ولی اللہ کے اصلاحی پروگرام اور فکری انقلاب کا تصوّر چند مخصوص لوگوں کی امانت تھا لیکن شاہ عبدالعزیز کے عہد میں اہل علم کے علاوہ مسلمانان ہند کا عام جذبہ بن چکا تھا ۔

علمی تربیت گاہوں کے علاوہ شاہ صاحب نے خود غرضی ، نفس پرستی اور اقتدار پسندی جیسی اغراض سے پاک کرنے کے لیے اور صبر و ضبط ، جفاکشی اور محبت و شفقت کے جذبات پیدا کرنے کے لیے مسلمانان ہند کو ایک جھنڈے تلے جمع کیا تاکہ وہ مرہٹوں ، سکھوں اور انگریزوں کا مقابلہ کر سکیں ۔ اس سلسلے میں شاہ صاحب جانتے تھے کہ مسلمان اقوام میں سے صرف افغانوں میں جنگی طاقت ، حربی قوت اور مردانگی و شجاعت کے جوہر موجود ہیں ، اس لیے آپ نے اسلامی حکومت کے لیے مضبوط فوج فراہم کرنے کی خاطر مسلمان اقوام میں سے لائق فائق اور قابل و اہل لوگوں کی مدد سے کابل و قندھار کے نواح میں امارت قائم کرنے کا ارادہ کیا ۔ اس تحریک کے سلسلے میں شاہ صاحب نے پہلے اسلامی عقائد و اخلاق کے متعلق غلط فہمیوں کی اصلاح کی ۔ اس طرح ایک طرف تو لوگ مرشدوں اور عالموں کو چھوڑکر آپ کے گرد جمع ہو جاتے اور دوسری طرف مخالف گروہوں کے لوگ آپ کی تحریک کی ترقی کی راہ میں حائل نہ ہوتے ۔ اس پروگرام کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب نے انقلابی دعوت عام کا ایک مرکز قائم کیا ، جس کے ارکان شاہ اسمٰعیل شہید ، سید احمد شہید اور مولانا عبدالحئی تھے ۔ شاہ محمد اسحاق کو اس دینی جماعت کا امیر اور سید احمد کو امیر الدعوات اور امیر الجہاد مقرر کیا ۔ اس مقصد کے لیے دہلی کی فضا سازگار نظر نہیں آتی تھی ۔ اس لیے اس جماعت نے افغانی علاقے میں جانے کا ارادہ کیا کیونکہ افغانوں میں سیّد کی امارت بہت جلد قبول ہوتی ہے ۔ اس دوران میں سید احمد شہید امیر جماعت ، مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحئی ان کے وزیر مقرر ہوئے ، جنہوں نے دنیاوی مادی اغراض سے بالا ہو کر مخلوق خدا کی خدمت اور ان کے لیے کسی قسم کی قربانی کے جذبے سے دریغ نہ کیا ۔ ان تربیت گاہوں اور انقلابی تحریک کے علاوہ شاہ صاحب اپنے مقررہ پروگرام کے مطابق ہفتہ میں دو مرتبہ عام اجتماع سے خطاب کیا کرتے تھے تاکہ آپ کی اس تربیت فکری کے ذریعے عوام میں مستقل بیداری پیدا ہو ۔ شاہ صاحب نے دعوت و عمل کے باوجود بھی جب حالات کا رخ بدلتے نہ دیکھا تو ہندوستان کے وہ علاقے جو غیر مسلم طاقت کے قبضے میں تھے ، انہیں دارالحرب قرار دے دیا ۔ اس میں وہ تمام علاقے بھی شامل تھے ، جن پر دہلی کے بادشاہ کا برائے نام عمل دخل تھا ۔

شاہ صاحب کے نزدیک سلطان دھلی کی برائے نام حکومت ملک کو دار السلام نہیں بنا سکتی مسلمانوں کی زبردست قوتیں اپنے مذہبی فریضے کو سرانجام دینے کی خاطر دشمن سے مقابلہ کرکے اپنی دنی اسلامی حکومت بنائیں اور ایسی حالت میں دشمنوں کے غلبہ کو ختم کرنے کے لیے مسلمان قوم کے ہر فرد پر واجب ہے کہ وہ پوری طاقت وہمت سے ان کا مقابلہ کریں ۔ انیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان میں انگریز ریزیڈنٹ آ چکا تھا ۔ ہندوستانی حکمرانوں اور انگریزوں کی قوت آزمائی کے اس آخری نازک ترین دور میں شاہ ولی اللہ کے جانشین اعظم نے اپنے فتوے کو عملی شکل دینے کے لیے حضرت سید احمد کے ساتھ اپنے خاص مریدوں کو جسونت راؤ ھلکر کے دوست نواب امیر علی خان کی فوج میں بھرتی کروا دیا ۔

وعظ وخطابت سے مسلمانوں کو بیدار کرنے کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب نے امام ولی اللہ کے علوم وحکمت کو تمام علماء کے ذہنوں تک پہنچانے کے لیے تصانیف کا سلسلہ شروع کیا ۔ آپ نے شاہ صاحب کی تفسیر قرآن " فتح الرحمن " کے پوشیدہ رموز ومشکلات کی وضاحت کے لیے تفسیر " فتح العزیز " لکھی ۔ مثلاً شاہ ولی اللہ کی تفسیر قرآن میں حروف مقطعات کا سمجھنا بہت مشکل تھا ، فتح العزیز میں آپ نے ان غوامض کو سہل بنا دیا ۔

شیعیت کی دعوت مسلمانوں کو قرآن عظیم کی برکات عامہ سے محروم کرنے اور ان کے مسموم توھمات متوسط طبقوں کے ذہنوں کو خراب کرنے کا باعث بنے پھر شیعوں کی طرف سے حضرت ابوبکر ، حضرت عمر اور ان کی خلافت پر جو اعتراضات ہوتے تھے ، ان کے رد میں شاہ ولی اللہ نے اپنی مشہور کتاب " ازالۃ الخفا " لکھی تھی ۔ شاہ عبدالعزیز نے لوگوں کے اذہان وافکار کو اس زہریلے پروپیگنڈے سے بچانے کے لیے اس کتاب کے مقدمے کے طور پر " تحفہ اثنا عشریہ " تصنیف کی ۔ شاہ ولی اللہ قرآن وحدیث کی تعلیمات کی طرف توجہ دلانے کے لیے اس کے معارف اور اصولوں سے راہنمائی حاصل کرنے کا حکم دیتے ھیں ۔ اس سلسلے میں شاہ عبدالعزیز نے شاہ ولی اللہ کی کتاب المؤطا اور المسوّی کو قرآن پاک کی اساس بنا کر اپنے زمانے کے علماء کو اس کی طرف راغب کیا ۔

شاہ ولی اللہ نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں قیصر و کسریٰ کی مذمت کرتے ہوئے معیشت اور معاشرت میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کے اخلاق و اوصاف کو اپنانے کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے چنانچہ شاہ عبدالعزیز نے اپنے والد بزرگوار کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے اس عہد کی سرمایہ داری اور ملوکیت کی لعنتوں کو بے نقاب کیا، جن کا اہل ہند کے لیے سمجھنا مشکل ہو رہا تھا لہذا سوسائٹی کی ان وضع کردہ رسموں کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے شاہ صاحب کے تربیت یافتہ نوجوانوں کے ایک گروہ نے اس کام کو خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کا عہد کیا۔ اس مرکزی جمعیت کے سرکردہ بزرگ آپ کے تینوں بھائی مولانا اسمٰعیل شہید، مولانا محمد اسحاق، مولانا عبدالحئی اور مولانا محمد یعقوب دہلوی تھے، جس میں بعد ازاں حزب سید احمد شہید کو بھی ضم کر دیا گیا۔

شاہ عبدالعزیز کی علمی و عملی تربیت اور وعظ و خطابت کے باعث شاہ ولی اللہ کا فکری انقلاب خصوصاً پورے ہندوستان اور عموماً تمام مسلمانوں کا جذبہ بن چکا تھا اور ہزاروں تربیت یافتہ نوجوان اس کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر چکے تھے۔ آپ کی تعلیم و ارشاد کا اثر نہ صرف ہندوستان بلکہ حجاز کے ذریعے استنبول تک پہنچا۔ استنبول کے علماء کی طرف سے آپ کو آستانہ تشریف لانے کی دعوت دی گئی اور یہ کہ وہاں کی تمام علمی جماعتیں آپ کی سیادت میں کام کریں گی لیکن آپ نے اپنے والد بزرگوار کے ہمہ گیر انقلاب کے تصوّر کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا ارادہ کیا ہوا تھا، اس لیے ہندوستان سے باہر جانا پسند نہ کیا۔

الغرض شاہ عبدالعزیز اور ان کی مرکزی جمعیت کے ارکان کی تعلیمی، تبلیغی و فکری اور عملی جد وجہد سے جب تمام لوگ شاہ ولی اللہ کے فکری تصوّر سے آگاہ ہوگئے تو شاہ عبدالعزیز کو انقلابی تحریک کے دوسرے حصّے کی تکمیل کے لئے ایک موزوں نوجوان کی ضرورت پیش آئی۔ یہ نوجوان سید احمد شہید تھے۔ شاہ عبدالعزیز نے ان میں کشفی کمالات اور سپاہ گری کی صفات دیکھ کر انہیں اپنی مرکزی جمعیت کا امیر الجہاد مقرر کر دیا۔ مایوسی کے اس تاریک دور میں بوڑھے امیر شاہ عبدالعزیز نے اپنے بڑھاپے اور بیماریوں کے باوجود اپنے عہد کے آخری حصّے میں ہندوستان کی اسلامی ریاست میں سخت ابتری دیکھ کر اپنی جماعت کے عسکری اور تنظیمی دو الگ الگ بورڈ

بنا دیے ۔ عسکری امور کے لیے سید احمد شہید امیر اور مولانا عبدالحئی صاحب اور مولانا محمد اسمٰعیل شہید مشیر مقرر کیے چنانچہ تمام جماعت کے لیے یہ حکم تھا کہ ہر معاملے میں ان تینوں اصحاب کے فیصلے کو امام عبدالعزیز کا فیصلہ سمجھا جائے۔ تنظیمی امور کے لیے آپ نے مولانا محمد اسحاق کو ہر معاملہ میں اپنے ساتھ شریک رکھا یہاں تک کہ آپ کو مدرسہ عزیزیہ میں اپنا قائم مقام مقرر کر دیا اور ان کے حکم کو بھی اپنا حکم ہی قرار دیا ۔ ان تمام تمہیدی مراحل کے بعد سید احمد شہید ۱۲۳۱ھ میں پہلی مرتبہ اپنے بورڈ کے ارکان کے ساتھ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے ۔ ۱۲۳۶ھ میں یہ بورڈ شاہ عبدالعزیز کے حکم پر جہاد کی بیعت کی غرض سے دورے پر روانہ ہوا پھر انہیں اپنی تنظیم کو مزید مضبوط بنانے کے لیے بحری قافلے سمیت حج پر جانے کا حکم ملا ۔ امیر الجہاد کی یہ دعوت و تبلیغ حزب ولی اللہ کی سیاسی پارٹی کی تشکیل و تنظیم کی ابتداء تھی ۔ ۱۲۳۹ھ میں اس قافلے کی واپسی پر شاہ عبدالعزیز فوت ہو چکے تھے اور اس عسکری جماعت نے جہاد کا اعلان کر دیا تھا ۔

سید احمد شہید کی تحریک جہاد :

حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے جس ہمہ گیر انقلاب کا بیج بویا تھا ، شاہ عبدالعزیز کی آبیاری سے ایک تناور درخت بن چکا تھا اور حضرت سید احمد شہید ، شاہ اسمٰعیل شہید اور ان کے جانثار رفقوں نے اسے اپنے خون سے سینچا۔ ابتداء میں یہ علمی اور اصلاحی تحریک تھی لیکن انگریز کے منحوس وفاق نے اسے قومی سیاسی تحریک بنا دیا ۔ اس تحریک کا مقصد غیر مسلموں کے اقتدار اور ان کے بے پناہ مظالم سے مسلمانوں کو نجات دلانا تھا ۔

دہلی میں سید صاحب کے تبلیغ و توحید کے دورے کے وقت پنجاب سے مسلمانوں پر سکھوں کے مظالم کی خبریں آنا شروع ہو گئی تھیں ۔ شاہ صاحب ان مظالم کی تحقیق کے لیے خود پنجاب تشریف لے گئے تھے اور آپ نے خود اس بات کا مشاہدہ کیا تھا کہ مسلمان غیر مسلموں کے ہاتھوں صرف دین کی وجہ سے تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں ۔ اذان کی آواز تک سننے میں نہیں آتی ۔ مسلمانوں کو مسجدوں کے دروازے بند کر کے نماز پڑھنے کے جرم میں قرآن پاک کی بے ادبی کی صورت میں سزا دی جاتی ہے ۔

سید صاحب کے رام پور میں زمانہ قیام کے دوران میں ایک طالب علم نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ " ہم اپنے اثنائے راہ ملک پنجاب میں ایک کنوئیں پر پانی پینے گئے تھے ۔ ہم نے دیکھا کہ چند سکھنیاں یعنی سکھوں کی عورتیں اس کنوئیں پر پانی بھر رہی ہیں ۔ ہم لوگ دیسی زبان نہیں جانتے تھے ۔ ہم نے اپنے مونہوں پر ہاتھ رکھ کر ان کو اشارے سے بتلایا کہ ہم پیاسے ہیں ، ہمیں پانی پلاؤ " ۔ تب ان عورتوں نے ادھر ادھر دیکھ کر پشتو زبان میں ہم سے کہا کہ ہم مسلمان افغان زادیاں فلاں ملک اور بستی کی رہنے والی ہیں ۔ یہ سکھ لوگ ہمیں زبردستی پکڑ لائے ہیں اور سکھنیاں بنا کر اپنی جوروئیں بنا لیا ہے ۔ یہ سن کر ہمیں بہت رنج ہوا کہ مسلمان عورتیں جبراً اس طرح سے کافر بنائی جاتی ہیں ۔ اے سید صاحب آپ ولی اللہ ہیں ، کچھ ایسا فکر کرو کہ ان کو اس کفر سے نجات ملے ۔ تب سید صاحب نے فرمایا کہ انشاء اللہ تعالی میں عنقریب سکھوں سے جہاد کروں گا "۔[1]

سید صاحب کے اس جہاد کے دو مقاصد تھے ۔ ایک تو سکھوں سے نبرد آزمائی اور ان کی جابرانہ اور سکھے شاہی حکومت کا خاتمہ ، دوسرے انگریزوں سے نپٹنا اور برصغیر سے تاجروں کا اخراج ۔

نوشہرہ میں قیام کے دوران میں سید صاحب نے دربار لاہور کی طرف مسلمانوں پر ظلم کا ہاتھ روک لینے کے بارے میں خط لکھا کہ اس صورت میں ہمارا تمہارا کوئی تنازعہ نہیں لیکن دوسری صورت میں تلوار فیصلہ کرے گی ۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ آپ کے پیغام کو خاطر میں نہ لایا بلکہ اپنے سالار لشکر سردار بدھ سنگھ کو لکھا کہ ان (مجاہدین) سے جیسے بھی ہو سکے ، نپٹ لو ۔

سید احمد نے اس معاملے کی اطلاع پاتے ہی تربیت یافتہ نوجوان غازیوں کو منظم کیا اور ۱۲۲۱ھ/۱۸۲۶ء میں راجستھان سے ہوتے ہوئے سندھ پہنچے ۔ وہاں سے قندھار ، پھر کابل ہوتے ہوئے ہندوستان کی شمال مغربی سرحد میں داخل ہوگئے ۔ قافلے کے اس آزاد مرکز

۱۔ محمد جعفر تھانیسری ، تواریخ عجیبہ ۔ ص، ۲۲۰

میں پڑاؤ ڈالتے ہی سکھوں کی فوج سے تصادم شروع ہوگیا لہذا ہنگامی حالات میں نظم و ضبط قائم رکھنے اور مفتوحہ علاقوں کا انتظام سنبھالنے کے لیے باقاعدہ نظام حکومت کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ ۱۲ جمادی الآخر ۱۲۴۲ھ / ۱۰ جنوری ۱۸۲۷ء میں تحصیل چارسدہ میں ایک عارضی حکومت بنائی گئی ، جس میں انتظامیہ وعدلیہ کے ساتھ محکمہ احتساب بھی قائم کیا گیا ۔ اس حکومت کے امیر اور سربراہ سید احمد مقرر کیے گئے ۔ اس حکومت کا مقصد وطن کو دشمن سے آزاد کرانا تھا چنانچہ اس حکومت کی مقبولیت اور عوام کے رجحانات کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس آزاد حکومت کے قائم ہونے کے چند ہفتوں بعد آپ کے ساتھ تقریباً ایک لاکھ مجاہدین کا قافلہ تھا ۔ اس حکومت کو شاہ اسحاق صاحب کے زیر سرپرستی دھلی کے مرکز سے ہر قسم کی امداد پہنچتی تھی ۔ البتہ کبھی کبھار رسد کی دشواری پیش آ جاتی تھی ۔ اس مرکز میں قیام کے دوران میں ایک خٹک سردار نے اس بات کی اطلاع دی کہ میرا بھتیجا میری جاگیر (اکوڑہ) پر سکھوں کے لشکر کے ساتھ ڈیرے ڈالے ہوئے ہے لہذا اس سردار نے سکھوں پر حملے کی ترغیب دلائی چنانچہ ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ء میں تقریباً ایک ہزار مجاہدین نے دشمن کے مورچہ بند پڑاؤ پر شب خون مار کر تقریباً سات سو سکھوں کو ختم کر دیا ۔ سردار بدھ سنگھ لاھور کسی طرف بھاگ کھڑا ہوا لیکن محافظ قلعہ کے غیرت دلانے پر فرار ہونے والوں کو دوبارہ جمع کر کے مجاہدین پر حملہ آور ہوا ، جس کے نتیجے میں مجاہدین کو پیچھے ہٹنا پڑا ۔ اس شب خون میں تقریباً ۲۷ مجاہدین شہید اور ۲۵ زخمی ہوئے ۔ اس خون ریز معرکے میں دشمن کی کامیابی کی ایک وجہ خادی خان اور یار محمد خان جیسے قبائلی سرداروں کی غداری اور سازش تھی اور دوسری وجہ مسلمانوں کی بھاری جمعیت کھوکھلی یعنی غیر تربیت یافتہ تھی ۔ دشمن کے ساتھ دوسرا مقابلہ حضرو کے مقام پر ہوا ، اس میں مجاہدین کامیاب وکامران رہے ۔ اس معرکے میں افغانی حملہ آور جب مال غنیمت سمیٹ کر واپس آئے تو سکھوں نے انہیں گھیرے میں لے لیا ۔ مجاہدین کی فوری کمک پہنچنے پر دشمن بھاگ کھڑا ہوا اور مجاہدین کامیاب رہے ۔ تیسرا معرکہ دریائے اباسین کے

کنارے پر ہوا ، جس میں افواج محمدی غالب رہیں - چوتھی جنگ سیدو کے مقام پر ہوئی - پانچویں لڑائی ڈمگلہ پر ہوئی ، جس میں سید صاحب کو زہر دیئے پر افراتفری میں فتح شکست میں بدل گئی - مجاہدین کا اگلا حملہ پکھلی کی گڑھی پر تھا - اس طرح متحدہ طاقتوں کے مقابلہ میں مجاہدین کے گیارہ حملوں کے بعد فتح و کامیابی سید صاحب کے قدم چومتی رہی - بالآخر مجاہدین کا لشکر ، یار محمد خان ، خادی خان اور امیر خان کے خاتمے کے بعد ستمبر ۱۸۲۹ء میں بغیر کسی مزاحمت کے پشاور میں داخل ہوگیا - سید صاحب نے شہر میں داخل ہوتے ہی امن کا اعلان کردیا - پشاور پر اسلام کا پرچم لہرانے لگا - قحبہ خانے اور شراب کی دکانیں بند ہوگئیں ، اعمال و اخلاق پر احتساب جاری کیا گیا ، بازاری عورتیں روپوش ہوگئیں اور باشندگان شہر مکمل طور پر مطمئن ہوگئے مختصراً یہ کہ ضلع پشاور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت کے لیے ناقابل برداشت حادثہ تھا چنانچہ رنجیت سنگھ نے پشاور کے سردار سلطان محمد کی مالی اور فوجی امداد کی - سلطان محمد نے سید احمد کی خدمت میں معافی تقصیر کی درخواست پیش کرکے حکومت پشاور کی بحالی کے احکامات لے لیے - سید احمد صاحب چالیس مجاہدین کو اس کی امداد و اعانت کے لیے پشاور میں متعین کرکے خود اپنے مرکز پنجتار لوٹ گئے - ان تمام معرکوں سے سید صاحب کا مقصد اس عظیم معاشرے کو مکمل طور پر اسلامی سانچے میں ڈھالنا تھا گویا ظلم و ستم کا خاتمہ اور معاشرتی اصلاح سید صاحب کی تحریک کے خاص مقاصد تھے - سیّد صاحب نے سوات اور پشاور کے علاقوں میں سرداروں اور خانوں کے غریبوں اور کمزوروں پر مظالم اور بالادستی کا خاتمہ کیا - اس طرح امیر ، غریب ، قوی اور کمزور سب ایک سطح پر آگئے - شاہ صاحب کی یہی اصلاحات آپ کے لیے مصائب و ناکامی کا سبب بنیں کیونکہ افغان سردار ، جو سکھوں کی لوٹ کھسوٹ اور ظلم و ستم سے تنگ آچکے تھے ، آپ کے ہاتھ پر بیعت کرکے آپ کے جانثاروں میں شامل ہوگئے تھے لیکن اب جب کہ سید صاحب نے معاشرے سے برائیوں کا خاتمہ کرکے اصلاحات پر مبنی ایک باقاعدہ اور مکمل نظام نافذ کردیا تھا چنانچہ لہو و لعب کے عادی

جب ان بد اعتدالیوں سے کنارہ کشی کرنے لگے تو انہیں یہ کام بہت مشکل نظر آیا اور پھر اس نظام سے جن افغانی سرداروں کے اقتدار پر کاری ضرب لگی تھی، انہوں نے آزاد منش اور لہو ولعب کے دلدادہ لوگوں کو مشتعل کرکے انہیں بغاوت پر آمادہ کرلیا ۔ ان باغیانہ سرگرمیوں میں دغا باز، فریبی اور مکار حاکم پشاور سلطان محمد خان پیش پیش تھا چنانچہ انہوں نے ایک تیار شدہ منصوبے کے تحت پشاور میں سید صاحب کے مقررکردہ چالیس مجاہدین ایک رات کو عشاء کے وقت شہید کردیے ۔ سیّد صاحب نے ان مدبر علماء کی شہادت سے دل برداشتہ ہوکر اس مرکز کو چھوڑ کر ایک دوسرا نیا مرکز قائم کرنا چاہا ۔ اس مقصد کے لیے آپ پشاور اور سمّہ سے کوچ کرکے بالاکوٹ کی طرف روانہ ہوگئے ۔ ادھر بھی سکھوں نے آپ کا راستہ روکا لیکن انہیں پے در پے شکست ہوتی رہی ۔ اسی دوران میں سکھوں نے سکھ سردار راجہ شیر سنگھ کی سرکردگی میں بالاکوٹ کے مقام پر حملے کی تیاریاں شروع کردیں ۔ حملہ آور پہاڑ پر تھے اور مجاہدین دامن کوہ میں، ظاہر ہے، نیچے کی فوجیں اوپر والوں کا کہاں تک مقابلہ کرسکتی تھیں ۔ پھر بھی مجاہدین نے دشمن کے بہت بڑے لشکر سے مردانہ وار مقابلہ کیا، جس میں نہ تو مردانگی وشجاعت کام آسکی اور نہ ہی فوجی طاقت ۔ اس جنگ میں سکھوں کی فوج نے مخفی راستے کا پتہ چلا کر راستہ کی چوکی کے محافظ دستہ کو شہید کردیا اور پھر ان کی ٹڈی دل فوج مجاہدین کے سر پر پہنچ گئی نتیجتاً سید صاحب، شاہ اسمٰعیل صاحب اور سینکڑوں مجاہدین ساتھی شہید ہوگئے، جو باقی بچے، وہ اس طرح منتشر ہوئے کو انہیں شہیدوں کی تجہیز وتکفین کا بھی موقع نہ ملا ۔

تاریخ حریت کا یہ وحشت ناک حادثہ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ / ۷ مئی ۱۸۳۱ء کو بمقام بالاکوٹ پیش آیا ۔

سکھ سردار راجہ شیر سنگھ نے شہید مجاہدین میں سے سید صاحب کی نعش مبارک تلاش کروا کے آپ کو قیمتی دوشالہ اوڑھایا ۔ سکھ فوج کے مسلمان سپاہیوں نے نماز جنازہ ادا کی پھر فوجی اعزاز کے ساتھ آپ کو سپرد خاک کردیا گیا ۔ سردار نے خود مشایعت کی اور اپنے سامنے لحد میں اتروایا ۔

مولانا عبدالحئی کی وفات کے بعد سید احمد صاحب اور مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی شہادت سے تحریک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا بقول ڈاکٹر ہنٹر :

> "یہ تحریک کسی راہنما کی موت وحیات سے بالکل مستغنی ہوگئی تھی۔ خود سید صاحب کی وفات کو بھی ان کے پرجوش حامیوں نے اپنے مذہب کی اشاعت کے لیے ایک مستقل ذریعہ بنا لیا تھا"۔[1]

سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کی دعوت جہاد ہمالیہ کی چوٹیوں اور نیپال کی ترائیوں سے لے کر خلیج بنگال کے کناروں تک پھیل چکی تھی لہٰذا جماعتوں کے نفاق اور افراد کے اختلاف سید صاحب کی تحریک کی ناکامی کا سبب بنے۔ اس کے باوجود آپ کی تحریک نے اپنے پیروکاروں میں اہلیت، خلوص واتحاد اور تنظیم وسیاست کے جوہر پیدا کر دیے تھے۔ آپ کے خلفاء ہر صوبے اور ولایت میں پہنچ کر تجدید اصلاح اور تنظیم کا کام انجام دے رہے تھے۔ نام کے مسلمان کام کے مسلمان بن رہے تھے، اسلام کا کلمہ پڑھ رہے تھے، شراب کی بوتلیں توڑی جا رہی تھیں، مشرکانہ رسوم مٹائے جا رہے تھے، بدعتیں چھوڑی جا رہی تھیں اور حق وصداقت کی بلندی کے لیے علماء و امراء حجروں اور ایوانوں سے میدان میں آ رہے تھے۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد تمام تر ذمہ داری شاہ محمد اسحاق کے کندھوں پر آ پڑی تو آپ نے اپنے داماد مولانا نصیر الدین صاحب کو سرحد بھیج کر اس تحریک کو از سر نو زندہ کیا۔

تحریک جہاد کے لیے شاہ محمد اسحاق کی مساعی جمیلہ :

شاہ ولی اللہ کی اصلاحی تحریک کا پہلا دور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید پر ختم ہوتا ہے۔ اس تحریک کے دوسرے دور کا آغاز ان دو اصحاب کی

---

1. W.W. Hunter, The Indian Musalmans. p. 10.

شہادت ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء پر الصدر الحمید شاہ محمد اسحاق دہلوی سے ہوتا ہے اگرچہ یہ دونوں اصحاب شاہ صاحب کے تصوّر کے مطابق میدان عمل میں اترے لیکن اپنی بے انتہا مساعی جمیلہ کے باوجود بھی اپنے مقاصد میں ناکام رہے ۔ اس کے باوجود بھی اس تحریک کے اثرات فنا نہ ہو سکے اور اصل روح زندہ رہی ۔ اس تحریک کو مردان حق جس طرح روشن کر گئے تھے ، اسے حوادث زمانہ گل نہ کر سکے چنانچہ اس تحریک کی ایک دوسری صورت جنگ آزادی ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء تھی ۔ اس دن آزادی کی آگ کے شعلے میرٹھ شہر سے بلند ہوئے اور آہستہ آہستہ برصغیر کے بیشتر حصوں کو اپنی لپیٹ میں لیتے گئے ۔ برسوں سے سینوں میں سلگتی ہوئی یہ آگ سید احمد شہید بریلوی کی تحریک جہاد اور خود حکمران طبقے کی نت نئی غلط پالیسیوں اور ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھی ۔

شاہ محمد اسحاق واقعہ بالاکوٹ کے بعد گیارہ سال تک حزب ولی اللہی کے نظام کو پختہ بنانے کے لیے ایک نیا پروگرام تشکیل دینے پر غور و فکر فرماتے رہے ۔ بالآخر اپنے اس نئے پروگرام کو دو اہم اصولوں ، حنفی مذہب کی پابندی اور ترکی سلطنت سے اتصال سے مکمل کر لیا۔ اس نظام کو مزید مستحکم بنانے کے لیے ترکی خلافت سے اشتراک کے لیے اپنا مرکز مکۃ معظمۃ لے گئے ۔

بالاکوٹ کی ہزیمت کے بعد حزب ولی اللہ انشقاق و اختلاف کے باعث دو جماعتوں میں منقسم ہو گئی ۔ ایک دہلوی (دیو بندی) جماعت ، جو شاہ محمد اسحاق کی سرپرستی میں تحریک جہاد کے لیے رواں دواں تھی اور دوسری پٹنہ بہتی صادق پور کی مولانا ولایت علی کی جماعت ، چونکہ شاہ محمد اسحاق اپنی تحریک کے نظم و ضبط اور کارروائیوں کو کمپنی کے لوگوں سے مخفی رکھنا چاہتے تھے ، اس لیے صادق پور کی جماعت ہندوستان میں ہردلعزیز اور نمایاں ہو گئی لیکن شاہ محمد اسحاق مکۃ معظمۃ میں بیٹھ کر اپنی مرکزی تحریک کی راہنمائی کرتے رہے ۔ آپ نے دہلی میں اس نظام کو پیدا کرنے اور اس کی اشاعت کے لیے مولانا مملوک علی کی

صدارت مین مولانا قطب الدین دہلوی ، مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور مولانا عبدالغنی دہلوی کو ملا کر ایک بورڈ بھی بنا دیا تھا ۔ اس دیوبند جماعت کا مقصد مولانا اسحاق کی ہجرت کے بعد ان کی مالی اعانت اور ان کے افکار کی اشاعت کرنا تھا ۔ شاہ محمد اسحاق نے مکہ معظمہ پہنچ کر بھی آزادی سے اپنی ہندوستانی تحریک کی راہنمائی کی لیکن دولت عثمانیہ کی وزارت خارجہ کو جب آپ کے مکۃ معظمہ سے اخراج پر اکسایا گیا تو آپ نے اس بیرونی دباؤ سے نجات حاصل کرنے کیلئے شیخ الحرم کو ذریعہ بنایا اور کچھ شرائط کے تحت حجاز مین رہنے کی اجازت حاصل کر لی ، جن مین سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ مولانا محمد اسحاق دولت عثمانیہ کی سیاسی راہنمائی پر مکمل طور پر اعتماد کرتے ہین ۔ شاہ صاحب کے متبعین مین سے آپ کی دہلوی جماعت نے بھی اپنے کام سے ربط مین آسانی کی غرض سے اس فیصلہ کو قبول کر لیا ۔ یہ دہلوی جماعت ہندوستان مین شاہی اقتدار بحال رہنے تک اپنے وطن مین اپنا کام سرانجام دیتی رہی لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی مین انگریزون کے ہندوستان مین اقتدار حاصل کرنے کے بعد دہلوی جماعت کے لیے اپنا مرکز ایسے علاقے مین قائم رکھنا ناممکن ہوگیا ۔ اب یہ جماعت اپنا مرکز کسی ایسے علاقے مین منتقل کرنا چاہتی تھی ، جو انگریزی حکومت کے ماتحت نہ ہو ۔ ۱۸۵۷ء مین اس جماعت مین سلطان دہلی کی جانب داری اور غیر جانب داری کی بنا پر ایک اختلاف رونما ہوا ، جس کے باعث اس جماعت کے دو مرکز علی گڑھ اور دیو بند بن گئے ۔ سرسید احمد خان دہلی کالج کے انگریزی حصہ کو علی گڑھ اور مولانا محمد قاسم نانوتوی عربی حصّہ کو دیو بند لے گئے ۔ سرسید احمد خان کی جماعت انگریزی حکومت سے تعاون کیے بغیر اپنے مقاصد کے حصول مین کامیاب نہین ہو سکتی تھی ۔ اس لیے اس جماعت نے سیاسی مصلحت کے تحت گورنمنٹ کی وفاداری کا اعلان کر دیا لیکن اس کے برعکس دیو بند جماعت پریشان کن حالات کے سوا

حکومت کی مکمل وفاداری کا اعلان نہیں کر سکتی تھی ۔ سقوط دہلی کے نو سال بعد ۱۲۸۳ھ/
۱۸۶۶ء میں اسی جماعت نے دہلی کے مدرسہ کے نمونہ پر دیو بند میں ایک درسگاہ قائم کی ،
جس نے پچاس سال کے عرصہ میں شاندار کامیابی حاصل کی ۔ اس مدرسہ میں صدارت کے فرائض
مولانا مملوک علی سرانجام دیتے رہے ۔ شاہ محمد اسحاق کے بعد اس مدرسے کے تمام کام امیر
امداد اللہ کی راہنمائی میں پایہ تکمیل کو پہنچتے رہے پھر اس مدرسہ کی دو اور شاخیں
سہارن پور اور مراد آباد میں بھی قائم کی گئیں ۔ مدرسہ دیو بند کی تاریخ کا پہلا دور
مولانا رشید احمد گنگوہی کی وفات ۱۳۲۳ھ پر ختم ہوتا ہے ۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی ، مولانا
امداد اللہ ، مولانا محمد یعقوب دیوبندی اور مولانا رشیداحمد گنگوہی کے بعد اس مدرسہ کو
چار چاند لگانے والی شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی بلند پایہ شخصیت تھی ، جنہوں نے
۱۳۳۹ھ/۲۳-۱۹۲۲ء تک شاہ صاحب کی اس تحریک کو قائم دائم رکھا ۔ یہ دیوبند جماعت تقریباً
ایک سو سال تک مولانا محمد اسحاق دہلوی کے چلائے ہوئے راستے پر گامزن رہی ۔ اس کا
عملی نتیجہ دیوبندی نظام کی صورت میں نکلا ۔ پاکستان کے قیام ۱۹۴۷ء تک یہ تحریک و تنظیم
انگریز فوجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے فرائض بخوبی سرانجام دیتی رہی ۔ جب ایک اسلامی
مملکت پاکستان وجود میں آ گئی تو آخری امیرالمجاہدین نے اعلان کر دیا کہ اب اس تنظیم
اور مرکز مجاہدین کی ضرورت باقی نہیں رہی اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان کا وجود سرسید احمد خان
کے تعلیمی مشن اور محمد علی کسی سیاسی جدو جہد کا نتیجہ ہے تو یہ بات ان لوگوں کے نزدیک
بالکل بجا ہے ، جنہوں نے ان لوگوں کے ماتحت انگریزی علوم حاصل کیے لیکن عام مسلمانوں کسی
بیداری کی تحریک کا منبع و مصدر شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ایک نئے ہندوستان کا تصوّر ،
شاہ عبدالعزیز کے وعظ و ارشادات اور ہندوستان کے تصوّر کو مسلمانوں کے لیے عام فہم بنانا اور
شاہ اسمعیل شہید اور سیداحمد شہید کی تحریک جہاد ہے چونکہ اس زمانے کی زبان

فارسی تھی اور بعد کے زمانے کی زبان انگریزی اور اردو تھی لیکن اگر ان تمام تعلیمات کا مطالعہ کیا جائے جن کی تعلیم بعد کے زمانے میں دی گئی تو یقیناً وہ تعلیمات وہی ہیں جن پر عمل پیرا ہونے کی تلقین ولی اللہی خاندان نے کی تھی -

----

کتابیات

کتابیات

عربی کتب

نام مصنف	نام کتاب	پبلشرز و سن اشاعت
سید عبدالحئی لکھنوی	نزهة الخواطر و بهجة المسامع والنواظر (ج - ۶-۷)	دائرة المعارف العثمانية حیدر آباد دکن - ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۹ء
" "	الثقافة الاسلامية فی الهند	المجمع العلمی دمشق ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء
شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی	میزان البلاغت	مطبع مجتبائی میرٹھ ، ۱۳۱۲ھ
" "	سرّ الشہادتین	مطبع محمدی لاہور (س-ن)
" " مرتبہ (ایوب قادری)	عزیز الاقتباس فی فضائل اخیار الناس (فضائل صحابہ و اہل بیت)	جامعہ پریس کراچی ، ۱۹۶۵ء
شاہ ولی اللہ	الانصاف فی بیان سبب الاختلاف	المکتبة العلمية طبع اولی ابریل - ۱۹۷۱ء -
" "	حجة الله البالغة (ج - ۱)	مطبع المصرية السنية ، ۱۲۸۳ھ
" "	تفهيمات الهية (ج - ۱-۲)	مطبع نجبت روڈ حیدر آباد ۱۳۹۰ھ / ۱۹۷۰ء
" " (مترجم) علامہ اقبال فاروقی	الدرّ الثمین فی مبشرات النبی الامین	راست گفتار پریس ، ۱۳۸۶ھ
شاہ ولی اللہ	الارشاد الی مہمات الاسناد	مطبع احمدی دہلی - سن ندارد

نام مصنف	نام کتاب	پبلشرز و سن اشاعت
شاہ ولی اللہ	المسوّی من احادیث الموطا	مطبعۃ السلفیۃ مکۃ مکرمۃ ، الحجاز ، ۱۳۵۱ھ
" "	اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم	مطبع مجتبائی دہلی ، ۱۳۰۸ھ
محمد محسن ترہتی	الیانع الجنی	جید پریس دہلی ، ۱۳۴۹ھ
نواب صدیق حسن خان	ابجد العلوم	مطبعۃ الصدیقیۃ ، ۱۲۹۵ھ

فارسی کتب

نام مصنف	نام کتاب	پبلشرز و سن اشاعت
انتظام اللہ شہابی	تراجم الفضلاء	پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی ھو کراچی ، ۱۹۵۶ء -
رحمان علی	تذکرہ علمائے ہند	ایجوکیشنل پریس کراچی ، جولائی ۱۹۶۷ء -
سید محمد علی	مخزن احمدی	مفید عام آگرہ ، ۱۲۹۹ھ
شاہ اسمعیل شہید	صراط مستقیم	مطبعۃ العربیۃ - طبع اوّل - لاہور -
شاہ عبد العزیز محدث دہلوی	وسیلۃ النجات (فضائل صحابہ و اہل بیت) مرتبہ (ایوب قادری)	جاوید پریس کراچی ، ۱۹۶۵ء
" "	سرّ الجلیل فی مسئلۃ التفضیل	" "
" "	مکتوبات شاہ عبد العزیز	" "
شاہ عبد العزیز محدث دہلوی	عجالۂ نافعہ	ایجوکیشنل پریس کراچی ، طبع اوّل ، ۱۳۸۳ھ -

نام مصنف	نام کتاب	پبلشرز و سن اشاعت
شاہ عبد العزیز محدث دہلوی	فتاوی عزیزی (ج - ۱-۲)	مطبع مجتبائی دہلی ، ۱۳۱۳ھ
" "	ملفوظات	مطبع مجتبائی میرٹھ ۔ ذیقعدہ ۱۳۱۳ھ ۔
" "	تحفہ اثنا عشریہ	ایور گرین پریس لاہور ۔ طبع اول ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء ۔
" "	تفسیر عزیزی	مطبع حیدری بمبئی ، ۱۲۹۳ھ ۔
شاہ ولی اللہ	امداد فی مآثر الاجداد (انفاس العارفین)	مطبع احمدی طبع دوم ۱۸۸۴ء ۔
" "	انسان العین فی مشائخ الحرمین (انفاس العارفین)	" "
صمصام الدولہ شاہنواز خان	مآثر الامراء ۔	اردو گائیڈ کلکتہ ، ۱۸۸۸ء ۔
غلام حسین طباطبائی	سیر المتاخرین (ج - ۱ ، ۲ ، ۳)	جاوید پریس کراچی ، طبع اول ، ۱۲۹۵ھ ۔
غلام سرور لاہوری	خزینۃ الاصفیاء	مطبع ثمر ہند لکھنو ، ۱۸۷۳ء ۔
غلام علی مجتبی	مقامات مظہری	مطبع مجتبائی ۔ ۱۲۰۹ھ ۔
محمد علی الحسینی	تاریخ راحت افزاء	اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد دکن ۱۳۶۶ھ ۔
میر تقی میر	ذکر میر	اردو پریس اورنگ آباد طبع اول ، ۱۹۲۸ء ۔

نام مصنف	نام کتاب	پبلشرز و سن اشاعت
نواب درگاہ قلی خان	دہلی بارہویں صدی ہجری میں	تاج پریس حیدر آباد دکن -
نواب صدیق حسن خان	اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء والمحدثین	مطبع نظامی واقع کان پور طبع اوّل - ۱۲۸۰ھ -

اردو کتب

نام مصنف	نام کتاب	پبلشرز و سن اشاعت
ابو الحسنات ندوی	ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں	الیکٹرک پریس ہال بازار امرتسر ، ۱۳۳۱ھ -
ابو العلاء محمد اسمٰعیل گودھروی	ولی اللہ	جامع پریس دہلی ، ۱۹۳۲ء
ابو یحیٰی امام خان نوشہروی	تراجم علمائے حدیث ہند	جید برقی پریس دہلی نہمقند ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۸ء
احسان الحق اختر	حضرت شاہ ولی اللہ	پنجاب آرٹ پریس لاہور ، (س - ن)
احمد علی شوق	تذکرہ کاملان رام پور	ہمدرد پریس - طبع اوّل مارچ ۱۹۲۹ء -
اسعد گیلانی	تحریک مجاہدین کا انقلابی پہلو	احباب پرنٹرز لاہور طبع دوم ، ۱۹۷۷ء -
اشرف علی تھانوی	نور الروایات فی حبیب الحکایات	کتب خانہ امداد الغربا سہارن پور
..	الافاضات الیومیہ من الافادات القیومیہ	اشرف المطابع تھانہ بھون

نام مصنف	نام کتاب	پبلشرز و سن اشاعت
امیر شاہ خان	ارواح ثلاثہ	آزاد پرنٹنگ پریس دیوبند ، طبع سوم ، ۱۳۷۰ھ ۔
انتظام اللہ شہابی	آخری بزم	انجمن پریس لارنس روڈ لاہور ، طبع اول ۱۹۵۹ء ۔
بشیر الدین احمد	واقعات دار الحکومت دہلی (ج ۔ ۲)	شمسی مشین پریس آگرہ ۔
بیام شاہجہانپوری	شہادت گاہ بالاکوٹ	کنول آرٹ پریس لاہور ، طبع اول ۔ ۱۹۷۱ء ۔
" "	حیات شاہ اسمعیل شہید	مہان پبلشرز لاہور ، ۱۹۷۳ء ۔
ثناء الحق	میر اور سودا کا دور	جاوید پریس کراچی ، ۱۹۶۵ء
ثناء اللہ پانی پتی (مترجم) مولانا اقبال الدین احمد	تذکرۃ الموتی والقبور	جاوید پریس کراچی ، طبع اول مئی ۱۹۶۷ء ۔
جیمز فریزر (مترجم) حسن عابد جعفری	نادر شاہ	عثمانی پریس کراچی ، طبع اول اپریل ۱۹۵۱ء ۔
خلیق احمد نظامی	شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات	جمال پرنٹنگ پریس دہلی ۔
خواجہ الطاف حسین حالی	یادگار غالب	مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور نومبر ۱۹۶۳ء ۔
خورشید مصطفی رضوی	جنگ آزادی	الجمعیت پریس دہلی طبع اول ، ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۹ء
دانشگاہ پنجاب لاہور	اردو دائرہ معارف اسلامیہ (ج ۔ ۱۰)	پنجاب یونیورسٹی پریس لاہور طبع اول ۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳ء

نام مصنف	نام کتاب	پبلشرز و سن اشاعت
دانشگاہ پنجاب لاہور	تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند (اردو ادب) ج - ۷	مطبع عالیہ نیول روڈ لاہور، طبع اوّل - ۱۹۷۱ء -
" "	تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند (عربی ادب) ج - ۲	طبع اول فروری ۱۹۷۲ء
ڈاکٹر خلیق انجم	مرزا محمد رفیع سودا	کوہ نور پرنٹنگ پریس دہلی -
ڈاکٹر سید معین الحق	اخبار رنگین	پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی -
ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار	اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر -	جامعہ پنجاب لاہور -
ڈاکٹر محمد حسن	دلّی میں اردو شاعری کا تہذیبی وفکری پس منظر	شاہی پریس لکھنؤ -
ڈاکٹر مظہر بقا	اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ	شرکت پرنٹنگ پریس لاہور - طبع اوّل -
ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	دلّی کا دبستان شاعری	سرفراز پریس لکھنؤ طبع دوم ۱۹۶۵ء -
سرسید احمد خان	آثار الصنادید	سید الاخبار، ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء
سعادت خان ناصر	تذکرہ خوش معرکہ زیبا	ظفر پرنٹرز لاہور، طبع اوّل اپریل ۱۹۷۰ء -
سید احمد شہید (مترجم) سید نفیس الحسینی	رسالہ اشغال	شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

نام مصنف	نام کتاب	پبلشرز و سن اشاعت
سید احمد ولی اللہی	یادگار دہلی	مطبع و سن ندارد
سید رئیس احمد جعفری	بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد	علمی پرنٹنگ پریس لاہور - طبع اول
سید عبد الحئی لکھنوی	گل رعنا	طبع لکھنؤ ۱۶ ربیع الثانی ۱۳۲۰ھ
" "	دہلی اور اسکے اطراف	محبوب المطابع دہلی جون ۱۹۵۸ء
سید محمد عمیم الاحسان	تاریخ علم فقہ	الجمعیت پریس دہلی طبع اول ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۵ء -
سید مناظر احسن گیلانی	تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ	دوآبہ پریس ریلوے روڈ لاہور طبع دوم جنوری ۱۹۵۲ء -
" "	ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت	مطبع انتظامی حیدر آباد دکن ، ۱۳۶۱ھ -
سید ناصر نذیر فراق	لال قلعہ کی ایک جھلک	محبوب المطابع دہلی طبع دوم
سید ہاشمی فرید آبادی	تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت	انجمن پریس لارنس روڈ کراچی ، ۱۹۵۲ء -
شاہ رفیع الدین (مترجم) عبد الحمید سواتی	مجموعہ رسائل	اشرف پریس لاہور ، ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۲ء
" "	تکمیل الاذہان	اشرف پریس لاہور ، ۱۳۸۳ھ/۱۹۶۳ء
" "	اسرار المحبۃ	اشرف پریس لاہور ، ۱۳۸۳ھ/۱۹۶۳ء
شاہ گل حسن	تذکرہ غوثیہ	علمی پرنٹنگ پریس لاہور ، ۱۹۵۵ء -

نام مصنف	نام کتاب	پبلشرز و سن اشاعت
شیخ چاند	سودا	انجمن ترقی اردو ، اورنگ آباد ، ۱۳۲۵ھ/۱۹۳۶ء ـ
شیخ محمد اکرام	رود کوثر	ادارہ ثقافت اسلامیہ ـ کلب روڈ لاہور طبع ششم ـ
شیخ محمد عاشق	مجموعہ خطب خاندان عزیزیہ	فخر المطابع لکھنئو ، ۱۹۱۳ء ـ
صلاح الدین ناسک	دور مغلیہ	جاف پریس لاہور ، طبع اوّل اکتوبر ۱۹۷۳ء ـ
عبدالرحیم بخش دہلوی	حیات ولی	دین محمدی پریس مارچ ۱۹۵۵ء ـ
عبدالسّلام خورشید	سید احمد بریلوی	مصور پریس لاہور ، طبع اول ۱۹۵۲ء
عبدالشاہد خان شروانی	باغی ہندوستان	اخبار مدینہ بجنور طبع اوّل ۱۹۴۷ء ـ
عشرت رحمانی	ہماری آزادی کی کہانی (ج ـ ۱-۲)	انشا پریس لاہور ـ طبع اول ـ
علامہ شبلی نعمانی	علم الکلام	جاوید پریس کراچی ، طبع اوّل ـ
غلام حسین جلبانی	شاہ ولی اللّٰہ	سندھ یونیورسٹی پریس حیدر آباد ، مئی ۱۹۶۳ء ـ
غلام رسول مہر	غالب	عالمگیر الیکٹرک پریس ، طبع چہارم ۱۹۳۶ء ـ
" "	سیرت سید احمد شہید	کتاب منزل لاہور ، ۱۹۵۲ء ـ
" "	۱۸۵۷ء کے مجاہد	علمی پرنٹنگ پریس لاہور ـ
" "	سرگزشت مجاہدین	علمی پرنٹنگ پریس لاہور طبع اول ۱۹۵۶ء ـ
فضل الدین احمد مرزا	تذکرہ مولانا ابوالکلام آزاد	سپرا آرٹ پریس لاہور ، طبع ثانی اکتوبر ۱۹۱۹ء ـ

نام مصنف	نام کتاب	پبلشرز و سن اشاعت
فضل حسین ترہتی	الحیاۃ بعد المماۃ	مطبع اکبری آگرہ ، ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء
فقیر محمد جہلمی	حدائق الحنفیہ	مطبع منشی نول کشور لکھنؤ ، ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء -
محمد ابراہیم میرسیالکوٹی	تاریخ اہل حدیث	انشا پریس لاہور ، طبع اول -
محمد حسن نقشبندی	حالات مشائخ نقشبندیہ مجددیہ	احسن المطابع مراد آباد (س-ن)
محمد حسین آزاد	آب حیات	سرفراز پریس لکھنؤ -
" "	دیوان ذوق	مطبع اسلامیہ لاہور (س - ن)
محمد نجم الغنی رام پوری	تاریخ اودھ (ج - ۵)	منشی نول کشور ، ۱۹۱۹ء
مرزا حیرت دہلوی	حیات طیبہ	دین محمدی پریس لاہور ۱۹۷۴ء
مسعود عالم ندوی	ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک	مرتضی پریس لاہور - طبع سوم
ملیح آبادی (بروایت)	آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی	چٹان پرنٹنگ پریس ، لاہور -
مولانا سید محمد میاں	علمائے ہند کا شاندار ماضی (ج - ۱ ، ۲ ، ۳)	استقلال پریس لاہور ، ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء -
" "	تحریک شیخ الہند	استقلال پریس لاہور ، طبع دوم ، ۱۹۷۸ء -
مولانا محمد اسمٰعیل سلفی	تحریک آزادی فکر اور شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی	جیون پریس اردو بازار ، لاہور ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء -
مولانا محمد تقی امینی	فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر	زرین آرٹ پریس لاہور ، طبع اول -
مولانا محمد جعفر تھانیسری	تواریخ عجیبہ موسوم بہ سوانح احمدی	ہلالی سٹیم پریس ساڈھورہ ضلع انبالہ طبع دوم (س - ن)

نام مصنف	نام کتاب	پبلشرز و سن اشاعت
مولانا محمود احمد برکاتی	شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان	شاہین میگنا پریس لاہور ، طبع اول ۱۹۷۶ء -
مولوی ظہیرالدین سید احمد	کمالات عزیزی	ایجوکیشنل پریس کراچی ، جولائی ۱۹۶۷ء -
میر تقی میر	حیات و شاعری	مطبع و سن ندارد -
نادم سیتاپوری	غالب نام آورم	سرفراز پریس لکھنؤ ، ۱۹۶۱ء -
نواب محمد مصطفی خان شیفتہ	گلشن بیخار	ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس ، کراچی ۱۹۶۳ء -
وقائع عبدالقادر خانی (مترجم) مولوی معین الدین	علم و عمل (ج - ۱-۲)	ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس پاکستان چوک کراچی ، ۱۹۶۰ء -

رسائل و میگزین

(۱)	الرحیم	(اردو)	سعید آرٹ پریس حیدر آباد جنوری ۱۹۶۵ء -
(۲)	" "	"	سعید آرٹ پریس حیدر آباد ماہ جون تا دسمبر ۱۹۶۶ء
(۳)	" "	"	سعید آرٹ پریس حیدر آباد مارچ ۱۹۶۵ء -
(۴)	الفرقان	(اردو)	محبوب المطابع برقی پریس دہلی ۲ ربیع الاول ۱۳۶۰ھ -
(۵)	اورینٹل کالج میگزین	"	مطبع کریمی لاہور ، نومبر ۱۹۲۵ء
(۶)	دائرۃ المعارف		مطبع معارف دارالمصنفین اعظم گڑھ نمبر ۵ ، جلد ۲۲

(٧) ماہ نو اردو کراچی ، مئی ١٩٦٩ء

(٨) نقوش " نقوش پریس لاہور ، اگست ١٩٦١ء

ENGLISH BOOKS

1. Alfred Guillanme, The tradition of Islam. Nudrat Printers, Lahore: Edition I.

2. Abdullah Butt, Aspects of Shah Ismail Shaheed. Ripon Printing Press, Bull Road, Lahore: 1943.

3. Dr. K.K. Datta, Survey of the India's Social life. Date of publication is not available.

4. Dr. Tara Chand, A short history of the Indian people, printed at the Edinburgh press Calcutta: 1934.

5. H.J. Keene, Fall of the Mughal Empire, Republished at Nawai-Waqt press. Lahore:

6. Jadunath Sarkar, Nadar Shah in India, Patna Law press, Patna University, 1925.

7. Jadunath Sarkar, Fall of the Mughal Empire, Printed at Sri Gouranga 5, manidas Lan Calcutta: V.I, II, III.

8. Lothrop Stoddard, The new world of Islam. London: Chapman and hall Ltd. 1921.

9. S.V. Venkatesware, Indian Culture through the ages, printed at the bowering press, Plymouth: Britain.

10. Stanley Lane-poole, Aurangzib and the decay of the Mughal Empire, printed at Lucky press. Ballimaran Delhi, 1905.

11. William Irvine, Later Mughals, printed at Sri Gouranga press, Mirza pur street Calcutta: 1922.

12. William Muir, The life of Mohammad, printed at Great Britain Oliver and body, Edinburgh. 1923.

13. W.W. Hunter, The Indian Musalmans, printed at the unit press. Lahore: 3rd. Edition, 1964.

14. Zahiruddin Malik, A Mughal stateman of the Eighteenth century , printed at the M.H. Press, Asia publishing House, Bombay.
